هندوستانی

تاریخ و ثقافت

اور

فنونِ لطیفہ

عتیق انور صدیقی

هندوستان

تاریخ و ثقافت

اور

فنونِ لطیفہ

عتیق انور صدیقی

کی
عالم
عالیہ
جد
کر
ور
یم
کے ا
یلو
سلا
تاحا

بانو

هندوستانی

تاریخ و ثقافت

اور

فنونِ لطیفہ

مصنف و ناشر : ______ عتیق انور صدیقی
سرورق و تزئین : ______ کشل پال / انیس صدیقی
کتابت : ______ واجد علی خاں
تصاویر : ______ نعمت اللہ شاہ، شوبھن
ہدایات : ______ ڈاکٹر مہ ناز انور
زیر نگرانی : ______ ثمر افضال، پرتاب سنگھ نیگی
طباعت : ______ جمال پرنٹنگ پریس : دہلی
تعداد : ______ چار سو
سن اشاعت : ______ جنوری ۱۹۹۳ء
قیمت : ______ ۲۸۰ روپے

ملنے کا پتہ

عرشی پبلیکیشن : ۱۲۷ ج، سیکٹر ۴، پشپ وہار ساکیت، نئی دہلی ۱۷
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس : ۳۱۰۸، گلی وکیل عزیز الدین، لال کنواں، دہلی ۶
نصرت پبلشرز : حیدری مارکیٹ، امین آباد، لکھنؤ
سرِیتا بک ہاؤس : ۲۵۹۴/۱۹۴، تری نگر، دہلی ۱۱۰۰۳۵

یہ کتاب

فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی
حکومت اترپردیش لکھنؤ
کے
مالی تعاون سے شائع ہوئی

SARITA BOOK HOUSE

2594/194 , Tri Nagar
DELHI- 1993.

یہ نامکمل کتبہ بابری مسجد ایودھیا پر لکھا ہوا تھا

جس کو ۶؍ دسمبر ۱۹۹۲ء کو شہید کردیا گیا

بنامِ آنکہ دانا ہست اکبر — کہ خالق جملہ عالم لامکانی
درود مصطفیٰ بعد از ستائش — کہ سرورِ انبیائے دو جہانی
فسانہ در جہان بابر قلندر — کہ شد در دورِ گیتی کامرانی

فہرست

(شہروں کا تاریخی پس منظر) ۱۸۳ــــ ۱۳۰

(ہندوستان، غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں) ۲۲۰ــــ ۱۸۴

(نوادرات اور فنونِ لطیفہ) ۳۰۱ ــــ ۲۲۰

NATIONAL MUSEUM
Janpath, New Delhi-110 011

پیش لفظ

(انگریزی سے ترجمہ)

"ہندوستانی تاریخ و ثقافت اور فنونِ لطیفہ" کے موضوع پر جناب عتیق آر صدیقی، ڈپٹی کیپر (آرمس) نیشنل میوزیم، نئی دہلی کی اس کتاب کا پیش لفظ لکھتے وقت مجھے نہ صرف خوشی ہو رہی ہے بلکہ میں اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں کہ اس طرح کے تمام موضوعات کی اشاعت اور فروغ کو سراہا بھی جائے۔ صدیقی صاحب کی یہ تصنیف بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یہ کتاب تاریخ، آثارِ قدیمہ، میوزیم اور فنونِ لطیفہ کے مختلف گوشوں کو منوّر کرتی ہے اور ان کی تخلیق کے تاریخی رویّوں کو بھی بے نقاب کرتی ہے۔ جس میں ماقبل تاریخ کے دور سے لیکر انیس ویں صدی عیسوی کے تہذیبی، ثقافتی، اور سماجی حالات پر تحقیقی تبصرہ کیا گیا ہے۔ آثارِ قدیمہ کی اہم عمارتیں، تاریخی اہمیت کے مج[illegible]، فنِ تعمیر، فنِ مصوّری، فنِ خوش نویسی، اسلحہ اور ہتھیار، نیز ایسے تمام موضوعات کا یہاں ذکر کیا گیا ہے جو ہمارے ہندوستان کا نہ صرف قومی ورثہ ہیں بلکہ ان سے ملک کے تابناک ماضی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ یہاں ٹیپو سلطان کی تلوار جیسے مشہورِ زمانہ نوادرات کو بھی بڑے سلیقہ سے پیش کیا گیا ہے۔ قابلِ ذکر ہے کتاب کا وہ باب بھی جس میں غیر ملکی سیّاحوں اور ملک کے اہم مقامات کا تاریخ کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے۔

اندازِ تحریر رواں اور تیکھا ہونے کے باوجود حقائق کی نشاندہی کرتا ہے۔ مختلف

تاریخی حقائق کو ایک جگہ پر، ایک کتاب کی شکل میں پیش کرنے کا سہرہ یقیناً عتیق آر. صدیقی کے سر ہے۔ کیونکہ اب تک اس زاویۂ نگاہ سے کسی دوسرے نے نہیں سوچا تھا۔ یہ ایک ایسی تصنیف ہے جس کے ذریعہ سے عوام میں تاریخی ورثہ اور تاریخ کے تئیں بیداری بھی لائی جاسکتی ہے اور ملک کی تہذیبی میراث کی حفاظت اور بقا کے لیے نئے راستوں کو تلاش بھی کیا جاسکتا ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ خاص کر اردو داں طبقہ اس کے ذریعہ زیرِ بحث موضوع پر خاطر خواہ معلومات حاصل کرے گا۔ یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو اُردو میں شائع ہو رہی ہے۔ عتیق آر صدیقی حقدار ہیں کہ انھیں شاندار مبارکباد دی جائے۔ انھوں نے ذمہ داری، محنت، اور تفصیلی مطالعہ کے بعد اس کتاب کو ترتیب دیا ہے۔ اس سے پہلے بھی اُن کے کئی ریسرچ پیپرس، مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ کیلیگرافی کے موضوع پر انگریزی میں ایک تحقیقی کتاب بھی شائع ہو چکی ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ اس کتاب کو قارئین کی طرف سے سراہا بھی جائے گا اور دادِ تہنیت بھی ملے گی۔

R. C. Sharma

(ڈاکٹر) رمیش چندر شرما

ڈائرکٹر جنرل

نیشنل میوزیم، جن پتھ، نئی دہلی

تاریخ ۳۰ راکتوبر ۱۹۹۲ء

نئی دہلی

لفظِ تشکّر

میں نہ صرف شکر گزار ہوں بلکہ احسان مند ہوں، نیشنل میوزیم کے ڈائرکٹر جنرل اور وائس چانسلر ڈاکٹر رمیش چندر شرما کا، جنھوں نے اس کتاب کے مسوّدہ کو پڑھا اور "پیش لفظ" سے نوازہ۔ قابلِ احترام ہیں لالہ ادتیہ نرائن، اسسٹنٹ ڈائرکٹر، نیشنل میوزیم، نئی دہلی، جنکی رہنمائی میرے لئے مشعلِ راہ بنی۔ آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل جناب ایم۔ سی۔ جوشی، کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے اس کتاب کو لکھنے میں ہر ممکن مواقع فراہم کئے۔

جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے پروفیسر عبدالودود اظہر، ڈاکٹر اسلم پرویز، اور ڈاکٹر نصیر احمد خاں، دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر سیّد امیر حسن عابدی اور پروفیسر قمر رئیس، جیسے دانشوروں نے بھی اہم معلومات فراہم کیں۔

دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کے جناب مظہر امام، سُکھ دیو سنگھ شرما، ڈاکٹر سجاد رضوی اور نجمہ رضوی جیسی اہم ہستیوں نے بھی مجھے موقع دیا جسکی بنا پر ریڈیو اور ٹی وی سے نشر ہونے والے بعض مضامین بھی اس کتاب میں شامل کئے گئے۔

اس کتاب کے لے آؤٹ آرٹسٹ اور سرورق کے ڈیزائنر جناب کشل پال، عزیز دوست محترم عمر افضال اور نامور افسانہ نگار شری رام لعل کی توجہّ اور اعانت کی بدولت ہی اس کتاب کو یہ شکل میسّر ہوئی۔

میری غمگسار اور دلنواز بیگم ڈاکٹر مہ ناز انور، دو بیٹیاں اروما خانم اور عرشی مریم کے لئے تمام تر محبتیں حاضر ہیں جنکے خلوص اور اعانت سے یہ کتاب شائع ہو سکی۔

مصنف

اس کتاب کے بارے میں

ہندوستانی تاریخ و ثقافت اور فنونِ لطیفہ جیسے موضوعات پر ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ خاص کر انگریزی زبان میں تو نہ صرف ہم وطنوں نے بلکہ دوسرے ملک کے تاریخ دانوں، آرٹ اور کلچر کے مفکرین، نیز آثار قدیمہ کے محققین نے تفصیلی طور پر بحث کی ہے۔ لیکن اردو زبان کے ذریعہ اس موضوع پر خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ اردو میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ یا تو انگریزی کتابوں کے ترجمہ ہیں اور یا صرف ہندوستانی تاریخ کے موضوع کو ہی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کچھ فارسی اور عربی زبانوں کے عالموں نے بھی تاریخ کو اردو میں پیش کیا ہے لیکن انھوں نے بھی ایسے ہی قلمی نسخوں کو چنا ہے جنکا تعلق اسلامی تاریخ اور قرونِ وسطیٰ سے ہے۔

میں گزشتہ سولہ سال سے میوزیم اور آثارِ قدیمہ کے محکموں سے منسلک ہوں میں نے تاریخ کو صرف کتابوں ہی میں نہیں پڑھا ہے بلکہ اس بات کی بھی پوری کوشش کی ہے کہ ہماری تہذیب کے جو آثار آج ہمارے سامنے موجود ہیں وہ کہاں سے اور کس طرح لائے گئے ہیں، انکا انکشاف کیسے ہوا ہے؟ اِن تمام جگھوں پر جاکر

میں نے بذاتِ خود انکا معائنہ کیا اور گزشتہ دو دہائیوں میں جو بھی مواد اکٹھا کر سکتا تھا ان کو اب اس کتاب کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کے مختلف مضامین کو الگ الگ وقتوں میں الگ الگ ضروریات کے پیشِ نظر لکھا گیا ہے۔ بعض مضامین تو ایسے ہیں جنکو کسی رسالہ میں شائع کرنے کی غرض سے لکھا گیا اس لئے انکا اندازِ تحریر مختلف ہے۔ کچھ ایسے ہیں جنکو ریڈیو ٹاک کی غرض سے پیش کیا گیا ہے اس لئے ان میں ریڈیو کے آداب اور ضابطوں کا خیال رکھا گیا۔ بعض مضامین صرف بچّوں کے لئے ہیں اس لئے انکا اندازِ تحریر بھی جدا ہے۔ اِن کے علاوہ چند ایسے مضامین بھی اِس کتاب میں شامل ہیں جن کو ریڈیو فیچر کی غرض سے لکھا گیا یہی وجہ ہے کہ اُن میں صوتی آہنگ پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ لیکن اِن تمام باتوں کے باوجود کتاب کو ترتیب دیتے وقت اس بات کا پوری طرح خیال رکھا گیا ہے کہ مختلف مضامین کے ذریعہ قاری کو ہندوستانی تاریخ و ثقافت اور فنونِ لطیفہ کا پوری طرح علم ہو جائے۔ ہمارے ملک کا وہ قومی ورثہ جسکا سلسلہ ہزاروں سال پرانہ ہے اور جس کے تہذیبی نقوش آج بھی عمارتوں، میوزیم، مندروں اور مسجدوں میں دیکھے جاسکتے ہیں انکا انکشاف کیا جائے۔ کچھ ایسی عمارتوں کا ذکر بھی اِس کتاب میں کیا گیا ہے جو آرٹ اور فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے تو اہم ہیں ہی، لیکن ساتھ ہی وہ ہماری مشترکہ تہذیب کی علامت کے طور پر بھی جانی جاتی ہیں۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے بارے میں بھلے ہی کچھ اردو دانوں کو علم ہو مگر اس زمانے کی تہذیب کیا تھی اور آج ہمارے پاس اُس عہد کے کون سے نوادرات محفوظ ہیں اِنکا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کے نام سب نے سُنے ہوں گے مگر ان کا تاریخی پس منظر بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ ہمارے ملک ہندوستان کے بارے میں ہزاروں سال پُرانے سیّاحوں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے انکا بیان بھی یہاں پیش کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں نہ صرف چند اہم قلمی نسخوں کے بارے میں معلومات پیش کی گئی ہیں بلکہ بعض ایسے نوادرات جن کے نام تو لوگوں نے سُنے ہوں گے مگر ان کی تفصیلات سے بے خبر ہوں گے ایسے آرٹ کے نمونوں کا بھی ذکر ہے۔

ہمارے ملک میں میوزیم یا عجائب گھر کی کیا تاریخ ہے، ان میں کس طرح کے تاریخی نمونے پائے جاتے ہیں۔ اسلحہ اور ہتھیار، سکّے، فنِ مصوری، فنِ خوش نویسی جیسے موضوعات کو بھی یہاں شامل کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے ذریعہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ اردو داں طبقہ کے لئے ایک ایسا مواد فراہم کیا جائے جس کے ذریعہ سے وہ تاریخ کے قدیم دَور سے لیکر آزاد ہندوستان تک کے حالات کو جان سکیں۔ اور وہ تاریخی اور تہذیبی سرمایہ جن کو آج صرف نوادرات کا درجہ دیا جاتا ہے انکی تعمیر اور تشکیل میں کن کاریگروں، فنکاروں اور بادشاہوں کی کوششیں شامل تھیں۔ یہاں صرف ایک مضمون "دیوارِ چین" ایسا ہے جس کا تعلق براہِ راست ہندوستان سے نہیں ہے اس کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ دراصل دیوارِ چین کی ایک تو بین الاقوامی اہمیت ہے اور کسی بھی ادب یا فنِ تعمیر کے نمونے کو صرف کسی ایک ملک کی جاگیر نہ سمجھنا چاہئے یہ تو ایسا سرمایہ ہے جسکا تعلق ہر آرٹ اور کلچر سے دلچسپی رکھنے والے سے ہے اور یوں بھی چین کی سرحدیں ہمارے ملک سے جڑی ہوئی ہیں اس لئے اسے بھی ہندوستانی تاریخ کے حوالہ سے دیکھا اور پڑھا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کو پانچ چھوٹے چھوٹے ابواب میں مصلحتاً تقسیم کیا گیا ہے تاکہ قاری کو بالترتیب پڑھنے اور سمجھنے میں آسانی ہو۔

پہلا باب، "ہندوستان کا تاریخی پس منظر"، ہے جس میں قدیم ہندوستان سے دورِ جدید تک کا تاریخی پسِ منظر پیش کیا گیا ہے۔ تاریخ کے اس طویل سفر میں کن اہم راجاؤں اور بادشاہوں نے کس طرح حکومت کی، اُن کے عہد میں آرٹ، آرکیٹکچر

اور فنون لطیفہ کا کس انداز میں فروغ ہوا۔ ان کے عروج و زوال کی داستان بیان کی گئی ہے۔

دوسرا باب، "آثار قدیمہ کی اہم عمارتیں" ہے۔ جن میں صرف انھیں اہم عمارتوں سے بحث کی گئی ہے جو قومی اور بین الاقوامی سطح پر فنِ تعمیر اور ثقافت کے نقطۂ نظر سے اہم ہیں۔ ان عمارتوں کے تاریخی حوالے کی روشنی میں ان کے فنِ تعمیر سے بحث کی گئی ہے۔

تیسرا باب "شہروں کا تاریخی پس منظر" اس لحاظ سے اہم اور قابلِ توجہ ہے کہ ہندوستان کے کچھ ایسے علاقہ جن کو دورِ حاضر میں زیادہ شہرت نہ مل سکی کیوں کہ اب نہ تو وہ بڑے شہر کہلاتے ہیں اور نہ ہی اب ان کی کوئی نمایاں پہچان ہے لیکن ماضی بعید میں ان کو سیاسی، سماجی، اور تاریخی لحاظ سے کافی شہرت حاصل تھی ایسے علاقوں کا تاریخ کی روشنی میں مطالعہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی بعض وہ جگہیں جو ایک چھوٹی سی بستی کی شکل میں آباد ہوئی تھیں اور اب ان کو ہندوستان کے بہت بڑے صنعتی اور تجارتی شہروں کا درجہ دیا جاچکا ہے۔ ایسی تمام جگہوں کا ذکر اس باب میں کیا گیا ہے۔

چوتھا باب، "ہندوستان، غیر ملکی سیّاحوں کی نظر میں"، ہے۔ جس میں عہدِ موریہ سے لیکر مغل دَور تک جن غیر ملکی اہم سیّاحوں نے اس ملک کا دورہ کیا اور اپنے تاثرات لکھے ان کا ذکر اور ان کے بیانات کو اس باب میں پیش کیا گیا ہے۔

دراصل قدیم ہندوستان کا ایک تہذیبی وقار ہمیشہ سے رہا ہے۔ اس ملک کی ثقافت اور ادب نوازی نیز مذہبی رسم و رواج کے بارے میں جاننے اور دیکھنے کی خواہش ہمیشہ سے غیر ملکی لوگوں میں رہی ہے۔ چاہے وہ یونان ہو، روس ہو، یا وسط ایشیا کے دوسرے ممالک، ہر جگہ سے وہاں کے سیّاح آئے اور اپنے سفرنامے کے ذریعہ انھوں نے ہندوستان کے حالات بیان کئے ہیں۔

پانچواں اور آخری باب، "نوادرات اور فنونِ لطیفہ" ہے۔ یہ اِس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ ہمارے ملک کے شاہکار نمونے جواب نوادرات کا درجہ رکھتے ہیں انکی تفصیل اس باب میں انفرادی طور پر بیان کی گئی ہے۔ ساتھ ہی فائن آرٹ یا فنونِ لطیفہ کے مآخذ سے بھی بحث کی گئی ہے۔

میں چونکہ خود اُردو زبان و ادب کا طالب علم ہوں۔ ساتھ ہی عربی، فارسی، ترکی، اور انگریزی زبان میں لکھی ہوئی تاریخ اور ثقافت کو پڑھتا رہا ہوں اس لئے یہ خیال آیا کہ ہندوستان کی تہذیبی اور ثقافتی وراثت کو اردو زبان میں بھی پیش کیا جائے۔ میری یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی ہے اسکا فیصلہ کتاب کے قارئین پر ہے۔

عتیق انور صدیقی

نیشنل میوزیم، جن پتھ، نئی دہلی ۱۱

۱۵ جنوری سنہ ۱۹۹۳ء

گھر کا پتہ: G-127 سیکٹر IV پشپ وہار (ساکیت)

نئی دہلی ۱۱۰۰۱۷

ہندوستان
کا
تاریخی پس منظر

قدیم ہندوستان کی کہانی

تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ اس میں ماضی بعید سے لے کر حال تک کے تمام واقعاتِ انسانی کا بیان ہوتا ہے۔ اس میں اس بات کا بھی ذکر ہوتا ہے کہ گزشتہ زمانے میں لوگ کس طرح زندگی بسر کرتے تھے اور کس طرح وہ سوچتے اور سمجھتے تھے۔ سماج میں مختلف طرح کے مدد جزر کی بھی داستان تاریخ کے حوالے سے جانی اور سمجھی جا سکتی ہے۔ ماضی میں لوگوں کے کیا رسم و رواج تھے؟ اور یہ تمام حالات کروڑوں سال سے مختلف مدارج سے گزرتے ہوئے آج ہمارے سامنے ہیں۔ یہ تمام باتیں محض ایک کہانی نہیں بلکہ اُن سے ہمیں مفید معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔ تاریخ ایک ایسی کڑی ہے جو ماضی اور حال کو سلسلہ وار جوڑتی ہے۔ اس طرح کے تمام ذرائع معلومات مختلف طریقوں سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ جن کو تاریخ کے ماخذ سے سمجھا جا سکتا ہے۔

تاریخ اور ما قبل تاریخ کا دور:۔

کروڑوں سال پہلے انسان دنیا میں آیا تھا۔ شروع میں یہ انسان نہ تو پڑھنا لکھنا جانتا تھا، اور نہ ہی اس کے پاس کسی تہذیبی زندگی کا شعور تھا۔ صرف پتھر اور جنگل کے پیڑ پودوں، جانوروں اور پہاڑوں کی گپھاؤں میں زندگی گزارتا تھا۔ ایسے دور کو تاریخ کی اصطلاح میں ما قبلِ تاریخ یا (Pre-History) کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ لیکن جب سے

انسانی زندگی کے حالات بھی تحریروں کے ذریعہ ملنے لگے اور انسانی ترقی اور تہذیب کا پتہ لگنے لگا تو اسے تاریخی دور یا (History) کہا جانے لگا۔ یہ حالات ہمیں پتھروں پر کندہ تحریروں اسلحہ اور ہتھیار، زیورات، مورتیوں یا سکوں کے ذریعہ معلوم ہوتے ہیں۔ ان تمام آثار قدیمہ کے ذریعہ تاریخ کے قدیم دور کا پتہ چلتا ہے۔

آرکیولوجی یا آثار قدیمہ ہمیں قدیم تاریخ کا ایک ایسا مواد فراہم کرتی ہے، جن کے ذریعہ سے گذشتہ دور کی حقیقت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ تمام پرانی اشیاء بسا اوقات زمین کے نیچے کھدائی کے ذریعہ بے نقاب ہوتی ہیں، جو پرانے مٹی کے برتن، اسلحہ، تحریر یا پرانی عمارتوں کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ اسی وجہ سے آج تک ہندوستان میں جس سب سے پرانی تہذیب کا سراغ ملتا ہے وہ "وادیٔ سندھ" کی تہذیب ہے جو آج سے تقریباً ۵ ہزار سال پرانی ہے۔ پھر کچھ ایسی تحریریں سامنے آئیں، جو چمڑے، تانبے، درختوں کے پتوں اور چٹانوں پر ملی ہیں۔ جن کی ابتدائی شکل "برہمی" یا "خروشتی" رسم الخط میں ملتی ہیں۔ کیونکہ پہلی صدی عیسویں سے قبل کاغذ کی ایجاد نہ ہوئی تھی۔ یہ تحریریں قدیم دنیا کی تہذیب اور ان کی روزمرہ کی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ اس کے علاوہ اپنشد، اور دیومالائی کہانیاں جن میں رامائن، مہابھارت، پران اور بدھ مذہب کی جاتک کہانیاں ہیں جو اپنے اپنے عہد کی عکاس ہیں۔

ہندوستان میں انسانی زندگی کی کہانی لگ بھگ پانچ لاکھ سال پرانی ہے جس کو عام طور پر "اسٹون ایج" (Stone Age) کہا جاتا ہے۔ پھر دھاتوں کی دریافت کے ساتھ انسان تہذیبی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ اس کو کھیتی باڑی کا کام بھی آگیا تھا۔ اس نے پتھر اور دھاتوں کے ہتھیار بنائے اور زندگی گزارنے کا سلیقہ سیکھا۔ اسطرح کے پتھر کے زمانے کے کچھ آثار آج بھی آندھرا پردیش، کرناٹک، مہاراشٹر اور مدھیہ پردیش وغیرہ میں ملتے ہیں۔ پتھر اور مٹی کے دور سے نکل کر انسان نے جب دھات کی ایجاد کرلی تو اُسے انگریزی میں (Chalcolithic Age) کہا جانے لگا۔ دھاتوں کے اسلحہ اور سکے بنائے جانے لگے۔ مورتیاں اور برتن تیار ہونے لگے اور

ان تمام چیزوں کو انسان اپنے روزمرّہ کے استعمال میں لانے لگا۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب:۔

اس تہذیب کا ذکر کرتے ہوئے ہندوستان کے ہڑپا اور موہنجوداڑو جیسے شہر بھی کھدائی کے بعد سامنے آئے جو پانچ ہزار سال پرانے ہونے کے باوجود اس زمانے کے تہذیبی شہر کہلاتے ہیں۔ کالی بنگا، لوتھل، روپڑ اور بعض دوسری جگہوں پر مکانات، زیورات، پرانے انسانی ڈھانچے اور مٹی کے برتنوں سے وادیٔ سندھ کی تہذیب پر روشنی پڑتی ہے۔ ان سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ پرانی دنیا کے باشندے کسی نہ کسی دریا کے کنارے آباد ہوتے تھے۔ جس طرح ہندوستان پاکستان میں "سندھ ندی" کا مصر میں دریائے نیل اور ٹیگرس ندی کے کنارے "میسوپوٹامیہ" کی قومیں لگ بھگ ایک ہی زمانے میں آباد تھیں۔

حضرت عیسیٰ مسیح کی پیدائش سے تقریباً دو ہزار سال پہلے کا زمانہ ہندوستان کی قدیم تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں ہندوستان کے اندر "آریہ" قوم نمودار ہوتی ہے۔ محققین کی عام رائے یہ ہے کہ آریہ قوم یقیناً کہیں اور سے آئی تھی اور وسط ایشیا سے ہوتے ہوئے یہ ملک بھارت میں داخل ہوئے اور پنجاب کے علاقہ میں دریائے سرسوتی کے کنارے آباد ہوگئے اور دھیرے دھیرے یہاں کے علاقوں پر قابض ہوگئے۔ آریہ قوم نسبتاً زیادہ تہذیب یافتہ اور مسلح تھی۔ اُن کے پاس لڑائی کے بہتر ذرائع تھے اور دھیرے دھیرے یہ آریہ قوم دریائے گنگا کے قرب و جوار میں شمالی ہند میں اور دکن میں وندھیاچل پہاڑ تک پھیل گئی۔ اسی زمانے میں ان لوگوں کا تعارف ہندوستان کی اہم، مقدس اور قدیم ترین مذہبی کتاب "وید" سے ہوا۔ وید صرف ہندوستان کی ہی نہیں بلکہ دنیا کی سب سے قدیم کتاب مانی جاتی ہے اس میں آریہ قوم کے بارے میں وید کا مطالعہ کرنے سے بھی پتہ چلتا ہے۔ وید کا مذہب سادگی سے بھرپور ہے جس میں قدرت (Nature) کی طاقتوں کی

عبادت کا ذکر ہے۔ لوگوں نے قدرتی طاقتوں کو دیکھا۔ نکلتے اور ڈوبتے سورج کا اندازہ کیا، بارش، جاڑہ، گرمی اور آندھی و طوفان کا جائزہ لیا۔ مگر انسانی ذہن یہ نہ سمجھ پایا کہ یہ سب کیسے ہوتا ہے اور کون کرتا ہے؟ نتیجہ کے طور پر لوگوں نے قدرت کی ایسی ہی چیزوں کی پوجا شروع کردی اور یہ مان لیا کہ دنیا میں یہی سب سے بڑی طاقتیں ہیں۔ "رِگ وید" میں بھی ایسی طاقتوں کے بارے میں واقعات درج ہیں۔ آریہ قوم بھی اسی کتاب پر عمل پیرا رہی، وہ ان غیبی طاقتوں کو خدائی طاقت مان کر ضرورت کے مطابق پوجا کرتے اور دعائیں مانگتے تھے اور پریشانی کے وقت قربانی اور چڑھاوا دیتے۔

ایرین قوم نے حسبِ ضرورت ایک سماجی معاشرہ کی بھی بنیاد ڈالی جن کو موٹے طور پر چار طبقوں میں بانٹ دیا۔ جو لوگ مذہبی کاموں سے وابستہ تھے۔ انھیں "برہمن" کا درجہ دیا گیا۔ جو لوگ جنگ اور لڑائی کے کام میں ماہر تھے۔ وہ "شتری" کہلاتے۔ تجارت پیشہ اور کاشت کار لوگوں کو "ویش" کا مرتبہ دیا گیا اور نچلے طبقہ کے لوگوں کو "شودر" کہا گیا ___ اس طرح وید کی رو سے ہندوستان میں سماج کے اس طبقاتی فرق کو ایک منظم طریقہ سے چلایا جانے لگا۔ اور آریہ قوم تہذیبی زندگی کی نمائندگی کے ساتھ ہندوستان بھر میں پھیلتی اور پھولتی رہی۔ وہ زمانہ ویدک دور کا آخری دور کہلاتا ہے۔ اس میں پہلے تو وید کو چار مزید حصوں میں تقسیم کیا گیا اور پھر بعد میں 'رامائن' اور "مہابھارت" جیسی نصیحت آمیز کتابوں کا وجود ہوا۔ رامائن میں اجودھیا کے کوشل شہزادے رام کی کہانی ہے۔ ان کی بیوی سیتا کے واقعات اور راون کی داستان ہے۔ اور "مہابھارت" میں ہستنا پور کے راجہ اور اُن کی اولادوں "پانڈو" اور "کوروں" کے درمیان جنگ کی تفصیلی داستان ہے جو تقریباً حضرت عیسٰی مسیح کی پیدائش سے لگ بھگ ۱۱ سو سال پہلے لڑی گئی تھی ___ اس کا ایک خصوصی حصہ "بھگودگیتا" کہلاتا ہے جو کرشن جی کے واقعات کا تفصیلی جائزہ ہے ___ یہیں سے ہندوستان میں "ہندو" مذہب کی بنیاد سمجھی جاتی ہے۔

جین اور بدھ مذاہب :-

ہندوستان کی قدیم تاریخ میں چھٹی صدی قبل مسیح کا زمانہ پوری دنیا میں قابل ذکر ہے۔ اسی زمانے میں بعض عالم فلسفی، اصلاح کار، اور اچھی باتوں کا پیغام لیکر کچھ لوگ اس سرزمین پر پیدا ہوئے۔ جن میں "وردھمان مہاویر" اور "گوتم بدھ" دو مختلف مذاہب کے بانی کی حیثیت سے جانے گئے۔ مہاویر نے جین مذہب، اور گوتم بدھ نے بدھ ازم کی بنیاد ڈالی۔ ان دونوں ہی عظیم شخصیتوں میں ایک بات یہ مشترک تھی کہ انھوں نے فرسودہ عقیدوں اور سماج میں پیدا ہونے والی برائیوں کے خلاف آواز اُٹھائی۔ جانوروں کی قربانی، تشدد، اور عیش وعشرت کی زندگی گزارنے والوں کے خلاف اپنے مذہب کی تلقین کی۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ لگ بھگ ایک ہی زمانے میں دونوں مذاہب کی ایک جیسی باتیں مشرقی ہندوستان کے شہروں ویشالی، کاشی اور راجگیر سے عوام کے لئے بلند ہوئیں۔

وردھمان مہاویر بہار میں ویشالی کے قریب ۵۴۰ھ قبل مسیح میں پیدا ہوئے اور جین مذہب کی بنیاد ڈالی۔ یہ بھی شہزادے تھے اور اپنے باپ کی زندگی سے الگ آرام وآسائش کو تیاگ کر کے سادہ اور فقیرانہ زندگی گزارنے لگے اور بارہ سال متواتر مراقبہ کے بعد ۴۲ سال کی عمر میں جین مذہب کی فلسفیانہ باتوں کو عوام کے سامنے پیش کیا اور ۷۲ سال کی عمر میں ۴۶۸ھ قبل مسیح کو مگدھ میں راجگیر کے پاس مہاویر کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے "کرم" "موکش" اور اہنسا کے فلسفہ کو پیش کیا اور انھیں باتوں میں انسان کی نجات کا حل تلاش کیا۔

گوتم بدھ کا اصلی نام "سدھارتھ" تھا۔ یہ بھی ایک راجہ کے بیٹے تھے۔ ۵۶۳ھ ق م میں کپل وستو کے پاس بہار میں پیدا ہوئے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں سدھارتھ کی شادی یشودھرا نامی ایک حسین شہزادی سے کردی گئی اور جلد ہی ایک لڑکا بھی پیدا ہو گیا جس کا نام "راہول" رکھا گیا لیکن کچھ ہی عرصہ میں سدھارتھ کی طبیعت

عیش و آرام سے منحرف ہو گئے اور موت، پریشانی، غربت اور بیماری کو دیکھ کر زندگی سے یہ اکتانے لگے۔ ان کو یقین ہو گیا کہ دنیاوی زندگی بہرحال عارضی ہے، اور جوانی کے بعد تکلیف دہ بڑھاپا ضرور آتا ہے اور آخرکار ایک رات اچانک ۲۹ سال کی عمر میں سدھارتھ بھی محل کے آرام کو تیاگ کر دور جنگل میں جا چھپے۔ اور تمام دنیاوی آرام کو خیرباد کہدیا۔ چھ سال تک مسلسل یہ بھی مراقبہ اور دھیان کی کیفیت میں رہے اور آخرکار ایک دن جب یہ بدھ گیا میں ایک پیپل کے پیڑ کے نیچے محوِ عبادت تھے کہ انھیں نور کی ایک کرن دکھائی دی اور نجات کا حل تلاش کر لیا اور تبھی سے یہ "گوتم بدھ" کے نام سے جانے گئے اور بدھ دھرم کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے اپنا پہلا خطبہ وارانسی کے قریب "سارناتھ" میں دیا — گوتم بدھ نے دنیا کے سامنے یہ فلسفہ پیش کیا کہ دنیا غم و اندوہ سے بھری ہوئی ہے، اور اس غم کا سبب محض دنیا سے لو لگانا ہے اور اس غم سے نجات اس وقت مل سکتی ہے جب انسان دنیاوی لذتوں اور آرام سے خود کو کنارہ کش کر لے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان آٹھ باتوں پر عمل کرے۔ وہ آٹھ باتیں یہ ہیں:۔ صحیح سمت سوچنا۔ زندگی میں سچا مقصد رکھنا۔ سچ کہنا، سچی زندگی گزارنا، سچی کوشش کرنا اور صحیح طریقہ سے محوِ عبادت رہنا۔ گوتم بدھ نے لفظ سچ کو بہت اہمیت دی اور ہر کام میں سچائی اور ایمانداری پر زور دیا۔ انھوں نے بھی تشدد اور اہنسا کو دنیا کی بدترین برائی کہا ہے۔

جین اور بدھ مذاہب کی تعلیمات کم و بیش ایک جیسی ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ جین مذہب میں ہر کام میں انتہا پسندی کی طرف زور دیا گیا ہے جبکہ بدھ مذہب میں اعتدال پسندی کو بہتر طریقہ بتلایا گیا ہے — ہندو مذہب کے اندر ذات پات اور طبقاتی فرق کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ اس کے برعکس جین اور بدھ مذاہب میں انسان کی پہچان صرف اس کے کردار اور اخلاق سے کی جاتی ہے۔ گوتم بدھ کا انتقال ۴۸۳ ق م میں کوشی نگر (بہار) میں ہوا۔

موریہ حکومت کا قیام :-

چھٹی صدی قبل مسیح میں ہندوستان کے اندر کئی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم تھیں۔ جن میں سے کچھ صرف راجہ کے حکم سے چلتی تھیں اور کچھ حکومتوں میں عوام کا کافی دخل تھا۔ اُن میں بہار اور اُجین کے علاقہ کو کافی اہمیت حاصل تھی۔ راجہ 'نندا' اس وقت مگدھ کا مشہور اور طاقتور بادشاہ تھا۔ اس کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ ۳۲۶ھ (ق۔م) میں یونان کا بادشاہ سکندر بھی مگدھ کے اندر داخل ہونے کی جسارت نہ کر سکا۔ مگدھ کے راجہ کو خدا کی طرح پوجا جاتا تھا۔ اور اس کے احکامات کی خلاف ورزی کرنے کی کسی میں بھی جسارت نہ تھی ادھر ہندوستان کے شمال مغرب میں یونانی اور ایرانی حملے متواتر ہو رہے تھے ۳۲۶ھ قبل مسیح میں سکندر نے راجہ پورس پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ ۳۳۰ھ ق م میں ایرانی بادشاہ دارلیس (Darvis) نے وادیٔ سندھ کو فتح کر لیا، مگر جب یہ دونوں غیر ملکی طاقتیں مشرق میں مگدھ (موجودہ بہار) کی طرف بڑھیں تو ناکام رہ گئیں۔ دونوں بادشاہ ایران اور یونان واپس چلے گئے اور سکندر اپنے شہر بلونیہ میں ۳۲۳ھ (ق م) میں انتقال کر گیا۔ سکندر بادشاہ کا ہندوستان میں بہت تھوڑے عرصہ کے لئے قیام رہا۔ لیکن اس کے تہذیبی اور سیاسی اثرات ہندوستان پر کافی پڑے۔ بہت سے یونانی پنجاب کے علاقہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ بہت نے مکانات بھی بنائے۔ اس طرح ہند اور یونان کے درمیان آپسی بھائی چارہ اور تجارت کے راستے ہموار ہو گئے۔ اس کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان میں موریہ حکومت کی بنیاد پڑنے لگی اور ۳۲۱ھ ق م (321 B. C.) میں چندر گپت موریہ نے مگدھ کے راجہ نندا کو شکست دیکر موریہ حکومت کی ابتدا کی۔ چندر گپت اس وقت صرف ۲۵ سال کا ایک نوجوان تھا اور چونکہ موریہ قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے اس کی مناسبت سے حکومت کا نام بھی موریہ پڑ گیا۔ حسنِ اتفاق سے موریہ حکومت کو ایک ذہین، دانشور اور تجربہ کار آدمی

"چانکیہ" رل گیا۔ جس کی مدد سے نندا حکومت کو ختم کر کے چندر گپت نے اپنی بادشاہت کا اعلان پورے مگدھ کے علاقہ میں کر دیا۔

چانکیہ کی ذہین تدبیروں سے موریہ راجہ کو اپنی حکومت کو وسیع کرنے میں کامیابی ملی۔ راجہ چندر گپت نے اب مشرقی ہندوستان کے ساتھ ساتھ مغربی اور شمالی ہند کے علاوہ دکن میں بھی اپنی بادشاہت کا جھنڈا گاڑ دیا اور کامیاب راجہ کی طرح ۲۴ سال حکومت کرنے کے بعد ۲۹۷ھ (ق م) میں چندر گپت موریہ کا انتقال ہو گیا۔ اسی کے زمانے میں، یونانی سفیر اور سیلوکس کا وزیر "میگیتھینیز" (Magasthnes) بھی اس کے دور میں آیا تھا۔ اس سفیر نے پانچ سال کے عرصہ میں جو کچھ اس کی راجدھانی پاٹلی پتر میں دیکھا، ان کا تفصیلی حال اپنی کتاب انڈیکا (Indika) میں درج کیا ہے۔

سمراٹ اشوک اور اُس کا عہد :۔

چندر گپت موریہ کے بعد اس کا بیٹا "بندو سار" تخت نشین ہوا جس نے ۲۹۷ھ ق م سے ۲۷۳ھ (ق م) تک ہندوستان پر حکومت کی اور بادشاہت کو مزید وسیع کیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اشوک ۲۷۳ھ (ق م) میں پاٹلی پتر کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اور کئی سال تک اپنے بھائی سے تخت حاصل کرنے کی جدو جہد کرتا رہا اور آخر کار ۲۶۹ھ (ق م) میں پورے آب و تاب کے ساتھ سمراٹ اشوک کے نام سے پورے ہندوستان کا راجہ کہلایا۔ اس دوران اس نے "کلنگا" کی زبردست جنگ لڑی اور موجودہ اڑیسہ کو فتح کر لیا۔ اس کی حکومت اس قدر وسیع ہو گئی تھی کہ ہندوکش اور ہمالیہ پہاڑ سے لے کر دکن میں مدراس تک اس کی نصرت کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ ابتدا میں سمراٹ اشوک ایک سنگدل، ظالم اور تشدد پسند انسان تھا۔ مگر کلنگا کی خونریز جنگ کے بعد اس کا دل بدل گیا اور اس نے ہر طرح کے تشدد اور خون ریزی سے توبہ کر لی اور گوتم بدھ کا سچا پیروکار بن گیا۔ اشوک نے بدھ مذہب کی خانقاہیں، اس کے

احکامات، اور استوپ بنوائے۔ اشوک نے بدھ مذہب اور کنویں کھدوائے، تاکہ اس کی رعایا کو آرام حاصل ہو۔ اور اپنی حکومت میں مکمل امن کا اعلان کر دیا۔ اشوک کی عہد کی تحریریں اس کے دور کی بہترین مظہر ہیں۔ آج سے تقریباً سو سال پہلے اشوک کے بارے میں دنیا کو کچھ بھی نہیں معلوم تھا مگر سنہ ۱۹۱۵ء میں سانچی، سارناتھ، کپل وستو، دہلی اور بعض دوسری جگہوں سے دستیاب آثار قدیمہ سے اس کے دور کی تفصیل معلوم ہو گئی ہے۔ اس کے دور کے ایک کھمبے (Pillar) پر لکھی ہوئی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ سمراٹ اشوک کا دوسرا نام پیادسی (Piyadassi ،) بھی تھا۔ سارناتھ میں رکھا ہوا ہے۔ لوائن کیپٹل (Lion Capital ،) جو اب ہمارے ملک کا قومی نشان بھی ہے۔ اسی راجہ اشوک کی یادگار ہے۔

شنگا اور کشان کا عہد:-

سنہ ۲۳۲ (ق م) میں سمراٹ اشوک کا انتقال ہو گیا۔ مگر اس کے بعد کوئی بھی راجہ ایسا نہ آسکا جو اپنے باپ دادا کی بنائی ہوئی شاندار موریہ حکومت کو سنبھال سکتا۔ اشوک کے عہد میں بدھ مذہب کی زبردست ترقی ہوئی مگر ابھی پچاس سال کا عرصہ بھی نہیں گزرا تھا کہ موریہ راجہ کمزور پڑ گئے اور سنہ ۱۸۵ (ق م) میں پشیومتر نامی ایک بہادر نے آخری موریہ راجہ کو شکست دیکر شنگا (Shunga) حکومت کی بنیاد ڈال دی۔ شنگا حکومت تقریباً ۱۱۲ سال تک قائم رہی۔ اس زمانے میں بدھ مذہب سے انحراف اور ہندو دھرم کی طرف کافی رغبت ہوئی۔ نتیجے کے طور پر بدھ خانقاہوں استوپ، اور دھرم شالاؤں کو کافی مسمار کیا گیا اور وید مذہب کو پھر سے جاری کیا گیا۔ مندروں کی تعمیر ہونے لگی اور پھر سے ملک میں طبقہ اور ذات کے لحاظ سے انسان کا درجہ اور مرتبہ متعین کیا جانے لگا۔ حالانکہ اس عہد میں بھی کچھ بدھ عمارتوں کو وسعت دی گئی۔ شنگا حکمرانوں کے ساتھ یہ پریشانی رہی کہ متواتر ایک سال تک ان کو دکن کے راجاؤں اور کلنگا (اڑیسہ) کے حکمرانوں سے جنگ کرتی رہنی

پڑی اور آخر کار اُن کی حکومت سمٹ کر صرف مگدھ تک محدود ہوگئی اور آخر میں کانواس حکمرانوں کے ذریعہ شنگا حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور پورا ہندوستان الگ الگ صوبوں کی شکل میں خود مختاری کا اعلان کرنے لگا۔

کشان:- KUSHAN

ابھی پہلی صدی عیسوی کا عہد شروع ہی ہوا تھا کہ چین اور منگولیہ کے علاقہ کا ایک بدوی جنگلی قبیلہ جو یوہی چی (Yueh-Chi) کہلاتا تھا، پانی اور کھانے کی تلاش میں اپنے وطن کو چھوڑ کر ایک نئی جگہ کی تلاش میں کوچ کر گئے اور ہمالیہ کے ترائی کے علاقہ سے ہوتے ہوئے شمال مغربی ہندوستان میں آباد ہوگئے اور "کشان" کے نام سے مشہور ہوئے۔ وسط ایشیاء سے آنے والے تمام حملہ آوروں میں اس وقت سب سے زیادہ کشان طاقتور تھے۔ شروع میں انھوں نے ٹکشلا (موجودہ پاکستان کا علاقہ) میں اپنی چھوٹی سی حکومت کی بنیاد ڈالی اور بعد میں پورے پنجاب پر قابض ہوگئے۔ ان میں سے تیسرا کشان راجہ کنشکا (Kanishka) ۷۸ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کی حکومت پھیل کر پیشاور سے پٹنہ تک آگئی۔ جس میں پنجاب، کشمیر، سندھ، گجرات اور وسط ایشیاء کا کثیر حصہ شامل ہوگیا۔ اس کی راجدھانی پیشاور میں تھی۔ یہ ایک جنگجو اور بہادر سپاہی تھا۔ اور عمر کا زیادہ تر حصہ جنگ میں گزارا اپنی عمر کے اخیر حصہ میں کنشکا راجہ بدھ مذہب کا پیرو ہوگیا تھا۔ یہ آرٹ اور فنِ تعمیر کا بھی شوقین تھا۔ اس نے اپنے عہد میں بہت سے مندر، بدھ خانقاہیں اور حسین مورتیاں بنوائیں۔ جو آج بھی اس دور کی شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔

کنشکا نے اپنے دور میں ایک نئی صدی کی ایجاد کی جس کو ساکا صدی (Saka Era) کہتے ہیں۔ یہ عیسوی کیلنڈر کے حساب سے ۷۸ء کو شروع ہوتی ہے۔ جو آج بھی ہندوستانی کیلنڈر میں رائج ہے۔ کنشکا کے بعد کشان حکومت کمزور پڑتی گئی اور دھیرے دھیرے دکن میں "ستواہنہ" حکومت کے راجاؤں

نے اپنی طاقت کے زور پر ۱۰۶ء میں کشان کا خاتمہ کر دیا۔

گُپتا راجاؤں کا عہدِ زرّیں :-

ابھی تک کی تفتیش اور تلاش کے مطابق شمالی ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور تہذیبی زندگی کی معلومات تاریخ کے حوالوں میں بہت ہی کم ملتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جو دوسری اور تیسری صدی عیسوی کا ہے۔ اسی لئے اس دور کو تاریک دور، یا (Dark Age) کہا جاتا ہے۔ لیکن چوتھی صدی کے ابتدائی دور ہی سے پھر یہ علاقہ تاریخ میں نمودار ہو جاتا ہے اور مگدھ میں ایک نئی حکومت کا قیام ہوتا ہے جو "گپتا" حکومت کے نام سے جانی جاتی ہے۔ گپتا حکومت کے راجاؤں نے لگ بھگ دو سو سال تک تقریباً پورے ہند پر قبضہ رکھا۔ یہ یقیناً قدیم ہندوستان کا شاندار زمانہ کہلاتا ہے جسے تاریخ کی زبان میں عہدِ زریں یا (Golden Age) کہا جاتا ہے۔ اس عرصہ میں کئی گپت راجہ آئے، جنھوں نے ہندوستان کو سیاسی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے پوری دنیا کے سامنے اہم مقام دلایا۔ ان میں چندر گپت اوّل اس عہد کا پہلا سب سے اہم راجہ کہا جاتا ہے۔ یہ ۳۲۰ء کو تخت نشین ہوا اور اپنی حکومت کو ساکیت یعنی ایودھیا کے علاقہ میں مضبوط بنا لیا۔ اس کے بعد "پریاگ" موجودہ (الہ باد کا علاقہ) اور مگدھ (موجودہ بہار) تک سلطنت کو وسیع کیا۔ اس کی بیوی کماری دیوی نے بھی اس کے حوصلوں کو بلند کیا۔ چندر گپت اوّل کو اس کی بہادری اور عظمت کی وجہ سے مہاراجہ دھیراج کا لقب عطا کیا گیا۔ اس راجہ نے بعض دوسرے کارناموں کے علاوہ "گپتا صدی" کو بھی متعارف کرایا۔ ۳۳۵ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بہادر بیٹا سمندر گپت اوّل تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے باپ سے بھی آگے بڑھ کر حکومت کو مضبوط کیا اور ہندوستان کی تاریخ میں عظیم فاتح کہلایا۔ اس نے اتر پردیش، بہار، اڑیسہ، آندھرا اور تامل ناڈو تک اپنی حکومت کا اعلان کیا۔ یہاں تک کہ آسام، کانچی پورم، نیپال، راجستھان، سیلون اور

کشان وساکا کے قبیلہ بھی اس کو برابر حسبِ منشاء مال گزاری ادا کرتے رہتے تھے اور اس طرح ایک بار پھر مگدھ کی راجدھانی نہ صرف بھارت میں بلکہ پوری دنیا میں مشہور ہوگئی۔ سمندرگپت اوّل کے دور کے بہت سارے حالات الٰہ آباد میں پائے جانے والے ایک کھمبے پر لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ جو اسی زمانے میں تحریر کئے گئے تھے۔ سمندرگپت اوّل صرف ایک اچھا اور کامیاب راجہ ہی نہ تھا بلکہ وہ خود ایک نامور شاعر اور موسیقار تھا۔ اسی کے عہد کے ایک سکے پر اس راجہ کی تصویر وینا ساز کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ تمام مذاہب کا احترام کرتا تھا مگر بنیادی طور پر ہندو مذہب کا پیرو تھا۔ ۳۷۵ء میں سمندرگپت کا انتقال ہوگیا تو اس کا بیٹا چندرگپت ثانی راج کے سنگھاسن پر بیٹھا۔ یہ بھی اپنے دادا اور باپ کی طرح لائق اور طاقتور راجہ تھا۔ اس کو اپنے عہد کا وکرمادت بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی راجدھانی مگدھ سے منتقل کرکے اجین میں بنالی اور وہاں سے دکن کے راجاؤں کے ساتھ دوستانہ تعلقات بحال کئے۔ چندرگپت ثانی ایک کامیاب راجہ کے علاوہ آرٹ، ادب اور فنون لطیفہ کا بھی شیدائی تھا۔ اس نے اپنے دربار میں 'نورتن' کو عزت سے نوازا۔ سنسکرت ادب کا مشہور ڈرامہ نگار "کالیداس" بھی اسی کے عہد کا تھا۔ اسی کے زمانے میں چین کا ایک سیاح فاہیان بھی ہندوستان آیا تھا۔ جس نے اپنے سفرنامے میں چندرگپت ثانی کی تعریف کی۔ ہندوستان کے حالات اور خصوصاً پاٹلی پتر اور اجین کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ ۴۱۴ء میں چندرگپت ثانی کا انتقال ہوگیا اور ہندوستان کی سرزمین پر آرٹ، فن تعمیر، مندر، مورتیاں، سکے اور ادب کے شاندار نمونوں کو ہمیشہ کے لئے بطور یادگار چھوڑ گیا۔

۴۱۴ء سے ۴۶۷ء کے عرصہ میں کمارگپت اور سکندرگپت دو راجہ ہوئے۔ جو گپتا دور کے زریں عہد کو برقرار نہ رکھ سکے۔ اسی زمانے میں وسط ایشیاء سے آئے ہوئے ہیون (Hunas) قبیلہ نے ملک میں بڑی خونریزی کی۔ اُن کی ظلم کی داستانیں ہر طرف دہرائی جانے لگیں۔ وہ لوگ گھوڑسواری میں ماہر تھے۔ اور جنگجو تھے۔ نتیجہ کے طور پر یہ گپتا راجہ اُن کے آگے کمزور پڑ گئے اور ۵۲۲ء

تک گپتا راجہ اپنی حکومت کھو بیٹھے۔ اور "ہیون" قبیلہ کا ملک میں غلبہ ہو گیا۔

ہرش وردھن کا عہد :۔

گپتا دور کے ختم ہوتے ہی پورے شمالی ہند میں طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، اور یہ علاقہ چھوٹے چھوٹے راجاؤں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ لیکن "ہریش وردھن" کی کارکردگی سے پھر یہ علاقہ ایک جھنڈے تلے آگیا۔ اور امن و خوشحالی کی فضا قائم ہو گئی۔ ابھی ساتویں صدی کی پہلی دہائی بھی ختم نہ ہوئی تھی کہ دہلی سے لگ بھگ ایک سو سات ۱۰۷ کلومیٹر کی دوری پر تھانیشور کے مقام پر ایک چھوٹا سا راجہ پربھاکر وردھن حکومت کرتا تھا اس کے بعد اس کا بڑا بیٹا تخت نشین ہوا، مگر اس کو بھی قتل کر دیا گیا۔ لیکن ۶۰۶ء میں اس کا چھوٹا بیٹا ہرش وردھن صرف ۱۶ سال کی عمر میں راجہ بنا دیا گیا۔ ہرش وردھن نے سب سے پہلے مالوہ کو فتح کیا۔ پھر قنوج پر قابض ہوا۔ اور ایک طاقتور راجہ کے روپ میں اس نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اور ۶ سال کے عرصہ میں ہندوستان کا لگ بھگ پورا علاقہ سوائے دکن کے اس راجہ کے قبضہ میں آگیا اور پھر سے گپتا دور کے عہدِ زرّیں کی طرح ہرش وردھن کا زمانہ بھی یاد کیا جانے لگا۔ اس نے اپنی راجدھانی تھانیشور سے منتقل کر کے قنوج میں کر لی۔ ہرش کے عہد میں غیر ممالک جیسے چین، ایران، اور دوسرے پڑوسی ملکوں سے بھی اچھے تعلقات تھے۔ یہ راجہ اخیر زمانے میں بدھ مذہب کا پیرو بن گیا تھا۔ اس کے باوجود ہندو دھرم، اور ہندو لوگوں کی کافی عزت کرتا تھا۔

ہرش وردھن راجہ، خود ایک اچھا ادیب اور ادب نواز تھا۔ اس نے سنسکرت میں کئی ڈرامہ بھی لکھے۔ اس کا انتقال ۶۴۷ء میں ہوا۔

ہرش وردھن کے ہی زمانہ میں چینی مشہور سیّاح ہیون سانگ ہندوستان آیا۔ خود راجہ اس کے استقبال کو باہر نکلا اور اس کو انعام و اکرام سے نوازا۔

راجہ ہرش وردھن خود بھی تعلیم یافتہ تھا اور تعلیم کو فروغ دینے میں دلچسپی رکھتا

تھا۔ اس نے گپتا راجاؤں کی بنیاد ڈالی ہوئی یونیورسٹی نالندہ میں پھر سے نئے علوم کے ساتھ اس کو فروغ دیا۔ یہ وہی نالندہ یونیورسٹی (بہار) ہے جس میں چینی سیاح ہیون سانگ نے بھی بدھ مذہب کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ہرش وردھن کے زمانے میں اس تعلیم گاہ کو نئی اور ترقی یافتہ شکل دی گئی۔ لوگ دور دراز سے آرٹ، ادب، مذہب، فلسفہ اور مختلف سائنس کے علوم حاصل کرنے بھی آیا کرتے تھے، جہاں مفت تعلیم کے علاوہ ان کے رہنے سہنے کا بھی معقول انتظام تھا۔ نالندہ یونیورسٹی کی تعلیمی سرگرمیاں برابر ۱۲ویں صدی عیسوی تک جاری رہیں۔ بعد میں دوسرے حکمرانوں کی بے توجہی کی وجہ سے اس جگہ کو وہ اہمیت حاصل نہ ہوسکی۔ مگر آج بھی بہار کے علاقہ نالندہ میں محکمۂ آثار قدیمہ کے ماہرین کی کھدائی کے ذریعہ جو آثار ملے ہیں۔ اُن سے اس جگہ کی تاریخی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

راجہ ہرش وردھن اپنی حکومت کے چالیس شاندار سال پورے کرنے کے بعد ۶۴۷ء میں انتقال کرگیا۔ اس کے بعد فوری طور پر تاریخ میں کسی بھی اہم راجہ کا نام قابلِ ذکر نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر سے شمالی ہند میں حکومت کمزور پڑ گئی۔ اور مختلف صوبوں میں بٹ گئی اور دکن کے راجاؤں کو ایک بار پھر اپنا زور دکھانے کا موقع مل گیا۔ دکن میں ساتویں صدی کا زمانہ چالکیا راجاؤں کا کہلاتا ہے۔ اس کے ساتھ پلوا، اور پانڈوا راجاؤں نے دکن کے علاقہ میں آرٹ اور ادب کی ترویج و ترقی کا کام کیا اور شمالی ہند کی طاقتیں اُن کے آگے ماند پڑ گئیں۔

آٹھویں صدی کے آتے ہی ہندوستان میں بیرونی طاقتوں نے حملے کرنے شروع کردیئے۔ جن میں عرب حکمرانوں نے اسلام کے پرچم تلے ہندوستان میں آکر عہدِ وسطیٰ کا آغاز کیا اور یہی سے قدیم ہندوستان کا باب ختم ہوکر دورِ وسطیٰ شروع ہوجاتا ہے۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب

دنیا کی سب سے پرانی اور ابتدائی ملکوں کی تہذیب کا جب بھی ذکر آتا ہے، تو ان میں یونان، مصر اور میسوپوٹامیا کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں وادیٔ سندھ کی تہذیب کا نام بھی ضرور لیا جاتا ہے۔

آج سے تقریباً ۵۰۰۰ سال پہلے اور حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے لگ بھگ ۲۵۰۰ سال قبل، ایک اعلیٰ درجہ کی ترقی یافتہ تہذیب کا ذکر جب بھی کیا جاتا ہے تو اُسے وادیٔ سندھ کی تہذیب Indus Valley Civilisation یا ہڑپا کی تہذیب سے پکارا جاتا ہے۔۔۔۔ یہ تہذیب یافتہ قوم دریائے سندھ اور دریائے سرسوتی کے کنارے آباد تھی۔ عجیب اتفاق تھا کہ ۱۹ویں صدی کے اختتام تک اس کا کوئی پتہ نہ لگ سکا تھا۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں آثارِ قدیمہ کے دو اہم ماہرین یعنی آر، ڈی، بنرجی R. D. Banarji اور ڈی، آر ساہنی D. R. Sahani نے سندھ میں موہن جودارڑو اور پنجاب میں ہڑپا جیسے تاریخی شہروں کی دریافت کرکے یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستان بھی ان چند پرانے اور قدیمی تہذیب یافتہ شہروں میں سے ایک ہے جس کا سلسلہ پانچ ہزار سال پرانی تاریخ سے جا ملتا ہے۔ ہڑپا اور موہنجوداڑو کی دریافت ۲۱-۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ شہروں کی دریافت کے سلسلے میں کھدائی کا کام جان مارشل John Marshal کے زیرِ نگرانی شروع ہوا تھا، اور اسوقت اس دریافت کو بیسویں صدی کا سب سے اہم کارنامہ شمار کیا جاتا ہے۔۔۔۔ وادیٔ سندھ کے اس تہذیبی

شہر کی کھوج سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس دور کے لوگ کس قدر تہذیب یافتہ تھے۔ ان کے شہر ایک منظم طریقہ پر بنائے جاتے تھے۔ ان کے مکانات پکی ہوئی مٹی یعنی اینٹوں کے بنے ہوئے ہوتے تھے۔ ان کے گھروں میں سیڑھیاں، غسل خانے، باورچی خانے اور پانی کی نکاسی کے لئے باقاعدہ انتظام تھا۔ وادیٔ سندھ کے باشندے پکی ہوئی مٹی کے زیورات، کھلونے، چھوٹی چھوٹی مورتیاں اور مہریں بھی بنا کر استعمال کرتے تھے۔ وہ اپنے شہروں کے اطراف زراعت و کھیتی باڑی بھی کرتے تھے گیہوں، چنا، جو، روئی، کھجور اور بعض دوسری فصلوں کی کھیتی بھی کرتے تھے۔ ان میں سے اس دور کے نمونوں کو آج بھی بہت سے دوسرے میوزیم کے علاوہ دہلی کے نیشنل میوزیم میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جن میں سے پکے ہوئے گیہوں اور کھجور کے دانے، مٹی کے برتن، ترازو، باٹ، زیورات، مورتیاں کھلونے اور ہتھیار وغیرہ عوام کی نمائش کے لئے دکھائے جاتے ہیں۔

اس دور کی کچھ مہریں بھی ملی ہیں، جن پر کچھ تحریریں بھی ملتی ہیں۔ ہمارے تاریخ داں اور ماہرینِ فن کی پوری کوشش جاری ہے کہ ان کو پڑھ کر کسی صحیح نتیجہ تک پہونچا جا سکے۔

آج سے تقریباً پانچ ہزار سال پرانے اس تہذیبی شہر موہنجوداڑو اور ہڑپا سے جو مٹی کے کھلونے اور چھوٹی چھوٹی انسانوں کی بنی ہوئی مورتیاں ملی ہیں۔ ان میں سب سے اہم اور بین الاقوامی شہرت یافتہ کانسہ (Bronze) کی بنی ہوئی ایک رقاصہ کی مورتی ہے جسے عام طور پر Dancing Girl کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ویسے تو یہ کانسہ کی مورتی صرف چند انچ لمبی ہے مگر اس کی بناوٹ اور کانسہ پر انسانی تاثرات کا اظہار اس دور کے فن کی اعلیٰ کاریگری کو ظاہر کرتی ہے۔ ایک جوان عورت کے تاثرات چہرے پر عیاں ہیں دایاں ہاتھ کمر پر ٹکا ہوا ہے، بائیں ہاتھ میں چوڑیاں موجود ہیں۔ گلے میں ہار بھی ہے اور زلفوں پر نہایت ہی سلیقہ سے کنگھی کا پتہ چلتا ہے۔ اگر اس کانسہ کی بنی ہوئی ڈانسنگ گرل کا آج سے پانچ ہزار سال پہلے تہذیبی پس منظر میں جائزہ لیا جائے تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ضرور ایسی کامیاب کوشش کسی تہذیب یافتہ دور میں ہی کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض مزدوروں، جانوروں، چڑیوں اور

پہیہ دار گاڑیوں کے ماڈل بھی بنے ہوئے ملے ہیں۔ جن میں ایک بھینس گاڑی کو نیشنل میوزیم دہلی میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ہڑپا اور موہن جداڑو کے اس دور کے بنے ہوئے مٹی اور بعض دھاتوں کے برتنوں کا بھی سراغ لگا ہے۔ جو وادیٔ سندھ کے قرب وجوار میں پائے گئے ہیں۔ مٹی کے ان برتنوں کو دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کمہار کے ذریعہ پہیہ کو گھما کر بڑے ہی خوبصورت انداز میں ان برتنوں کی تشکیل ہوتی تھی۔ کمہار ان کو بنانے کے بعد بھٹی میں پکا کر تیار کرتا تھا، جن میں پیالے برتن، صراحیاں اور اناج رکھنے کے لئے بڑے بڑے مٹکے تیار کئے جاتے تھے، جن میں جالی اور نقش ونگاری کا بنا ہوا کام بھی ملتا ہے۔ بعض بڑے بڑے مٹکوں پر پیپل کے پتوں، جانوروں، مچھلی اور بعض دائرے بھی بنے ہوئے ملتے ہیں۔ بعض برتنوں پر تو ایک خاص طرح کا نشان یا تحریر بھی پائی جاتی ہے جس کو ابھی تک پوری طرح نہیں پڑھا جا سکا ہے ــــ

اس دور کے زیورات بھی اپنی انفرادی شناخت کے ساتھ منظرِ عام پر آئے ہیں۔ اس زمانے کے کاریگر یا سنار وغیرہ، سونے چاندی، تانبہ، کانسہ، سیپ، ہاتھی دانت، قیمتی پتھروں، اور نگینوں کے ذریعہ زیورات وغیرہ بناتے تھے۔ آج بھی اس زمانے کے بنے ہوئے بعض موتیوں اور پتھروں کے ہار، چوڑیاں اور گلوبند، کان کے زیور اور پاؤں زیب وغیرہ ملتے ہیں، جن کو آثارِ قدیمہ اور قومی عجائب گھروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں تک کہ کانسہ اور تانبہ کا استعمال تو وہ لوگ خوب کرتے تھے، جن میں تولنے کے لئے باٹ اور انگوٹھیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یہ سارے کے سارے زیورات اور دوسری اشیاء وادیٔ سندھ کے شہروں میں ماہر کاریگروں اور فن کاروں کے ذریعہ سے تیار کی جاتی تھیں اور جن پر طرح طرح کی نقاشی کے ذریعہ ان کو دل کش اور دل آویز بنانے کی کوشش کی جاتی تھی۔

اسلحہ اور ہتھیار کی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ اتنی ہی پُرانی ہے جتنی کہ اس دنیا کی عالمِ وجود میں آنے کی کہانی اگر سب سے ابتدائی اسلحہ یا ہتھیار کی تاریخ دریافت کی جائے تو اس کا رشتہ تو ما قبل تاریخ یعنی (Pre Historic) سے جا ملتا ہے، لیکن اس

وقت کے اسلحہ تو صرف پتھروں یا لکڑی یا جانوروں کی ہڈی کے ہوتے تھے۔ جنھیں ہم قدرتی ہتھیار کہہ سکتے ہیں۔ مگر انسان کی اپنی کوشش کے ذریعہ بنے ہوئے اسلحہ کا رشتہ تو صرف اس وادیٔ سندھ کی تہذیب سے ملتا ہے۔ کیوں کہ اس دور میں کلہاڑی، دھار دار اور پھل دار اسلحہ، چاقو، چھرے اور بلم و نیزے بھی بنائے جاتے تھے۔ اس لئے اسلحہ یا ہتھیار کو بنانے کا سلسلہ اس زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس دور کی اب تک دریافت کے مطابق یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جو بھی اسلحہ بنائے ہیں، ان کو شاید صرف جانوروں کو مارنے کے لئے یا گھریلو استعمال کے لئے ہی بنایا تھا۔ جنگ اور آپسی لڑائی کی ابھی تک کوئی شناخت نہیں ہو سکی ہے۔

وادیٔ سندھ کے ہڑپا اور موہن جو داڑو جیسے تہذیبی شہروں پر مزید دریافت اب بھی جاری ہے اور امید کی جاتی ہے کہ وہ تمام باتیں بھی سامنے آجائیں گی جو ابھی تک نہیں جانی جا سکی ہیں۔ مثال کے طور پر اس زمانے کی لکھی ہوئی تحریریں کیا مطلب ظاہر کرتی ہیں، یا ان کو کس جانب سے پڑھا جائے۔ ان حروف کا رشتہ کس زبان یا کس رسم الخط سے ملتا ہے، ایسی ہی بعض دوسری تحقیقات ابھی تک ہو رہی ہیں۔ مگر اب تک کوئی قطعی بات سامنے نہیں آسکی ہے۔ ہاں البتہ اب تک کی تحقیق کے مطابق اس برصغیر کی سب سے پرانی اور سب سے زیادہ تہذیب یافتہ قوم کو وادیٔ سندھ کی آبادی ہی سے منسوب کیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں عہدِ وسطیٰ کی تاریخ

ہندوستان میں عہدِ وسطیٰ اس زمانہ کو کہتے ہیں جو قدیم ہندوستانی تاریخ کے خاتمے سے لے کر دورِ جدید تک باقی رہا۔ جس کو انگریزی میں (Medieval Period) کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ قدیم دور کا اختتام ۸ ویں صدی عیسوی میں ہو جاتا ہے اور تبھی سے دورِ وسطیٰ کا آغاز ہوتا ہے جو تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ اور ۱۸ ویں صدی میں اس کا خاتمہ ہوا۔ یہیں سے "دورِ جدید" کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس طرح موٹے طور پر ہندوستان کی مکمل تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اُن میں سے ہر دور ہر لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ عہدِ قدیم میں یونان اور چینی اثرات تو ہندوستان کی سرزمین پر ظاہر ہوئے مگر پورے طور پر بھارت ہی کے لوگوں نے یہاں حکومت کی اور پورے ہندوستان کو دیسی تہذیب، ثقافت، آرٹ، آرکیٹکچر اور مذاہب کے پیشِ نظر ہی آگے بڑھایا۔ لیکن "دورِ وسطیٰ" میں ترکی، عرب، افغان، مغل اور ایرانی اثرات ہندوستان کی سرزمین پر اس قدر نمایاں انداز میں سامنے آئے۔ جس سے چشم پوشی ممکن نہ تھی۔ یہ بیرونی طاقتیں کسی نہ کسی وجہ سے ہندوستان کی سرزمین پر آئیں اور واپس نہیں گئیں۔ اور کچھ ہی عرصے میں اس ملک کو انھوں نے بھی اپنا وطن تسلیم کر لیا۔ اور اس طرح ایک نئے دَور اور مشترکہ تہذیب کی بنیاد پڑ گئی۔

راجپوت :- ساتویں صدی کے وسط میں ہرش وردھن کے انتقال کے بعد

پورے ہندوستان میں خانہ جنگی کا عالم تھا۔ اور تمام علاقائی طاقتیں اپنی خود مختاری کا اعلان کر چکی تھیں۔ اور ۶۴۷ء سے ۱۱۹۲ء کی مدت میں کئی چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ مگر شمال اور وسط ہندوستان میں ایک بڑا علاقہ 'راجپوت' راجاؤں کے قبضہ میں تھا۔ اس وجہ سے مذکورہ زمانہ عام طور پر "راجپوت دور" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ راجپوتوں کی ابتدا اور ان کی نسل کے بارے میں مورّخین کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ کچھ مغربی تاریخ دانوں کی نظر میں راجپوت کی نسل ہندوستان کے باہر سے آئی ہوئی ہے۔ اُن کے نزدیک یہ لوگ بھی کشان کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیونکہ راجپوت کے معنیٰ ہیں "راجہ کا پوت" یا بادشاہ کا لڑکا" اور جو لوگ راجہ نہ بن سکے، وہ جاٹ، گوجر اور اہر کہلائے۔ لیکن ہندوستانی مورخین کے نزدیک یہ لوگ آریہ کی نسل سے خالص ہندوستانی ہیں۔ اور "سوریہ ونشی" کہلاتے ہیں اور کچھ لوگوں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ ہندو عقیدہ کے مطابق ان کی پیدائش آگ سے ہوئی ہے اور یہ "اگنی کل" راجپوت ہیں۔ زمانہ قدیم سے برہمن کے بعد راجپوتوں کو اہم مقام اور مرتبہ حاصل رہا ہے اور تمام بہادری کے کاموں میں یہ لوگ شامل رہے ہیں۔

دسویں صدی کے اواخر میں جب محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملے شروع کئے تو اس وقت شمالی ہند کے بیشتر حصہ پر راجپوت ہی قابض تھے۔ جن میں سے دہلی، اجمیر، قنوج، مالوہ، بندیل کھنڈ، پال وغیرہ حکومتیں قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ راجپوتوں کے قبضہ میں ہندوستان کا بیشتر علاقہ تھا۔ لیکن آپسی رنجش کی وجہ سے یہ لوگ کوئی ایسی حکومت قائم نہ کر سکے جو صرف ایک راجہ کے قبضہ میں ہوتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیرونی حملوں کے آگے ان کی طاقت متحد نہ ہو سکی۔ اور جنگ کے صحیح طریقوں سے ناواقفیت کی بنا پر بھی یہ لوگ کمزور پڑتے گئے۔ نانہ شاہی، آمریت اور عیش و عشرت بھی ان راجپوت راجاؤں کے زوال کا ایک اہم سبب بنا۔ اس کے علاوہ پورا ہندوستان طبقاتی فرق کے ساتھ پہچانا جانے لگا۔ اونچے طبقے کے لوگوں نے کمزور اور نچلے درجہ

کے ہندوستانیوں کو ذات پات کے فرقوں کے ساتھ اپنا محکوم بنا لیا۔ عام رعایا اُن کے ظلم اور آمریت سے پریشان ہو کر باغی ہونے لگی۔ اس زمانے میں مذہب کے نام پر جب تفرقہ کی بنیاد پڑنے لگی، تو "بھگتی تحریک" کا آغاز ہوا۔ اور تمام نچلے طبقے کے لوگوں نے اس تحریک کا ساتھ دیا۔ بدھ مذہب کا زوال بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے کیونکہ اب بھگتی تحریک کی تدریسی زبان عوامی زبان تھی اور اس کا نشانہ سماج کے پس ماندہ اور گرے ہوئے انسان تھے۔ اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ راجاؤں اور اونچے طبقہ کے خلاف عوام میں بغاوت پھیلنے لگی۔ اور راجپوت حکومت دم توڑنے لگی۔۔۔۔۔۔ لیکن اس عہد میں آرٹ اور فنونِ لطیفہ کی بھی خاصی ترقی ہوئی۔ بہت سے مندر اور قلعہ بنوائے گئے۔ جن میں سورج مندر کونارک ہیں۔ مہادیو مندر کھجوراہو میں اور لنگ راجہ مندر بھوبانیشور میں اس زمانے کی یادگار ہیں جو انفرادی فنِ تعمیر اور اعلیٰ فنی خوبیوں کی وجہ سے آج بھی ہمارے ملک کی فنی میراث ہیں۔ چتوڑ کا قلعہ، رنتھمبور کا قلعہ، مانڈو اور گوالیار کے قلعہ نیز بعض دوسری جگہوں کی عمارتیں بھی راجپوت عہد کے فنِ تعمیر کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔

ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی آمد:۔

اسلام کی بنیاد عرب میں پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت سے پڑتی ہے جو ۵۷۰ء میں شہر مکہ کے ایک معزز گھرانے میں تشریف لائے اور نہ صرف عرب کی سرزمین پر بلکہ پوری دنیا اسلام مذہب کا امن آشتیں اور بھائی چارہ کا پیغام دیا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا کہ خدا ایک ہے اور صرف اس کی عبادت جائز ہے اور کلمہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ" کی آواز کے ساتھ تمام دنیا دی برائیوں کا خاتمہ کرنے کی کوشش کی۔ ۶۲۲ء کی ۱۲ جولائی کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی۔ یہیں سے اسلامی تاریخ میں ہجری سال کی ابتدا ہوتی ہے۔ کچھ ہی عرصہ میں عرب کے بیشتر حصہ میں اسلام پھیل گیا اور اس کے پیروکار مسلمان

کہلائے اور ۶۳۲ء میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی۔ آپ کے بعد خلفائے راشدین کا زمانہ آتا ہے، جن میں سب سے پہلے خلیفہ حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں۔ ان کے بعد حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے اسلام کی شان کو برقرار رکھا۔ ان کے بعد اُمیہؓ دور آیا۔ جو تقریباً ساڑھے تین سو سال تک قائم رہا۔ اس کے بعد دورِ عباس آیا اور بارہویں صدی عیسوی کے وسط تک اسلام، عرب کی سرزمین سے باہر نکل کر ایران، ہسپانیہ، اندلس، عراق، یہاں تک کہ ہندوستان کے بعض علاقوں تک پہونچ گیا۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ میں جو سب سے پہلا نام اسلامی روایات سے منسلک ہوتا ہے وہ محمد بن قاسم کا ہے۔ جو ۷۱۲ء میں سندھ کی طرف سے ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔ جس کی جنگ یہاں کے راجہ داہر سے ہوئی تھی۔ محمد بن قاسم سندھ اور ملتان پر قابض ہو گیا مگر عربوں کی سازش کی وجہ سے محمد بن قاسم کو قتل کر دیا گیا۔ مگر اس کے ہمراہ آتے ہوئے بہت سے ساتھی اور سپاہی سندھ کے علاقہ میں مقیم ہو گئے اور تقریباً دو سو سال تک ہندوستان میں ان کا قیام رہا۔ اس دور میں اسلام کی نمایاں پہچان نہ بن سکی۔

لیکن محمود غزنوی، جو کہ افغانستان کے علاقہ "غزنہ" کا ایک چھوٹا سا حکمران تھا۔ اس نے ۱۰۰۰ء سے ۱۰۲۶ء کے دوران متواتر ہندوستان پر ۱۷ بار حملے کئے۔ اس کی جنگ پنجاب کے راجہ جے پال اور انند پال سے ہوئی۔ نتیجہ کے طور پر اس ملک کا ڈھیر سارا سامان، اور خزانہ لے کر محمود غزنوی افغانستان واپس چلا گیا۔ لیکن اس کا اثر ہندوستانی تہذیب اور ثقافت پر پڑا۔ اس نے عربی اور ناگری رسم الخط میں کچھ سکّے بھی رائج کئے۔ کچھ مسجدیں اور مقبرے نیز تالاب بھی بنوائے۔ جن کے منہدم اور غیر مکمل آثار کا پتہ بھی ملتا ہے۔ اب ہندوستان میں اسلام مذہب کو تو ضرور جانا جاتا تھا مگر یہاں کی سرزمین پر ہندو راجہ اور رجواڑوں ہی کا قبضہ تھا۔

مگر بارہویں صدی کے اواخر کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کے ساتھ شروع ہوتا ہے، جب شہاب الدین محمد غوری افغانستان کے علاقہ غور سے اس

ملک میں پنجاب کی طرف سے داخل ہوتا ہے۔ اس بار محمد غوری کا مقصد محض یہاں کی دولت سمیٹنا نہیں تھا، بلکہ وہ اس ملک کو فتح کر کے اپنی حکومت بھی ہندوستان میں قائم کرنا چاہتا تھا۔ سنہ ۱۱۷۸ء میں اس نے پہلی بار یہاں حملہ کیا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن نویں بار حملہ میں شہاب الدین محمد غوری جس کو ابن سام بھی کہا جاتا ہے سنہ ۱۱۹۱ء میں اس کا مقابلہ دہلی کے راجہ پرتھوی راج چوہان سے 'میدان تیرین" میں ہوتا ہے اور پرتھوی راج کو شکستِ فاش ہوتی ہے۔ تبھی سے محمد غوری کے سپہ سالار اعظم قطب الدین ایبک کے زیرِ نگرانی ہندوستان کی سرزمین پر موجود قطب کے علاقہ دہلی میں اسلامی حکومت کی بنیاد پڑتی ہے۔ جس کو "سلطنت" دور کے نام سے جانا جاتا ہے۔

سلطنت دور :-

دہلی کے حکمرانوں نے سنہ ۱۲۰۶ء سے لے کر سنہ ۱۵۲۵ء تک حکومت کی اور اس ملک کا بیشتر حصہ اپنے قبضے میں رکھا۔ چونکہ یہ سلطان کہلاتے تھے۔ اس وجہ سے اس پورے دور کو "سلطنت" کہا جاتا ہے۔ اس عرصہ میں پانچ حکومتوں نے یکے بعد دیگرے منفرد ناموں سے کاروبارِ سلطنت چلایا۔ جن کے نام یہ ہیں۔ غلام خاندان (۱۲۰۶ - ۱۲۹۰) خلجی (۱۲۹۰ - ۱۳۲۱) تغلق (۱۳۲۱ - ۱۴۱۳) سید (۱۴۱۴ - ۱۴۵۱) اور لودھی (۱۴۵۱ - ۱۵۲۶) جنھوں نے تقریباً ساڑھے تین سو سال تک پورے ہندوستان میں حکومت کی۔

غلام خاندان :-

غلام خاندان کے سلطانوں میں قطب الدین ایبک کو اس پوری سلطنت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ جس کے عہد میں قطب مینار، مسجد قوۃ الاسلام دہلی میں اور اجمیر میں ایک جامع مسجد بنائی گئی ـــــ لگ بھگ چار سال متواتر حکومت کرنے کے بعد ایبک کا انتقال ہو گیا۔ یہ ۱۲۱۰ء میں چوگان کھیلتے ہوتے گھوڑے سے گر کر ہو گیا۔ اس کا مقبرہ آج بھی لاہور میں موجود ہے ـــــ اس کے بعد التمش دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس نے

راجدھانی کو لاہور سے منتقل کر کے دہلی میں مستقل طور پر بنایا اور اپنے آقا قطب الدین ایبک کی حکومت کو وسیع تر کیا۔ اس زمانے میں بنگال، مالوہ، اُجین اور گوالیر کو بھی فتح کیا گیا اسی کے زمانے میں وادیٔ سندھ اور دریا کے قریب تک منگول حکمران چنگیز خاں اپنی زبردست فوج کے ساتھ کسی دشمن کا پیچھا کرتے ہوئے آ گیا مگر پھر وہیں سے واپس لوٹ گیا۔ اس طرح التمش کو چنگیز خان سے نجات مل گئی۔ یہ بادشاہ ایک اچھا اور کامیاب حکمران تھا۔ اس کے زمانے میں بعض اہم تعمیرات ہوئیں۔ اس نے قطب مینار کو مکمل کروایا۔ اجمیر میں اڑھائی دن کا جھونپڑہ مسجد تعمیر ہوئی اور دلی کے قلعہ رائے پتھوڑہ (موجودہ جنوبی دلی) میں قصر سفید نامی ایک سفید محل بنوایا تھا۔ اس کے زمانے میں اسلامی فن تعمیر کی اُبھرتی ہوئی شکل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۲۳۶ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد فوراً اس کا بیٹا رُکن الدین تخت پر بٹھایا گیا۔ مگر نا اہل ہونے کی وجہ سے رضیہ سلطان کو ہندوستان کی پوری تاریخ میں پہلی خاتون سلطان بننے کا فخر حاصل ہوا — رضیہ سلطان اگرچہ ایک کامیاب اور بہادر ملکہ تھی مگر عورت کی حیثیت سے اس وقت کے مردوں پر اس کا تسلط پسند نہیں کیا گیا اور آخر کار سیاسی طور پر ۱۲۴۰ء میں اس کا قتل ہو گیا۔ اس کے بعد ناصر الدین محمود جو کہ اس کا بھائی تھا، سلطنت کا حاکم مقرر کیا گیا۔ یہ ایک شریف، خدا ترس، ایماندار اور سچا مسلمان تھا۔ اس کو حکومت کے کام اور سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ آہستہ آہستہ اس کا وزیر غیاث الدین بلبن نے حکومت کو سنبھال لیا اور محمود کے انتقال کے بعد ۱۲۶۶ء میں بادشاہ بن گیا۔ بلبن لائق اور قابل حکمران تھا۔ جس نے اپنے ملک پر اپنا دبدبہ قائم کر لیا۔ اور اپنے محل میں شان و شوکت کا ماحول پیدا کر لیا۔ لوگ بلبن کے دربار میں آتے اور بادشاہ سلامت کے حضور میں سجدہ کرتے اور قدم بوسی کی اجازت حاصل کرتے، مگر آخر میں یہ سلطان بھی ۱۲۸۶ء میں فوت کر گیا۔ اس کے لڑکوں میں وہ اہلیت نہ تھی کہ حکومت سنبھال سکتے۔ اس کا ایک وزیر جلال الدین خلجی ۱۲۹۰ء میں خلجی دور کے بانی کی حیثیت سے بادشاہ بن بیٹھا۔

خلجی:۔ خلجی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی غلام خاندان کا دور ختم ہو جاتا ہے۔

جلال الدین افغان نسل کا ایک بہادر سپاہی تھا۔ مگر ساتھ ہی رحمدل اور بوڑھا بھی تھا۔کیونکہ ستر سال کی عمر میں اس کو تخت شاہی پر بیٹھنے کا موقع ملا۔ مگر اس کا بھتیجا علاؤ الدین خلجی ایک بہادر، چالاک، نڈر اور لائق وزیر تھا۔ جس نے اپنے چچا کو قتل کر کے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ اور ۱۲۹۶ء میں بادشاہت کا اعلان کر دیا۔علاؤ الدین خلجی اگرچہ چالاک اور مطلب پرست آدمی تھا، مگر اس نے اپنی لیاقت اور بہادری سے پورے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ بڑے بڑے معرکے سر کیئے اور کچھ ہی مدت میں خلجی دور کو ایک اعلیٰ مقام عطا کر دیا۔ بنگال، گجرات، شمال اور جنوبی ہندوستان سب اس کی بادشاہت میں شمار کیا جانے لگا۔ اس کی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کی بناء پر پورے ملک میں علاء والدین خلجی کو جانا جانے لگا۔ اور پہلی بار ہندوستان میں اسلامی حکومت کو وہ مرتبہ حاصل ہوا، جو قدیم ہندوستانی تاریخ میں سمندر گپت موریہ اور سمراٹ اشوک کو حاصل تھا۔ حکومت میں بغاوت نہ پھیلنے کے خطرے کے پیش نظر علاؤ الدین کا یہ حکم تھا کہ اس کی موجودگی کے بغیر کوئی بھی اجتماع نہیں کیا جا سکتا ہے۔ لوگوں کو ایک ساتھ جمع نہ ہونے کی سخت ہدایت تھی۔ اس کے زمانے میں جاسوسی کا انتظام بھی خاصہ کامیاب تھا۔ اس کے زمانے میں تمام مذہبی رہنماؤں کو حکومت کے کاموں میں دخل دینے سے روک دیا گیا تھا۔ اس کے زمانے میں فن تعمیر کی طرف بھی خاصی توجہ دی گئی۔ ہندوستان کی سرزمین پر پہلی بار سلجوقی فن تعمیر کی روایت کو اپنایا گیا۔ جس سے کنول کے پھول اور کشیدہ کاری کے ساتھ ساتھ محراب کا ایک چھوٹا تصور سامنے آیا۔ اور جو بھی تعمیرات ہوئیں، ان میں اسلامی فن تعمیر کو پیش کیا گیا۔اس کی سب سے واضح اور کامیاب مثال دہلی میں قطب سے منسلک "علائی دروازہ" ہے جو تمام تر اسلامی ضابطوں پر تیار کیا گیا ہے۔ اور گھوڑے کی نعل سے ملتی ہوئی شکل کی محراب پہلی بار ہندوستان میں تعمیر ہوئی۔ اس کے علاوہ اسی جگہ پر علائی مینار بھی بننا شروع ہوئی۔ جو قطب مینار سے دوگنی اونچائی کی بنائی جانے والی تھی۔ مگر علاؤ الدین کے انتقال کے بعد یہ کام پورا نہ ہو سکا۔ اس بادشاہ نے بنگال، گجرات اور دوسرے

شہروں میں بھی مسجدیں، مقبرے، قلعہ بنوائے، جن میں دہلی کا سیری فورٹ، آج بھی نامکمل حالت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ۱۳۲۰ء میں علاء الدین خلجی کا انتقال ہو گیا۔ اور بعد میں کوئی بھی ایسا خلجی بادشاہ نہ آسکا جو اس حکومت کو قائم رکھ سکتا۔

تغلق:۔

۱۳۲۱ء میں غیاث الدین تغلق خلجی کے آخری کمزور حکمراں مبارک خان کو قتل کر کے تغلق حکومت کی بنیاد کے ساتھ ایک نئے دور کا آغاز کرتا ہے۔ اس نے فن تعمیر میں تزئین اور مرصع نگاری کو ختم کر دیا اور سادہ انداز میں عمارتیں بنوانا شروع کیں۔ اور بھورے رنگ کا پتھر کثرت سے استعمال کیا۔ اس کی کامیاب مثال تغلق آباد کا قلعہ ہے اور اس کا مقبرہ ہے۔ دلی کے جنوب میں اس بادشاہ کے عہد میں کئی عمارتوں کی تعمیر ہوئی۔ اس کے عہد میں شعراء اور صوفیائے کرام کو کافی فروغ ہوا۔ خصوصاً امیر خسرو کا نام قابلِ ذکر ہے۔ ۱۳۲۵ء میں غیاث الدین تغلق کے بعد اس کا بیٹا محمد بن تغلق دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ اس نے ایک چھوٹا سا قلعہ "عادل آباد" بنوایا اور نام نہاد چوتھی دلی "جہاں پناہ" کی بنیاد ڈالی۔ محمد بن تغلق بادشاہ تو اچھا تھا مگر کچھ حرکتوں کی وجہ سے اس کے دور میں انتشار برپا ہو گیا تھا۔ جس میں سے دہلی سے تمام لوگوں بسمت جنوب میں دولت آباد، لوگوں اور راجدھانی کا منتقل ہونا بھی ہے اور بعد میں دوبارہ دہلی کی طرف واپسی۔ اس حرکت کی وجہ سے محمد بن تغلق کی حکومت کو کافی نقصانات اٹھانے پڑے اور عام لوگوں میں اس کو سنکی بادشاہ کہا جانے لگا۔ ۱۳۵۱ء میں اس کے انتقال کے بعد فیروز شاہ تغلق ۱۳۵۱ء تا ۱۳۸۸ء کو بادشاہ بنایا گیا۔ جو تغلق دور کا سب سے زیادہ کامیاب اور فن تعمیر کو فروغ دینے میں مشہور بادشاہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں ہندوستان کی حکومت مضبوط ہوئی۔ شکارگاہیں، زراعت اور عمارتوں کے علاوہ مقبرے اور تالاب بنوائے گئے۔ قطب مینار، سلطان غوری کا مقبرہ اور سورج کنڈ کو دوبارہ ٹھیک کیا گیا۔ اشوک کے زمانے کے دو

مشہور کھمبے (PILLAR) جو امبالہ اور میرٹھ میں پڑے تھے۔ دہلی لاتے گئے اور فیروز شاہ کوٹلہ میں ایک کو نصب کیا گیا۔ دوسرا پرانی دلی میں ہی دوسری جگہ پر رکھا گیا۔ اور نہ صرف دہلی میں بلکہ پورے ہندوستان میں فیروز شاہ تغلق کو کامیابی اور نصرت حاصل ہوئی۔ فیروز کے انتقال کے بعد تغلق حکومت کی وہ شان باقی نہ رہی سکی۔ ساتھ ہی ۱۳۹۸ء میں ہندوستان اور خصوصاً دہلی پر تیمور لنگ کے زبردست حملہ سے شہر بری طرح برباد ہو گیا۔ تیمور نے دہلی میں تقریباً ایک سال قیام کیا۔ پورے شہر میں دہشت کا عالم طاری رہا۔ تیمور تو واپس چلا گیا مگر راجدھانی کا ساز و سامان اور خزانہ خالی کر گیا۔ اور اس طرح تغلق حکومت بھی سیاست کا شکار ہو کر دم توڑنے لگی۔

سید :-

آخری تغلق بادشاہ محمود تغلق اب کمزور پڑ چکا تھا۔ ۱۴۱۴ء میں خضر خان نے اس کو ہٹا کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور سید حکومت کی بنیاد پڑ گئی۔ اس میں ۱۴۱۴ء سے ۱۴۴۴ء تک چار سید بادشاہ آتے، مگر پورے دور میں کوئی اہم اور قابل ذکر کام نہ ہو سکا۔ فن تعمیر میں ضرور کچھ انفرادی انداز دیکھا جا سکتا ہے۔ جس کی مثالیں محمد شاہ کا مقبرہ، لودھی گارڈن دہلی میں، ایک خوبصورت عمارت ہے۔

لودھی :-

محمد شاہ سید کے عہد میں ہی سرہند کا ایک افغانی گورنر پنجاب تک قابض ہو گیا تھا۔ جس کا نام بہلول لودھی تھا۔ یہ جب دہلی پہونچا تو سید حکومت ڈانواڈول تھی۔ اور ۱۴۵۱ء میں بہلول لودھی ایک نئی حکومت کے ساتھ دہلی کا بادشاہ بن بیٹھا۔ بہلول لودھی ۱۴۸۹ء تک بادشاہ رہا مگر اس کا زیادہ تر وقت بغاوت کو سر کرنے اور حالاتِ حکومت سنوارنے میں لگا رہا۔ اس عہد میں ٹائل کا کام عمارتوں پر نمایاں طور پر نظر آتا ہے جس میں بڑا گمبد اور خود بہلول کا مقبرہ بھی قابل ذکر ہے۔

لودھی دور کا سب سے اہم بادشاہ سکندر لودھی ہے۔ جس کی حکومت ۱۴۸۹ء تا ۱۵۱۷ء رہی۔ اس طویل عرصہ میں آرٹ، فن تعمیر اور انتظامی امور کو کافی فروغ ملا۔ اور حکومت کا کام بہتر طریقہ سے چلتا رہا۔ دہلی میں 'مسجد موٹھ' اس دور کی یادگار ہے۔ لودھی دور کا آخری حکمران ابراہیم لودھی تھا جو ۱۵۱۷ء سے ۱۵۲۶ء تک تخت نشین رہا۔ لیکن اپنی حکومت کے آخری زمانے میں ابراہیم لودھی ہر ایک پر سختی، اور شک کرنے لگا۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے مصاحبین اور صوبائی گورنر کو قید کرنا اور قتل کرنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت میں بغاوت پھیلنے لگی۔ اور کابل کا مغل بادشاہ بابر دو حملہ ہندوستان پر کر چکا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ اس بار لاہور کے گورنر دولت خاں لودھی کی دعوت پر بابر کو دہلی کے سلطان ابراہیم لودھی پر حملہ بولنے کی خبر پہونچی۔ بابر ۱۵۲۲ء میں ہندوستان میں داخل ہوا مگر کچھ نامساعد حالات کی وجہ سے اسے واپس جانا پڑا۔ لیکن دوبارہ بابر نے ۱۵۲۶ء میں زبردست حملہ کیا اور ابراہیم کی فوج سے پانی پت کے میدان میں گھماسان جنگ ہوئی۔ ابراہیم لودھی مارا گیا اور اس طرح مغل بادشاہ ظہیر الدین محمد بابر نے ہندوستان کی دارالسلطنت دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا۔

سید اور لودھی عہد میں تمام ثقافتی اور تعمیری کام ٹھپ پڑ چکا تھا۔ صرف کچھ مقبرے اور مسجدیں تعمیر ہوئیں جو اس عہد کی آج بھی یادگار ہیں۔ لیکن مغل حکمرانوں کی آمد کے بعد سے ہندوستان میں ایک نئے اور شاندار دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جس نے تھوڑی ہی مدت میں اس ملک کو ثقافتی، تہذیبی، تعمیراتی اور سیاسی اعتبار سے پوری دنیا میں اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔ مغل دور کی ابتدا کے ساتھ ہی وہ سلطنت جو ۱۱۹۲ء میں شہاب الدین محمد غوری اور قطب الدین ایبک کی کاوشوں سے ہندوستان میں قائم ہوئی تھی ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کی شکست کے بعد تقریباً ساڑھے تین سو سال کا سفر طے کر کے ختم ہو گئی۔

دکن میں بہمنی حکومت:۔

اس وقت جبکہ دہلی کے تخت پر محمد بن تغلق قیام پذیر تھا تو دکن میں کئی بغاوتیں سر اٹھا رہی تھیں۔ ایسے ہی حالات میں ۱۳۴۷ء میں کچھ امراء نے حسن گنگو نامی ایک امیر کو دولت آباد (دیوگری) کے تخت پر بٹھا دیا۔ چونکہ یہ ایران کے بہمن بادشاہ کے خاندان سے تھا۔ اس لئے اس کی حکومت کو بہمنی دور کہا گیا ہے۔ اس حکومت میں کئی بہمنی بادشاہوں نے جنوبی ہندوستان میں تقریباً ۱۸۰ برس تک حکمرانی کی اور ۱۳۴۷ء سے ۱۵۲۶ء تک یہ حکومت قائم رہی اور اٹھارہ بادشاہوں نے حکومت کی۔ جن کی راجدھانی گلبرگہ رہی۔ ان کی آرٹ اور کلچر کے میدان میں نمایاں دلچسپی تھی جس کے نتیجے میں گلبرگہ، دولت آباد اور بیدر میں کئی مسجدیں، قلعہ، اور مینار تعمیر کئے گئے۔ بعد میں یہ منتشر ہوگئی۔ اور قطب شاہی حکومت گولکنڈہ میں بیدر اور برار کے ساتھ ساتھ احمد نگر کے علاقوں میں پانچ چھوٹی چھوٹی حکومتوں نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔

وجے نگر حکومت:۔

عین اس وقت جبکہ "بہمنی" حکومت دولت آباد میں قائم ہوئی۔ لگ بھگ اسی زمانے میں اس کے جنوب میں ۱۳۳۶ء میں "وجے نگر" کی حکومت قائم ہوئی۔ جس میں سولہ ۱۶ راجاؤں نے لگ بھگ دوسو تیس سال تک حکومت قائم رکھی۔ جس کا زمانہ ۱۳۳۶ء سے ۱۵۶۵ء تک رہا ہے۔ جس کے روحِ رواں دو بھائی ہری ہر اور بکّا تھے۔ اس عہد میں کرشنا دیو کو آرٹ اور فنونِ لطیفہ کے فروغ میں خصوصی طور پر جانا جاتا ہے۔ جس نے کئی اہم مندر اور عمارتیں تعمیر کروائیں۔ فنونِ لطیفہ اور زبان و ادب کے کئی نادر نسخہ تیار ہوتے۔ اور بیرونی ممالک سے تجارت کو بھی کافی فروغ دیا گیا۔ سولہویں صدی کے وسط میں وجے نگر کے حاکم اور دکن کے سلطان کے درمیان زبردست جنگ ہوئی جس میں وجے نگر حکومت ختم ہوگئی اور دکن کے سلطان آخرکار مغل بادشاہ کے زیرِ سایہ آگئے ___ اسی طرح

دہلی کے سلطان اور دکن کے بادشاہوں اور راجاؤں نے مغل حکمرانوں کی آمد سے پہلے نہ صرف سیاسی زندگی کے اثرات چھوڑے ہیں، بلکہ اس دور میں مشترکہ طور پر سماجی اور ادبی فروغ بھی ہوا ہے۔

سلطنتِ دَور میں آرٹ اور ادب کا فروغ:۔

بارہویں صدی میں ہندوستان کے پایۂ تخت دہلی میں سلطنت دور کے آغاز کے ساتھ ہندوستانیوں نے ایران، عربی، ترکی، افغانی نیز وسط ایشیا کے تہذیبی اور معاشرتی اثرات کو بھی قبول کیا، جس کا اثر یہ ہوا کہ روزمرہ کی زندگی کے علاوہ آرٹ، ادب اور زبان پر بھی دونوں تہذیبوں کے اثرات نمایاں ہونے لگے۔ سلطانِ دہلی نے ہر ہندوستانی کو اس کی زبان، مذہب اور رسم ورواج کی ادائیگی کا پورا اختیار دیا۔ جس کے نتیجے میں اگرچہ درباری زبان تو فارسی تھی مگر علاقائی زبانیں بھی اپنی شناخت کے ساتھ سمجھی اور بولی جاتی تھیں۔ اودھی اور برج بھاشاؤں کا میل فارسی کے ساتھ ہونے لگا اور کچھ ہی عرصہ میں ایک ملی جلی زبان عوام اور سپاہیوں میں بولی جانے لگی جس کو "اردو" کا نام دیا گیا۔ ترکی زبان میں اردو کے معنیٰ لشکر یا خیمہ کے ہیں ـــــ یہ زبان بول چال کے اعتبار سے تو ہندی سے قریب تھی اور رسم الخط کے نقطۂ نظر سے فارسی کا اثر قبول کیا۔ اس طرح ہندوستان کی سرزمین پر تیرھویں صدی کے اوائل ہی میں اردو زبان بولی جانے لگی تھی۔ جس کا ایک اہم نام "امیر خسرو" ہے۔ جو اسی زمانے میں سامنے آیا۔

اسی طرح ہندوستان اور اسلامی مذاہب کے میل ملاپ سے بھگتی اور صوفی تحریک بھی وجود میں آئی۔ ایک طرف تصوف مسلمانوں میں مقبول ہونے لگا تو ساتھ ہی بھگتی ہندوؤں میں پسند کی جانے لگی۔ دونوں کے مقاصد کم و بیش ایک تھے۔ دونوں کا مقصد مساوات اور خدا کی یاد تھی۔ تصوف میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء، حضرت معین الدین چشتیؒ، حضرت چراغ دہلی اور حضرت سلیم چشتیؒ ایک مثالی کردار کے طور پر سامنے

آئے تو بھگتی کے پرچار میں راما نند، کبیر، گرو نانک، میرا بائی وغیرہ نے آواز بلند کی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان بھر میں اس کا پیغام پھیلنے لگا۔ چونکہ ان تحریکوں کی زبان، عوامی تھی۔ اس لئے علاقائی زبانیں تشکیل ہونے لگیں۔ گجراتی، پنجابی، بنگالی، مراٹھی، کنڑ، تیلگو اور دیگر زبانیں انہیں تحریکات کی دین تھیں۔ ہندوستانیوں میں مشترکہ طور پر بھائی چارہ، مساوات اور مذہبی رواداری کا تصور جگہ پاتے لگا اور ہندو مسلم دونوں فرقہ میں اس کی مقبولیت ہونے لگی۔ سلطنتِ عہد کی ہندوستان کو یہ بہت بڑی دین تھی جس کی وجہ سے اس ملک میں جو کثیرالمذہب تھے اشتراکیت کے تصور کے سہارے یہاں ہزاروں سال سے مختلف قومیں اور مختلف مذاہب پھلتے پھولتے رہے۔

مغل حکومت کا قیام:۔

مغلوں کی نسل کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ منگولیہ کے علاقہ سے منگول کہلاتے ہیں۔ جو ترکستان اور ملکِ چین کے درمیان وسط ایشیا میں واقع ہے۔ ان لوگوں نے ۱۵۲۶ء میں بابر کی کامیابی کے ساتھ ہندوستان میں باقاعدہ مغلوں کی حکومت کا دور شروع ہوتا ہے۔ جس میں بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب جیسے جلیل القدر شہنشاہ ہندوستان کی پوری سرزمین پر بڑی شان سے حکومت کرتے رہے۔ ان لوگوں نے نہ صرف یہاں کی تہذیب اور ادب کو مالامال کیا۔ بلکہ، زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا اور اس ملک کے طول و عرض پر اپنی پہچان کے ایسے نقش ثبت کئے جن کے کھلے ہوتے اثرات آج بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کی وجہ سے نہ صرف عرب، ایران اور پورے وسط ایشیا کے تہذیبی اور ثقافتی اثرات سامنے آئے بلکہ ہندوستان میں ہندو مسلم بھائی چارہ اور فنونِ لطیفہ میں بھی مشترکہ طور پر فروغ ہوا۔ انہوں نے اپنی انتظامی صلاحیتوں کی وجہ سے ملک کو اس قدر مضبوط کر دیا کہ تمام دنیا میں ہندوستان کا نام عہدِ زریں کے طور پر جانا جانے لگا۔

بابر:-

بابر کی حکومت دہلی، آگرہ اور آس پاس کے علاقہ میں سنہ ۱۵۲۶ء سے سنہ ۱۵۳۰ء تک رہی۔ اس عرصہ میں انتظامی اُمور کو ٹھیک کرتے ہی میں بابر کا سارا وقت ختم ہو گیا۔ اور فنونِ لطیفہ نیز فنِ تعمیر کا کوئی نمایاں اور انفرادی نقشہ سامنے نہ آسکا۔ البتہ اس نے آگرہ میں مغل انداز کے ایک باغ کی بنیاد ڈالی۔ کچھ علاقوں میں اس کے گورنروں اور حاکموں نے مسجدیں اور باؤلی بنوائیں۔ اور ایک ایسا شاہکار قلمی نسخہ تحریر کر گیا جس کو آج بھی "تزکِ بابری" یا "بابرنامہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بابر نے قلیل مدت میں کئی جنگیں لڑیں۔ سنہ ۱۵۲۶ء میں ابراہیم لودھی کو شکست دینے کے بعد اسے پھر سنہ ۱۵۲۷ء میں میواڑ کے راجہ مہارانا سنگرام سنگھ سے جنگ کرنی پڑی۔ اس کے بعد سنہ ۱۵۲۹ء میں افغان سرداروں کو اس نے گھاگرہ کی جنگ میں شکست دی۔ اس طرح پانی پت، کھانوا اور گھاگرہ کی جنگوں کے بعد ابھی وہ صرف اڑتالیس سال ہی کا تھا کہ اس کا بیٹا ہمایوں بیمار پڑ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے خدا سے دعا کی کہ بیٹے کی تمام بلائیں اس کے سر آجائیں اور ہمایوں صحت یاب ہو جائے، اس کی دعا قبول ہو گئی۔ اور بابر کا انتقال سنہ ۱۵۳۰ء میں ہو گیا۔ اس کی قبر شروع میں تو آگرہ میں بنی مگر کچھ عرصہ بعد کابل میں منتقل کر دی گئی۔

ہمایوں:-

اپنے والد اور مغل حکومت کے بانی ظہیر الدّین محمد بابر بن عمر شیخ مرزا کی وفات کے بعد سنہ ۱۵۳۰ء میں نصیر الدّین محمد ہمایوں بادشاہ بنا۔ اپنی نرم طبیعت اور والد کی نصیحت کے مطابق اس نے اپنے بھائیوں کو مختلف علاقوں کا گورنر مقرر کر دیا۔ اپنے بھائی کامران کو افغانستان کا حاکم بنایا۔ عسکری اور ہندال کو بھی دوسری جگہیں عنایت کیں۔ مگر جلد ہی پہلے تو اس کے بھائی کامران نے اپنی خود مختاری کا اعلان

پنجاب میں کر دیا اور بعد میں دوسرے بھائیوں نے بھی ہمایوں کو نقصان پہونچایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغل حکومت کی تمام اچھی فوج اور بہادر سپاہی بکھر گئے اور اس کی حکومت کمزور پڑنے لگی۔ پھر بھی ابتدائی دو برسوں میں ہمایوں نے بندیل کھنڈ، جونپور اور بہار میں باغیوں کی سرکوبی کی کوشش کی اور کامیاب ہوا۔ پھر گجرات کے حکمران، بہادر شاہ کی طرف رُخ کیا۔ وہاں بھی اسے فتح حاصل ہوئی مگر ہمایوں گجرات میں ٹھہر کر عیش و عشرت اور تفریح میں مصروف ہو گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوبارہ پھر گجرات پر بہادر شاہ نے قبضہ کر لیا اور ہمایوں کو شکست ہوئی۔

ہمایوں نے پھر مالوہ پر چڑھائی کی اور فتح حاصل کرنے کے بعد کامیابی کی خوشی منا ہی رہا تھا کہ اسے بہار میں بغاوت کی خبر ملی جو وہاں کے حاکم اور ایک افغانی نسل کے سربراہ شیر شاہ سوری نے کر دی تھی۔ ہمایوں سیدھا بہار کی جانب چل پڑا، تاکہ وہ شیر شاہ کی سرکوبی کر سکے۔ مگر ہمایوں کو یہ فتح راس نہ آئی۔ وہاں کے خراب موسم اور لگاتار بارش کی وجہ سے مغل بادشاہ کی فوج اور توپیں کام نہ کر سکیں، اور شکست ہو گئی۔ ۱۵۳۹ء میں چوسا کی جنگ میں شیر شاہ سوری کو کامیابی ملی اور ہمایوں جان بچا کر گنگا ندی میں تیر کر بھاگ رہا تھا کہ دشمنوں نے اس کو مار ڈالنے کے لئے پیچھا کیا۔ مگر نظام نامی ایک بہشتی نے اپنی مشک کے سہارے ہمایوں کی جان بچالی۔ دوبارہ پھر اس مغل بادشاہ نے شیر شاہ سوری سے ۱۵۴۰ء میں قنوج میں جنگ کی لیکن اس بار بھی فتح شیر شاہ سوری کی ہوئی اور اس نے ہمایوں کو ہرا کر ہندوستان کے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ ہمایوں نے لاہور جا کر اپنے بھائی کامران سے مدد مانگی مگر وہ ناکام رہا۔ اس اثنا میں جب ہمایوں نے اپنے مٹھی بھر جان نثاروں کے ساتھ راجپتانہ کے میدانوں میں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہا تھا تو اس کی شادی حمیدہ بیگم بانو سے ہوئی جس کے بطن سے ۱۵۴۲ء میں امرکوٹ کے مقام پر اس کا بیٹا اکبر پیدا ہوا۔ ہمایوں کی متواتر ناکامیوں کو دیکھ کر اس کے ایک مشیر بیرم خاں نے اس کو مشورہ دیا کہ ایران چلا جائے اور وہاں کے اس وقت کے

بادشاہ "شاہ تہمپ" سے مدد حاصل کرے۔

ہمایوں کی یہ ترکیب کامیاب ہوئی۔ اور وہ ۱۵۴۵ء میں دوبارہ ایران کے شاہ کی مدد سے ہندوستان میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے بھائی کامران کو شکست دی اور عسکری کو بھی ہرا کر قندھار اور کابل پر قبضہ کرلیا۔ اسی دوران شیر شاہ سوری کا انتقال ہوگیا اور ہندوستان کے بادشاہ کا مسئلہ درپیش آیا۔ دھیرے دھیرے ۱۵۵۵ء میں ہمایوں نے دہلی اور آگرہ پر پھر قبضہ کرلیا اور پندرہ سال کے وقفے کے بعد دوبارہ یہ مغل بادشاہ ہندوستان کے تخت پر فائز ہوا۔ مگر اس بار قسمت نے ہمایوں کے ساتھ دھوکہ کیا اور ابھی سات مہینے ہی یہ حکومت کرپایا تھا کہ ایک شام یہ اپنے قلعہ دین پناہ (موجودہ پرانہ قلعہ دہلی) میں بالائی منزل پر کتاب کا مطالعہ کررہا تھا۔ اس نے مغرب کی اذان کی آواز سنی تو اُٹھ کر چلنے لگا۔ اچانک اس کا پیر پھسلا اور سیڑھیوں سے نیچے گر پڑا۔ اس حادثہ سے اس قدر چوٹ آئی کہ دوبارہ ہمایوں جاں بر نہ ہوسکا اور ۱۵۵۵ء ہی میں مغل حکومت کا دوسرا شہنشاہ بھی چل بسا۔

شیر شاہ سوری:۔

یہ بہار کے ایک جاگیر دار کا بیٹا تھا۔ افغانی نسل کا ہونے کی وجہ سے بہادری، اور شجاعت اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کا اصلی نام فرید تھا۔ ۱۵۲۲ء میں ایک لودھی حکمران نے اس کو "شیر شاہ" کا لقب اس وجہ سے دیا تھا کہ بہار میں ایک شیر کو اس نے تنِ تنہا مار ڈالا تھا۔ ہمایوں کو شکست دینے کے بعد ۱۵۴۰ء میں شیر شاہ سوری ہندوستان کے بادشاہ کی حیثیت سے سامنے آیا اور صرف پانچ سال کے عرصہ میں اس نے ملک میں کئی نمایاں اور قابلِ تعریف کام کئے۔ اس نے حکومت میں کئی شعبہ کھولے اور ہر شعبہ کا ایک انچارج 'منتری یا وزیر کو بنایا۔ تاکہ حکومت کا کام آسانی سے چل سکے۔ پھر اس نے پوری حکومت کو ۴۷ حصوں میں بانٹ دیا اور اس کو "سرکار" کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس طرح وہ اپنے معتبر وزیروں کے ذریعہ ہر سرکار کی پوری خبر

رکھتا تھا۔ اس نے ٹیکس کی ادائیگی کا بھی بہت اچھا انتظام کیا تھا۔ زمین کی صحیح پیمائش اور لگان کی مناسب درآمدات کا بھی پورا حساب رکھا۔ اس کے زمانے میں جاسوسی کا بھی نہایت کارآمد محکمہ قائم تھا۔ جس سے اس کو ملک بھر کی خبر فوراً مل جایا کرتی تھی۔ شیر شاہ سوری کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے ملک کی سڑکوں اور سایہ دار درختوں کو لگانے میں خصوصی توجہ دی۔ کلکتہ کے مرشد آباد سے لے کر پشاور تک ہزاروں میل لمبی سڑک "گرانٹ ٹرنک روڈ" بھی اسی کی بنوائی ہوئی ہے۔ اس نے عمارتیں، تالاب، مسجدیں اور مقبرے بھی بنوائے جن میں خود اس کا مقبرہ بہار کے سہسرام میں آج بھی فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہے۔ شیر شاہ سوری کا انتقال ۱۵۴۵ء میں بندیل کھنڈ کے کالنجر قلعہ کا محاصرہ کرتے وقت ایک حادثہ میں ہوگیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اسلام شاہ سوری تخت پر بیٹھا مگر وہ ناکارہ نکلا اور آخرکار دوبارہ ملک کی باگ ڈور ہمایوں بادشاہ کے ہاتھ میں آ گئی اور سور حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

اکبر:

جلال الدین محمد اکبر ابھی صرف تیرہ برس کا تھا کہ ۱۵۵۵ء میں اس کے والد ہمایوں کے انتقال کی خبر پنجاب میں پہونچی۔ اس وقت اکبر اپنے محافظ بیرم خاں کی نگرانی میں پنجاب کی بغاوت کو سر کرنے میں مصروف تھا۔ بیرم خاں نے ایک معمولی سی تقریب میں گرداس پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں "کلانور" میں اکبر کی تاج پوشی کی اور مغل حکومت کے تیسرے شہنشاہ کی صورت میں یہ تخت نشین ہوا۔ اکبر کی زندگی کی سب سے پہلی کامیابی جنگ پانی پت کے میدان میں ۱۵۵۶ء میں ہیمو کے ساتھ ہوئی۔ زبردست معرکہ کے بعد آخرکار فتح اکبر کو حاصل ہوئی اور اس طرح یہ عظیم شہنشاہ ہندوستان کے تخت شاہی کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔ اٹھارہ سال کی عمر پوری کر لینے کے بعد اکبر نے بیرم خاں کی سرپرستی سے الگ خود اپنی ذہانت اور سمجھداری سے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی اور لگاتار اپنی حکومت کی سرحدیں بڑھاتا گیا۔ اس نے مالوہ کابل، کشمیر آمیر،

میواڑ، رنتھمبور، اور کالنجر، بیکانیر، جیسلمیر، گجرات، بلوچستان، قندھار، سندھ، بنگال، بہار، اور اڑیسہ پر اپنی نصرت کے جھنڈے گاڑ دیئے اور محض اپنی سمجھ سے ہمالیہ پہاڑ سے گوداوری ندی اور ہندوکش پہاڑ سے برہم پتر دریا تک مغلیہ حکومت کی سرحدیں جمالیں۔

اکبر کے تقریباً پچاس سالہ عہد میں نہ صرف ملک کو سیاسی اعتبار سے تقویت حاصل ہوئی بلکہ اس نے راجپوت حکمرانوں کے ساتھ دوستی کرکے ان کو بھی قریب کرلیا۔ اُن کی عورتوں سے شادی کرکے ان کو اپنا رشتہ دار بنایا۔ حکومت میں اونچے اور اہم عہدوں پر ہندوؤں کو تعینات کیا اور ملک میں ایک ایسی مشترکہ پالیسی کو فروغ دیا جس سے آپسی نفرت اور مذہبی کٹرپن دور ہوگیا۔ اس نے دینِ الٰہی کی بنیاد ڈالی جس سے غیر مسلم طبقہ میں مساوات کا تصور اُجاگر ہوا۔ اس نے اپنے دربار میں ہر مذہب کے ذہین لوگوں کو جگہ دی اور انہیں "نورتن" کا خطاب دیا۔ اکبر کے عہد کی تعمیرات میں بھی ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی نمائندگی کی۔ پرانی سنسکرت اور مذہبی ہندو کتابوں کا فارسی اور عربی میں ترجمہ کردیا۔ رامائن، گیتا، مہابھارت اور وید کو فارسی میں منتقل کروایا۔ پرانوں اور ہندو دیو مالاؤں کو عربی اور فارسی کے ذریعہ مسلمانوں میں عام کیا۔ اسی طرح اسلامی کتابوں اور دوسرے اہم فارسی و عربی قلمی نسخوں کو ہندی اور سنسکرت میں ترجمہ کروایا۔ فنونِ لطیفہ میں فنِ خوشنویسی اور فنِ مصوری میں ہندو مسلم فنکاروں کو ماہر بنوایا۔ تاریخ اور ادب پر ایسی ایسی کتابیں لکھوائیں جن کے ذریعہ سے آئندہ آنے والے زمانے میں مغل دور کی شاندار تصویر سامنے آسکے۔ بلاشبہ اکبر ایک ایسا عالی مرتبت بادشاہ تھا جس نے پورے ہندوستان کو تمام دنیا کی تاریخ میں نمایاں مقام عطا کیا۔ اکبر کی حکومت کا خاتمہ سنہ ۱۶۰۵ء میں اس کے انتقال کے بعد ہوگیا اور تب اس کا بیٹا جہانگیر تخت نشین ہوا۔

جہانگیر:۔

اکبر اور جودھا بائی کا بیٹا سلیم جو بہت منتوں اور مرادوں کے بعد حضرت شیخ سلیم چشتی کی دعاؤں کے بعد پیدا ہوا تھا۔ اب سنہ ۱۶۰۵ء میں مغل حکومت کا چوتھا شہنشاہ

بن کر تخت نشین ہوتا ہے۔ اس کی پہلی بیوی کا نام مان بائی تھا جو امبیر کے راجہ کی بیٹی تھی۔ جس سے ایک لڑکا ہوا۔ اس کا نام خسرو تھا۔ ۱۶۱۱ء میں بادشاہ بننے کے بعد نورالدین محمد جہانگیر کا نکاح ایک بیوہ "نور جہاں" سے ہوتا ہے۔ یہ بہار کے حکمراں شیر افگن کی بیوی تھی۔ نور جہاں کے بیوی بننے کے بعد جہانگیر کی پوری زندگی میں زبردست تبدیلی ہوتی ہے جس سے نہ صرف سیاسی معاملات میں فروغ ہوا بلکہ پورے ہندوستانی نظام میں نمایاں فرق کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ نورالدین محمد جہانگیر کی مختلف پالیسیوں اور فیصلوں میں اس کی ملکہ کا دخل تھا۔ حسنِ اتفاق سے جہانگیر کو اپنے باپ کی بنائی ہوئی ایک ایسی مستحکم اور شاندار حکومت ملی جس کی وجہ سے اس کا بیشتر وقت عیش اور آرام سے گزرا۔ جہانگیر کے زمانے کا انصاف بہت مشہور ہے۔ رعایا عام طور پر مطمئن اور خوش تھی۔ اس کے زمانے میں بعض غیر ملکی سیاح مغربی ممالک سے بھی آئے، جن کی وجہ سے ہندوستانی فنونِ لطیفہ، آرٹ اور فنِ تعمیر میں بھی مغربی اثرات نظر آتے ہیں۔ فنِ مصوری کو اس کے عہد میں خاص طور پہ فروغ ہوا۔ کچھ اہم اور قابلِ ذکر سکے بھی جہانگیر کے عہد میں رائج ہوئے۔ "تزکِ جہانگیری" اس کا شاندار علمی کارنامہ ہے۔ ۱۶۲۷ء میں کشمیر سے واپسی کے وقت اس کا انتقال ہوگیا۔ آج بھی جہانگیر کا مقبرہ لاہور کے قریب شاہدرہ میں فنِ تعمیر کا نمایاں منظر پیش کرتا ہے۔

شاہجہاں :-

جہانگیر کی وفات کے بعد اس کا بیٹا شاہجہاں شہاب الدین خرم ۱۶۲۷ء میں پانچویں مغل شہنشاہ کے طور پر تخت نشین ہوا۔ اس کا زمانہ بھی شاندار اور پُرسکون رہا۔ صرف عمر کے آخری دنوں میں اس کا بیٹا اورنگ زیب باغی ہوگیا اور آخرکار اپنے باپ شاہ جہاں کو قید کرکے ۱۶۵۶ء میں بادشاہ بن بیٹھا۔ شاہ جہاں کا عہد فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے تمام مغل بادشاہوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس نے سنگِ سرخ سنگِ مرمر اور قیمتی پتھروں کے استعمال سے پورے ہندوستان میں عمارتیں تعمیر کروائیں۔

جن میں آگرہ اور دہلی میں اس کی بہت ساری عمارتوں کے جوہر دیکھے جا سکتے ہیں۔
"تاج محل" شاہ جہاں کے عہد کی ایک ایسی تعمیر ہے جس کو پوری دنیا میں عجائبات کا مرتبہ حاصل ہے۔ دہلی میں شاہ جہاں آباد کا ایک شہر آباد کیا۔ لال قلعہ اور جامع مسجد بنوایا۔ فنِ مصوری اور فنِ خطاطی کو فروغ دیا۔ اور پورے ملک میں عام طور پر امن اور شانتی کا ماحول رکھا۔ لیکن یہ اپنے لڑکوں کو متحد نہ رکھ سکا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ جہاں کے آخری دَور میں بھائیوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اورنگزیب، دارا شکوہ اور مراد میں ہندوستان کا بادشاہ بننے کے لئے اختلافات ہونے لگے۔ اور آخرکار جیت اورنگ زیب کی ہوئی۔ شاہ جہاں بادشاہ آگرہ کے قلعہ میں قید تھا، اور اس کا بیٹا ہندوستان کی بادشاہت کا اعلان کر رہا تھا۔ انھیں حالات میں شاہ جہاں کا انتقال آٹھ برس بعد ۱۶۶۶ء میں ہو گیا۔

اورنگ زیب :-

محی الدین اورنگ زیب عالمگیر نے چھٹے شہنشاہ کے طور پر ۱۶۵۸ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اورنگ زیب میں بہت ساری خوبیاں تھیں۔ مگر وہ اپنے باپ دادا کی بنائی ہوئی حکومت کو قائم نہ رکھ سکا۔ خود اس کے بھائیوں سے اس کی خانہ جنگی، اس کے مزاج میں سختی اور مذہبی کٹرپن کی وجہ سے، ہندوستان کی ہندو مسلم رعایا میں اتفاق نہ رہ سکا۔ بغاوت اور خانہ جنگی کا ماحول ہر طرف پھیلنے لگا۔ اکبر اور جہانگیر نے ہندوستان میں ایک ایسی مشترکہ تہذیب کی جڑیں مضبوط کی تھیں، جس سے تمام مذاہب کے لوگ خوش تھے۔ اورنگ زیب نے قرآن اور شریعت کے پیشِ نظر حکومت چلانی چاہی۔ اور ان تمام روایات کو ختم کرنا چاہا جو پہلے سے رائج تھیں۔ فنِ موسیقی اور فنِ مصوری سے اس کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہندو رعایا کے لئے اس کے دل میں وہ احترام نہ تھا جو اس کے باپ دادا کی نظر میں تھا۔ شراب، رقص اور موسیقی کو اس نے اپنی حکومت میں بالکل بند کر دیا تھا اور جزیہ ٹیکس کو دوبارہ لاگو کروا دیا۔ اِدھر جاٹ، سکھ

اور راجپوتوں نے بغاوت برپا کردی۔ شیواجی جیسے بہادر سپہ سالار اس کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہو گئے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے اورنگ زیب کا زیادہ تر وقت بغاوتوں کو کچلنے میں لگ گیا۔ اس کے باوجود وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ اورنگ زیب اگرچہ خود ایک سچا، ایماندار اور نیک انسان تھا۔ مگر ہندوستان جیسے کثیر المذہب ملک میں ایک ایسے بادشاہ کی ضرورت تھی جو تمام مذاہب کا احترام کرے اور ان کی روایات و رسم و رواج میں حصہ لے سکے۔ مگر ایسا نہ ہوسکا اور دھیرے دھیرے مغل حکومت کمزور پڑتی گئی۔ تقریباً پچاس سال حکومت کرنے کے بعد اورنگ زیب کا انتقال جب ۱۷۰۷ء میں ہوا تو اس وقت تک مغل حکومت کمزور پڑ چکی تھی اور اس کے بعد کوئی بھی مغل بادشاہ ایسا نہ آسکا جو اس کو لمبے عرصے کے لئے برقرار رکھ سکتا۔ اس کے باوجود مغل حکومت کا ہندوستان پر یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے مجموعی طور پر اس ملک کو اردو جیسی زبان عطا کی۔ مغلائی کھانے اور شاندار ملبوسات سے نوازا۔ مؤرخ، ناول نگار، داستان گو اور فنکار دیئے۔

فنِ مصوری، فنِ خطاطی اور فنِ تعمیر کے لاجواب اور شاندار نمونے پیش کئے۔ مقبرے، مسجدیں، قلعہ اور عمارتیں دیں اور پوری سرزمین پر ایک ایسی تہذیب عطا کی جس میں ایران، عرب، ترکی، مغربی ممالک یہاں تک چین اور جاپان کی روایات پوشیدہ ہیں۔ مغل حکومت دورِ وسطیٰ کی ایک ایسی یادگار ہے جس کو تاریخ کے صفحات میں سنہری حروف سے یاد کیا جاتا رہے گا۔ اورنگ زیب کے عہد کے خاتمہ کے ساتھ ہی نہ صرف مغلیہ دور کا شاندار شہنشاہی دور ختم ہو جاتا ہے بلکہ اٹھارویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی دورِ جدید شروع ہو جاتا ہے۔ اس زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور فرانسیسی تاجروں کا ہندوستان میں زور ہو جاتا ہے۔ مغل بادشاہوں میں اب اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ ہندوستان کی شان کو برقرار رکھ سکتے۔ اس طرح آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہی ۱۸۵۷ء میں مغل دور کا اختتام ہو جاتا ہے اور انگریز سامراج ملک پر قابض ہو جاتے ہیں۔ اسطرح دورِ وسطیٰ کے خاتمہ کے ساتھ ہی جدید دور کا آغاز ہوتا ہے۔

دکن میں حکومتوں کا عروج و زوال

عہدِ قدیم سے ہی ایک طرف تو شمالی ہندوستان میں حکومتیں قائم ہوتی رہیں، اور ساتھ ہی جنوب یا دکن کے علاقے میں بھی لوگ سیاسی اور معاشرتی انداز میں حکومتیں کرتے رہے۔ جن میں پلوّا، چالکیا، یادو، ہوشالہ اور چولا حکومتیں اپنے اپنے دور کی حکومتیں رہیں۔ ان میں جس حکومت کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی۔ وہ چولا حکومت ہے۔ جس نے عہدِ قدیم سے ہی دکّن کی تاریخ میں اپنی پہچان بنا رکھی تھی۔

چولا حکومت :۔

یہ حکومت قدیم ہندوستان کے زمانے سے ہی دکن میں قائم تھی۔ ایک روایت کے مطابق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چولا نے مہابھارت کی جنگ میں بھی حصّہ لیا تھا ——— چندر گپت موریہ CHANDRA GUPTA MAURYA کے دربار میں آنے والے ایک یونانی سفیر میگیتھینز نے بھی اپنے سفرنامے میں چولا حکومت کا ذکر کیا ہے۔ یہ حکومت جنوبی ہندوستان میں تامل ناڈو، کرناٹک اور کیرالہ کے علاقوں پر قابض تھی۔ یہ چولا حکومت عہدِ قدیم کے ابتدائی زمانے سے لے کر تیسری صدی عیسوی تک قائم رہی۔ اس کے بعد پلوّا حکمرانوں کے ذریعہ یہ مغلوب ہو کر لگ بھگ ختم ہو گئی تھی۔ پھر دوبارہ

۸۵۰ء میں وجے راجہ کی سرکردگی میں چولا حکومت کا دوبارہ قیام ہوا۔ اس طرح ادیبہ اور پرانتیکا کے زیر اثر جنوب میں چولا حکومت کا دور دورہ ختم ہوگیا اور تمام حکومتیں ختم ہو گئیں۔ صرف چولا حکمرانوں کا ہی نام باقی رہ گیا۔

۹۸۵ء میں راجہ راجہ اوّل کے تخت نشین ہوتے ہی دکن میں صحیح معنوں میں چولا حکومت کا شاندار اور زرّیں دور شروع ہوتا ہے۔ یہ ایک بہادر سپاہی، لائق حکمران اور ذہین راجہ تھا۔ جس نے نہ صرف دکن میں بلکہ شمالی ہند میں بھی چولا حکومت کی سرحدوں کو وسیع کیا۔ اب اس کے تحت، تامل ناڈو، کرناٹک، سری لنکا اور جنوب مشرق کے بہت سارے جزیرے بھی آ گئے۔ اس کے عہد میں ایک زبردست بحری فوج بھی تیار کی گئی۔ تنجور کا راجہ رجیشورا مندر اسی کے عہد کی زندہ مثال ہے۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اور جانشین راجندر چولا تخت پر بیٹھا، جس نے اپنے باپ سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی اور حکومت میں اڑیسہ اور بنگال کے صوبوں کو بھی شامل کرلیا۔ اس نے ۱۰۱۴ء سے ۱۰۴۴ء تک پورے ہندوستان پر حکومت کی۔ پھر اس کا بیٹا راجہ دھیراج بھی کامیابی کے ساتھ حکومت کرتا رہا۔ اور ۱۰۵۲ء تک چولا حکومت کا سنہری دور کہلایا لیکن بعد میں چولا حکمرانوں میں اپنے بزرگوں کی بنائی ہوئی حکومت قائم رکھنے کی سکت باقی نہ رہی اور دھیرے دھیرے تیرھویں صدی تک چولا حکومت کمزور پڑ گئی اور آخرکار ختم ہو گئی ــــ اس دور میں سرکاری انتظامات بہت اچھے تھے۔ راجہ کو ملک کا سب سے بڑا سرپرست سمجھا جاتا تھا اور راجہ بھی اپنے عوام مصاحبین اور مذہبی پروہت کے مشوروں سے حکومت چلاتا تھا۔ راجہ کا حکم تھا کہ سرکاری افسروں کی غلط حرکتوں سے عوام کو کسی طرح کا نقصان بھی نہ پہونچنا چاہیئے۔ اس عہد میں رعایا مطمئن تھی اور راجہ کا احترام کرتی تھی۔ سیاسی طور پر چولا حکومت کو کئی صوبوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ جس کو منڈلم کہا جاتا تھا اور ہر صوبے کو کئی حلقوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ پھر ہر حلقہ کو مختلف گاؤں میں منقسم کردیا گیا تھا اور ہر حصّہ کو لائق اور ایماندار افسروں کی نگرانی میں رکھا جاتا تاکہ ملک کا نظام قاعدے اور آسانی سے چل سکے۔

مختلف علاقوں کی عوام کو بھی حکومت کے کاموں میں شریک کیا جاتا۔ جس کو پنچایت کہا جاتا تھا۔ یہ پنچایت اپنے علاقے کے کاموں کی دیکھ بھال کرتی۔ راستوں کو بنوانے کا کام، کھیتی باڑی کا کام، لوگوں کی عارضی پریشانیوں کو دُور کرنے کا کام، یہاں تک کہ گاؤں میں مندر بنانے اور دیکھ بھال کا کام کرتی تھی۔

چولا دورِ حکومت کا ایک خاصّہ یہ بھی رہا ہے کہ اس عہد میں مذہب کی ترویج اور مندروں کی تعمیر کا کام بھی خاص طور پر کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لگ بھگ ہر گاؤں میں مندروں کی تعمیر ہوئی اور اس علاقہ کے کاریگروں نے مندروں کی تعمیر میں دلچسپی دکھائی۔ نتیجے کے طور پہ ایک سے ایک خوبصورت اور شاندار مندر سامنے آئے جن میں مورتیاں اور کاریگری کے اچھے نمونوں کو آج بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ چولا دورِ حکومت میں مندر کے ذریعہ سماجی ضروریات کو بھی حل کیا جاتا تھا۔ عوام مندر کے احاطے میں بیٹھ کر اپنے مسائل کا حل تلاش کیا کرتی تھی۔ تہوار وغیرہ بھی مندروں کے صحن میں منائے جاتے تھے۔ ان کے آنگن میں بچوں کی ابتدائی تعلیم بھی ہوتی تھی۔ برہمن اور عالم لوگ مندروں میں بیٹھ کر سنسکرت زبان و ادب کا مطالعہ کرتے۔ رامائن، مہابھارت اور دوسری مذہبی کتابوں کا ترجمہ بھی اسی جگہ پر عقیدت کے پیشِ نظر کیا جاتا۔ انھیں مندروں کے سایہ میں بعض عالموں نے بھی اپنا نام روشن کیا، شنکر اور رامانج جیسے دانشور اور عالم انھیں مندروں کی دین تھے۔ ان کے ڈرامہ اور موسیقی کے پروگرام آج بھی تامل ناڈو کے مندروں میں پیش کئے جاتے ہیں۔

چولا راجاؤں کے عہد کا فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر میں بھی خاصا حصّہ ہے۔ انھوں نے باضابطہ شہروں کی بنیاد ڈالی۔ تالاب اور نہریں بنوائیں۔ کنوئیں اور محل بنوائے تنجور کا شیو مندر، راجہ راجہ کی ایک بہترین مثال ہے۔ جو لگ بھگ ساٹھ میٹر اونچا اور تیرہ منزلہ عمارت پر بنی ہے۔ مندر کے بالائی حصّہ پر ایک آٹھ میٹر کا اونچا برج بنا ہوا ہے جو لگ بھگ اسی ٹن وزن کا ایک ہی پتھر کے ٹکڑے کا بنا ہوا ہے۔ جنوبی ہندوستان کے فنِ تعمیر کی یہ خصوصیت ہے کہ وہاں مندروں کی تعمیر بتدریج نیچے سے

اوپر کی طرف پتلی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کی دیواروں پر دیوی دیوتاؤں کی مورتیاں اس قدر خوبصورتی کے ساتھ بنائی گئی ہیں۔ جن کا حُسن قابلِ دید ہے۔ ایک طرف تو یہ مذہب کے سچے اور بے باک جذبے کا اظہار کرتا ہے تو ساتھ ہی فنِ تعمیر کے انفرادی پہلو کا بھی مظہر ہے۔

تیرھویں صدی کے بعد چولا حکومت کا تو زوال ہو گیا مگر کچھ چھوٹی چھوٹی حکومتیں سامنے آئیں۔ لیکن دھیرے دھیرے وہ دہلی کے سلطان کے آگے ماند پڑ گئیں، اور سلطنت حکومت کے زیرِ سایہ حکومت کرتی رہیں۔ جن میں پانڈو، بہمنی، اور دوسرے نئے حکومتوں کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ ☆☆☆ ●●●

ہندوستان میں دورِ جدید کا آغاز

جس طرح دورِ وسطیٰ کے عروج میں مغل حکومت کے ابتدائی چھ شہنشاہوں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اسی طرح اورنگ زیب کے بعد مغل حکمرانوں کے زوال کی کہانی شروع ہو جاتی ہے، اور دراصل یہیں سے دورِ جدید کا آغاز ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب بادشاہ کے بعد ہی موڈرن ایج کی ابتداء ہوتی ہے۔ بابر سے لے کر اورنگ زیب تک پورا ہندوستان کم و بیش ایک پرچم تلے آ گیا تھا۔ اُن کے انتظامی اُمور اور بہادری کے کارناموں کی وجہ سے پورے ہندوستان کو ہر سطح پر اہمیت دی جانے لگی تھی، مگر ۱۸ ویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی پورے ہندوستان میں علاقائی سطح پر بغاوتیں ہونے لگیں۔ مراٹھا، سکھ، راجپوت اور جاٹ حکمرانوں نے بغاوتیں شروع کر دیں، اور نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ملک الگ الگ صوبوں میں بٹ کر اپنی آزادی کا اعلان کر چکا تھا۔ مغل بادشاہوں میں اب اتنا دم نہ تھا کہ وہ اپنے پرکھوں کی بنائی ہوئی حکومت کو قائم رکھ سکتے۔ مغل بادشاہ اپنے گورنروں اور اُمراء کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے تھے۔ اس کے باوجود بجھتے ہوئے چراغ کی طرح مغل بادشاہ کمزور حالت میں تخت پر براجمان رہے۔

اورنگ زیب کی وفات کے بعد ۱۷۰۷ء میں اس کے تینوں بیٹوں کے درمیان گدی نشینی کی جنگ شروع ہو گئی۔ معظم، اعظم، اور کام بخش کی آپسی جنگ میں بڑے بیٹے معظم کو فتح ہوئی اور وہ بہادر شاہ کے لقب کے ساتھ دہلی کے مغلیہ تخت پر اعلانِ بادشاہت

کر بیٹھا۔ معظم عرف بہادر شاہ، پانچ سال تک لال قلعہ کا بادشاہ رہا۔ لیکن یہ نااہل تھا۔ اور نہ ہی اس کے پاس سیاسی مسئلوں کو حل کرنے کی طاقت تھی۔ اس لئے ملک کے مسائل کی پرواہ کئے بغیر یہ گدی سے چپکا رہا۔ اور تاریخ میں شاہ بے خبر کے نام سے جانا جاتا رہا۔ نہ تو اس میں بغاوت کے خلاف جنگ کرنے کی طاقت تھی، اور نہ ہی یہ جنگ کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنی بہتری اسی میں سمجھی کہ وہ تمام انقلابیوں کو آزاد کر دے۔ بہادر شاہ نے مراٹھا اور راجپوت حکمرانوں سے دوستی کر لی۔ اس نے شیواجی کے پوتے "ساہو" کو آزاد کر دیا۔ مارواڑ کے راجہ اجیت سنگھ اور رانا امر سنگھ کو میواڑ میں خود مختار بنا دیا۔ اور اس طرح سنہ ۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ خاموشی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گیا۔

بہادر شاہ اوّل کے انتقال کے بعد پھر اس کے بعد چاروں شہزادوں میں بادشاہ بننے کے لئے جنگ ہوئی۔ جس میں جہاندار شاہ کو بادشاہت ملی۔

جہاندار شاہ کی کامیابی میں اس کے ایک بہادر امیر ذوالفقار خان کا بہت بڑا ہاتھ رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مغل بادشاہ تو عیش و عشرت میں زندگی گزارتا رہا اور اس کا خصوصی وزیر ذوالفقار خان حکومت کرتا رہا۔ یہ بادشاہ بزدل، ناقابل اور نالائق قسم کا تھا۔ حکومت کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی، اور آخر کار تقریباً دس مہینے ہی گزرے تھے کہ اس کے ایک بھتیجے فرخ سیر نے اس کو قتل کر کے مغل بادشاہت اپنے قبضے میں لے لی۔ جہاندار شاہ کے عہد میں ایک نمایاں کام یہ ہوا کہ اس نے جزیہ (ٹیکس) کو معاف کر دیا۔ جس سے ملک میں برابری اور مساوات کا ماحول قائم ہوا۔

سنہ ۱۷۱۳ء میں فرخ سیر نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی اور تقریباً چھ سال تک وہ مغل بادشاہ رہا۔ اس کی کامیابی میں دو سید بھائیوں عبداللہ خاں اور حسین علی خاں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس نے اپنے ملک کی بعض بغاوتوں کو سر کرنے کی جرأت کی جس میں پنجاب کے سکھ لیڈر بندہ بہادر کے خلاف بادشاہ نے دہلی سے عبدالصمد خاں کو ارسال کیا۔ کئی مہینوں تک زبردست جنگ ہوتی رہی اور آخر کار بندہ بہادر کی شکست ہوئی۔ وہ اپنے کئی سو سپاہیوں کے ساتھ دہلی لایا گیا اور سنہ ۱۷۱۶ء میں فرخ سیر کے

حکم سے سب کو ختم کر دیا گیا۔ فرخ سیر کی حکومت کے زمانے کا ایک اہم کارنامہ یہ بھی ہے کہ اس نے ملک کے باغیوں کو سر کرنے کے لیے انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں سے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے انگریز تاجروں کو بنگال میں بغیر کسی ٹیکس کے تجارت کرنے اور سامان کے درآمدات کی کھلی اجازت دیدی۔ جس سے ایک نقصان یہ ہوا کہ انگریز تاجروں کے قدم ہندوستان میں مضبوط ہونے لگے اور ملک کا خام مال سستے داموں پر باہر جانے لگا۔ اس دوستی کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ایک انگریز برٹش ڈاکٹر، ہملٹن (Hamilton) نے فرخ سیر کو کسی مہلک بیماری سے شفاء دلائی تھی۔ چونکہ اس مغل بادشاہ کی کامیابی کا انحصار انھیں دونوں سید بھائیوں پر تھا۔ اس نے جیسے ہی فرخ سیر کے ان دونوں سید بھائیوں کی طاقت کو سلب کرنا چاہا تو انھوں نے بغاوت شروع کر دی اور نتیجہ یہ نکلا کہ بادشاہ کو قید کر لیا گیا۔ اس کو مارا پیٹا گیا، یہاں تک کہ اندھا کر کے قتل کر دیا گیا، اور اس طرح فرخ سیر کا عہد بھی ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک رہ کر ختم ہو گیا ـــــ چونکہ اب صرف نام کا مغل بادشاہ ہوتا تھا، مگر اصل طاقت سید بھائیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اس لئے انھیں دونوں بھائیوں نے پھر ایک اور مغل شہزادے رفیع الدرجات کو نام نہاد بادشاہ بنا دیا۔ مگر رفیع الدرجات ٹی بی کا مریض تھا، اس لئے تین ہی مہینہ حکومت کر کے چل بسا۔ پھر اس کے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو تخت نشین کیا گیا مگر کچھ ہی دنوں میں یہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اور تب مغل بادشاہ بننے کا موقع محمد شاہ کو دیا گیا۔

محمد شاہ نے ۱۷۱۹ء میں تخت مغلیہ کو حاصل کیا اور ۱۷۴۸ء تک رہا۔ ان تیس سالوں کے عرصہ میں کچھ دنوں تک محمد شاہ نے سید بھائیوں کے کہنے ہی پر عمل کیا مگر آخرکار مجبور ہو کر بادشاہ نے ان میں سے ایک بھائی حسین علی خاں کو ۱۷۲۰ء میں قتل کرا دیا ـــــ اور دوسرے بھائی عبداللہ خان کو آگرہ کے قریب جنگ میں شکست دیکر قید کر لیا، اور ۱۷۲۲ء میں زہر دیکر مار ڈالا ـــــ اس طرح یہ دونوں سید برادران جن کے ہاتھوں میں مغل حکمران کٹھ پتلی بن کر رہ گئے، اب آزاد ہو گئے ـــــ مگر ساتھ ہی محمد شاہ کے سامنے دوسرے امراء کی ابھرتی ہوئی طاقتوں کی دشواری سامنے آنے لگی۔ بنگال میں علی وردی خاں،

اودھ میں سعادت علی خاں اور دکن کے علاقہ میں نظام الملک نے انفرادی طور پر اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا — اسی اثناء میں ۱۷۳۹ء میں ایران کے ایک جنگجو اور بہادر حکمران نادر شاہ نے ہندوستان اور دہلی پر حملہ کر دیا اور دھیرے دھیرے مغل حکومت کی حکومت کمزور ہوتی چلی گئی۔ مراٹھا، سکھ، جاٹ اور روہیل کھنڈ کے حکمرانوں نے متواتر حملے شروع کر دیئے۔ ان تمام بغاوتوں کو سر کرنے کی محمد شاہ میں اب سکت باقی نہ رہی، اور آخر کار مغل حکومت اب سکڑ کر صرف دہلی اور اس کے اطراف تک باقی رہ گئی۔ محمد شاہ مزاج کے اعتبار سے شوقین عاشق اور رنگ رلیاں منانے کا عادی تھا۔ اس نے لال قلعہ میں اپنی عیش و عشرت کے زوردار انتظامات کیئے اور ملک سے بے خبر ہو کر عیش و عشرت میں مست ہو گیا۔ اسی وجہ سے تاریخ میں محمد شاہ کو "رنگیلا" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ پوری مغل حکومت چھوٹے چھوٹے صوبوں اور علاقوں میں بٹ گئی۔ اور ہر علاقہ کا الگ الگ خود مختار بادشاہ بن بیٹھا۔ اب نہ تو بادشاہ میں اتنی طاقت تھی کہ وہ ہر ایک سے جنگ کرے اور نہ ہی اس کے پاس بہادر سپاہی تھے۔

۱۷۴۸ء میں اپنے باپ کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے احمد شاہ کو تخت پر بٹھایا گیا۔ لیکن یہ بھی اپنے باپ کی طرح نکما اور عیاش نکلا۔ اسی کے زمانے میں احمد شاہ عبدالی نے ہندوستان پر تین بار حملے کئے اور پنجاب و ملتان کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ایک ناکام اور کمزور بادشاہ کی طرح احمد شاہ نے تقریباً چھ سال بادشاہت ضرور کی مگر ہندوستان کی کسی بھی سیاسی، سماجی اور معاشرتی زندگی سے اس کا کوئی رشتہ نہ رہا تھا۔ اور آخر کار ۱۷۵۴ء میں احمد شاہ بادشاہ کے ایک وزیر، غازی الدّین عماد الملک نے اس کو قید کر کے اس کی آنکھوں کی روشنی چھین لی اور اندھا کر کے مار ڈالا گیا۔

پھر عالمگیر ثانی کی باری آئی اور عماد الملک وزیر کی خواہش پر احمد شاہ کے بعد ۱۷۵۴ء میں عالمگیر ثانی کو بادشاہ بنا دیا گیا — یہ بادشاہ بھی اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ اس کی کسی بھی بات کی کوئی سنوائی نہ تھی۔ سارا کا سارا قبضہ حکومت پر اس کے وزیر عماد الملک کا تھا۔ اس کے زمانے میں بھی احمد شاہ عبدالی نے پھر حملہ کیا مگر اس بار عالمگیر بادشاہ نے

مراٹھا حکمرانوں کی مدد سے ایک کثیر فوج کے ساتھ عبدالی کا مقابلہ کیا اور اس کے ساتھ اس کے لڑکے تیمور کو بھی مار بھگایا۔ عالمگیر نے آہستہ آہستہ مراٹھا اور سکھ نوجوانوں کی مدد سے مغل حکومت کو مضبوط بنانے کی کوشش کی اور اپنے وزیر عمادالملک کی طاقت کو کمزور کرنا چاہا مگر اس کی اس بات کا پتہ اس کے وزیر کو چل گیا اور ایک دن سنہ ۱۷۵۹ء میں عمادالملک نے عالمگیر کو بھی قتل کروادیا۔

باپ کے قتل کے بعد اس کا بیٹا شاہ عالم ثانی کے لقب سے تخت نشین ہوا، لیکن احمد شاہ عبدالی نے ایک بار پھر ایران سے آکر ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس کا مقابلہ پانی پتھ کے میدان میں سنہ ۱۷۶۱ء میں تیسری جنگ پانی پتھ کے نام سے ہوا جس میں ہندوستانیوں کو شکست ہوئی۔ کچھ ہی عرصہ بعد شاہ عالم کو بکسر کے میدان میں برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں ایک اور شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اور اس طرح بنگال، بہار اور اڑیسہ کا علاقہ مغل حکومت سے نکل کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ میں چلا گیا۔ اس طرح صحیح معنوں میں شاہ عالم کے زمانے ہی سے برٹش حکمرانوں کی مکمل طاقت کا آغاز ہوتا ہے اور مغل حکومت اب صرف سمٹ کر لال قلعہ کی چہار دیواریوں میں رہ گئی تھی۔ کیونکہ سنہ ۱۸۰۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا قبضہ دہلی اور اس کے اطراف میں بھی ہو گیا تھا اور آخر کار سنہ ۱۸۰۶ء میں شاہ عالم کی زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

شاہ عالم کے انتقال کے بعد اس کے بڑے بیٹے اکبر شاہ ثانی کو لال قلعہ کا بادشاہ بنا دیا گیا اور سنہ ۱۸۰۶ء سے ۱۸۳۷ء تک یہ نام نہاد بادشاہ رہا۔ اس کی حکومت اب صرف ایک برٹش حکمرانوں کے قیدی کی سی تھی، جو لال قلعہ میں قیدی کی زندگی گزار رہا تھا۔

اس کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفر کو مغل حکومت کا آخری بادشاہ بننے کا موقع ملا۔ اگرچہ بہادر شاہ ظفر نے بھی تقریباً بیس سال بادشاہ کی حیثیت سے زندگی گزاری مگر پورے ہندوستان پر اب صرف سامراجی حکمرانوں کا ہی قبضہ تھا۔ یہ چونکہ خود ایک شاعر بھی تھا۔ اس لئے اس کی شاعری میں بادشاہ کی کم نصیبی اور بربادی کی داستان دکھائی دیتی ہے۔ ۱۸۵۷ء

میں بہادر شاہ ظفر نے دوسرے لاکھوں ہندوستانیوں کی مدد سے انگریزوں کے خلاف جنگ کی مگر اس کو بغاوت کا نام دیکر لاکھوں ہندوستانیوں کو شہید کر دیا گیا۔ اور بہادر شاہ ظفر بادشاہ کو قید کر کے رنگون بھیجدیا گیا۔ جہاں ۱۸۶۲ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس طرح وہ حکومت جس کی بنیاد ۱۵۲۶ء میں بابر نے مغل حکومت کے نام سے ڈالی تھی اور پورے ہندوستان میں اس کی عظمت کا چرچا تھا۔ آخر کار بہادر شاہ ظفر کے قید ہونے کے ساتھ ہی ۱۸۵۷ء میں ختم ہو گئی اور لگ بھگ تین سو سال کا عرصہ پورا کر کے برٹش سامراجیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ یہیں سے ہندوستان میں غلامی کا دور شروع ہوتا ہے۔

۱۷۰۷ء کے بعد آنیوالا زمانہ دورِ جدید کہا جاتا ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ اب تک ہندوستان میں جتنی بھی حکومتیں رہیں انہوں نے اس سرزمین کو اپنا وطن، اور یہاں کے رہنے والوں کو اپنا ہمسایہ اور اپنا ہم وطن سمجھا۔ اب تک جو بھی ترقی اس ملک میں ہوئی اس کا فائدہ پورے طور پر پورے ملک میں ظاہر ہوا اور کسی ایک ہندوستانی کے ذہن میں یہ خیال ہرگز نہ آیا کہ اُن کے ملک پر کوئی بیرونی طاقت حکومت کر رہی ہے لیکن انگریزوں کی ہندوستان میں حکومت کے بعد ایک طرف تو یہاں کے ہندوستانیوں کو اس بات کا احساس تھا کہ اُن کے سر پر ایک غیر ملکی طاقت سوار ہے اور ساتھ ہی انگریزوں نے بھی اس ملک کو مضبوط کرنے کی کوئی کوشش نہ کی، بلکہ یہاں کی دولت اور یہاں کے مال سے انہوں نے اپنے ملک انگلستان کو ترقی دینی چاہی اور تمام ہندوستانیوں کو انہیں کے ملک میں دوسرے درجہ کا شہری اور اپنے ماتحت تصور کیا۔ سماجی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی نقطۂ نظر سے بھی انگریزوں نے تمام ہندوستانیوں کے ذہن پر اپنا مزاج اور اپنی تہذیب مسلط کرنی چاہی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی زندگی کے تمام شعبوں میں انگلستانی تہذیب نمایاں ہونے لگی۔ انگریزی زبان اور مغربی ملبوسات کو عزت کی نظر سے دیکھا جانے لگا اور خود ہندوستانیوں کی نظر میں ہندوستانی کلچر کو ذلیل اور گھٹیا سمجھا جانے لگا۔ ہندوستانیوں کی تاریخ اور تہذیب کو پرانہ اور انگریزوں کی تاریخ

اور اُن کے کلچر کو جدید تصوّر کیا جانے لگا اور آقا و غلام کا ایک ایسا گھناؤنا تصور اُبھر کر سامنے آیا جس سے عام ہندوستانی لوگوں میں نفرت اور بغاوت گھر کرنے لگی۔ جس کا فوری طور پر ردّ عمل یہ ہوا کہ انگریز سرکار کے ہندوستان میں قیام کے ساتھ ہی اُن کے خلاف آوازیں اٹھنے لگیں ـــــ ہندوستان کے وقار کو پھر سے بلند کرنے کے لیے تمام ملک کے بہادروں نے ہر سطح سے ہندوستان کو آزاد کرانے کی ٹھان لی۔ اس تمام عرصہ میں جس میں مغل حکومت کے زوال کی داستان بھی ہے، انگریزی سرکار کے عروج کی کہانی بھی ہے، اور ساتھ ہی ہندوستان کی جنگِ آزادی کا بیان بھی ہے۔ سب کو ملا کر جو تاریخ ترتیب دی گئی ہے، اسے دورِ جدید (یا موڈرن ایج) کہا جاتا ہے ٭٭٭

آثارِ قدیمہ
کی
اہم عمارتیں

ہندوستان کی بین الاقوامی اہمیت کی عمارتیں

ہندوستان زمانۂ قدیم ہی سے ثقافتی اور تاریخی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ جہاں قدرتی اور تعمیراتی نقطۂ نظر سے ایسے خزانے اور عمارتیں موجود ہیں جو نہ صرف ہمارے ملک کا قومی سرمایہ ہیں بلکہ پوری عالمی سطح پر بھی اُن کی انفرادی حیثیت رہی ہے۔

سنہ ۱۹۷۲ء میں یونیسکو Unesco تنظیم کے زیر تحت اس بات کی فوری ضرورت محسوس کی گئی کہ عالمی سطح پر ایک ایسی تنظیم کی بنیاد ڈالی جائے جو مشترکہ طور پر تمام دنیا کی اہم عمارتوں اور قدرتی مقامات کی حفاظت اور ان کی ترقی و ترویج کی طرف توجہ کر سکے۔

چنانچہ اس ادارے کے بنیادی مقاصد یہ تھے کہ :

(الف) عالمی سطح پر تمام دنیا کے ورثہ کی توضیح کی جائے۔

(ب) پوری دنیا کے تمام عالمی ورثہ کی عمارتوں کی ایک فہرست تیار کی جائے جن میں اہم اور غیر معمولی پائیہ کی عمارتیں شامل ہوں — اور انسانی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے سب میں یہ احساس بیدار کیا جائے کہ ان کی حفاظت کرنا انسانی فریضہ ہے۔

(ج) تمام دنیا کے ممالک کو باہمی اتفاق کے ساتھ ایسے تمام بین الاقوامی ورثہ کی دیکھ بھال اور ان کی ترقی کی طرف توجہ مبذول کرائی جائے تاکہ آنے والی نسلیں بھی اس ورثہ کو دیکھ سکیں۔

اس طرح تمام دُنیا کی اہم عمارتوں اور قدرتی مناظر کی جو فہرست تیار کی گئی ان میں

مجموعی طور پر ۲۰۸ عمارتوں اور جگہوں کو شامل کیا گیا ہے۔ پھر جب ۱۹۸۷ء میں یونیسکو کی طرف سے دوسرا اجلاس منعقد کیا گیا تو ۹۵ ممالک نے اس میں شرکت کی جس میں ہندوستان نے بھی اہم رکن کی حیثیت سے شمولیت کی، اور ابتدا ہی سے Icomos کے تعاون سے دنیا کی تمام اہم عمارتوں کی ترقی اور نگہبانی میں شریک ہوتا رہا۔ ۱۹۸۷ء میں جو عالمی پیمانے پر فہرست تیار کی گئی اس میں ہندوستان نے اپنے ملک کی تیرہ[13] اہم اور چنی ہوئی عالمی شہرت یافتہ عمارتوں کو شامل کرایا اور مزید ۴ قدرتی سیر گاہوں کا نام بھی درج کرایا۔ یہ اہم اور تاریخی اہمیت کی حامل جگہیں ہیں۔ (۱) اجنتا کے غار (۲) ایلورا کے غار (۳) آگرہ کا قلعہ (۴) تاج محل (۵) کونارک کا سورج مندر (۶) مہابل پورم (۷) گوا کے گرجا گھر (۸) کھجوراہو کے مندر، (۹) ہمپی کے مندر (۱۰) فتحپور سیکری (۱۱) پٹادہ کل کی عمارتیں (۱۲) ایلفنٹا کے غار (۱۳) تانجور کے مندر۔

ان کے علاوہ چار قدرتی مناظر کے حامل مقامات کے نام یہ ہیں (۱) کیولاڈیو نیشنل پارک (۲) مانس کی جانوروں اور پرندوں کی قیام گاہ (۳) قاضی رنگا نیشنل پارک اور (۴) اور سندر بن نیشنل پارک۔

اس طرح Unesco کی ایک ذیلی تنظیم "آئی کوموس" نے ۱۸ اپریل کو ہر سال عالمی ورثہ کا دن مقرر کیا۔ انھیں باتوں کے پیشِ نظر ہندوستان کے شعبۂ آثار قدیمہ نے ہر سال ۱۹ نومبر سے عالمی ورثہ کا ہفتہ منانے کا اہتمام کیا۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ خصوصی طور پر اس ہفتہ میں عوام کو اس بات کا احساس دلایا جائے کہ اُن کے ملک میں کس طرح کا شاندار قومی ورثہ موجود ہے اس کی حفاظت کرنا سب پر فرض ہے۔ اور سرکاری سطح پر نمائش، سمینار، اور اشتہارات کے ذریعہ عوام میں بیداری اور واقفیت پیدا کی جائے۔ یہ تاریخ خصوصی طور پر اس لئے بھی رکھی گئی ہے کہ اس دن ہندوستان کی سابق وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کی یوم ولادت بھی ہے۔

عالمی ورثہ کی فہرست میں جن ہندوستانی تاریخی اہمیت کی عمارات کو شامل کیا گیا ہے ان کی مختصر تفصیل یوں ہے:-

(۱) اجنتا کے غار AJANTA CAVES

صوبۂ مہاراشٹر کے ضلع اورنگ آباد میں اجنتا کے غار دنیا بھر میں فن مصوری کے نمونوں اور تعمیری نقطۂ نظر سے مشہور ہیں۔ عیسیٰ مسیح کی پیدائش سے پہلے ہندوستان میں گوتم بدھ کے ماننے والوں نے پورے وسط ایشیا میں بدھ مذہب کے فروغ و اشاعت کے لئے خانقاہیں تعمیر کروائیں۔ استوپ بنوائے اور گوتم بدھ کے فلسفۂ عدم تشدد اور انسان دوستی کا پرچار کیا۔ اجنتا کے غار بھی اسی بدھ مذہب کی اشاعت کا ایک پہلو ہیں۔ جو ابتدائی مراحل میں دوسری صدی قبل مسیح سے لے کر دوسری صدی عیسوی یعنی تقریباً چار سو سال میں تعمیر کئے گئے۔ ان غاروں کی تعمیری اور تاریخی خوبی یہ ہے کہ پہاڑوں کو تراش کر ان کے اندر بڑے بڑے دالان اور کمروں کی تعمیر کی گئی ہے جن کی دیواروں اور چھتوں پر اس قدر خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے جو اُس عہد کی خلاقانہ صلاحیتوں کا بہترین نمونہ ہیں۔ یہ اجنتا کے غار مختلف زمانوں میں الگ الگ بادشاہوں کے زیر سایہ تعمیر ہوتے گئے، ان غاروں میں اضافہ کی دوسری کوشش "وکاٹکاس" اور گپتا راجاؤں کے عہد میں پانچویں اور چھٹی صدی میں ہوئی۔ مگر بنیادی طور پر ان غاروں کے اندر بنی ہوئی تصاویر کا مقصد گوتم بدھ کی تعلیمات اور ان کی بنائی گئی کہانیاں Jatakas ہیں جن کو دیواروں پر نہایت ہی دلچسپ طریقہ سے پیش کیا گیا ہے۔

اجنتا کے غار مجموعی طور پر تیس ۳۰ ہیں جن میں ایک غار نامکمل ہے۔ غار نمبر ۹، ۱۰، ۱۹، ۲۶ اور ۲۹ میں کچھ ایسی تصاویر دیوار میں مزین ہیں جن میں جنس اور شہوانی خواہشات کا اظہار کیا گیا ہے جنھیں سنسکرت کی اصطلاح میں "چھتیہ گرہاس" کہا جاتا ہے۔ باقی تمام ۲۵ غاروں میں بدھ مذہب اور اس کے احکامات کی تصویر کشی ہے جو دراصل بدھ مذہب کی "خانقاہیں" ہیں۔ ان اجنتا کے غاروں کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ صدیوں تک یہ عوام کی نظر سے اوجھل رہے اور کسی کو بھی اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ان کے اندر ہماری پرانی تہذیب اور مذہب کا خزانہ چھپا ہوا ہے مگر آثار قدیمہ کے محققین اور تاریخ دانوں کی توجہ سے پہلی بار ۱۹۱۹ء میں اجنتا کے غاروں کا انکشاف ہوا اور تبھی سے ایک اہم مرکز بن گئے۔ غار نمبر ۴ میں رکھی ہوئی گوتم بدھ

کی ایک مورتی پر ایک تحریر بھی ملتی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ گپتا دور حکومت میں ایک "ابھے نندی" نامی شہزادے نے عقیدت کی بنا پر یہ مورتی بنوائی تھی۔ کچھ فن مصوری کے نمونے غار نمبر ۹ اور ۱۰ میں ایسے بھی ہیں جو "ستاواہنا" دور میں تیار کئے گئے ہیں اس میں مرد اور عورت کے خدوخال کی بہترین عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ دیواروں اور چھتوں پر چپاں ان تصاویر کا مرکزی خیال بدھ مذہب اور جاتک کہانیوں سے ماخوذ ہے، ان کے علاوہ قدیم ہندوستان کی معاشی، ثقافتی، درباری، اور روزمرہ کی زندگی کی کہانیاں بھی پیش کی گئی ہیں۔

اجنتا کی تصاویر کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوسری صدی قبل مسیح سے لے کر چھٹی صدی عیسوی تک کے شمالی اور وسط ہندوستان میں فنونِ لطیفہ کی طرف لوگوں کی کافی رغبت تھی اور فن تعمیر، نیز فنِ مصوری کے ماہر فنکاروں کے ذریعہ اُس زمانے کے امراء اور راجا آرٹ اور آرکیٹیکچر کو فروغ دینے میں خوب دلچسپی لیا کرتے تھے ــــ دیواروں پر چپاں تصاویر کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مٹی کے گارے کو دیواروں پر تھوپ کر مشاق ہاتھوں کے ذریعہ تصاویر بنائی گئی ہیں۔ پھر ان کو خاص حرارت کے ذریعہ ان میں رنگ کا لیپ لگایا گیا ہے۔ مرکزی طور پر ان تصاویر میں لال، زرد، بھورے، گیروئے، ہرے اور نیلے، چونا، گوند، چراغ کی سیاہی، اور بعض ملے جلے رنگوں کی آمیزش کی گئی ہے ــــ ان رنگوں کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ آج بھی ہزاروں سال گزرنے کے بعد ان رنگوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔

اجنتا کے غار تعمیری نقطۂ نظر سے ہندوستان کا ایک قومی ورثہ بھی ہیں اور تاریخی اعتبار سے بھی آج کے تاریخ دانوں اور فن کے متلاشی لوگوں کے لئے آثار قدیمہ پر ریسرچ کرنے کا دلچسپ اور شاندار موضوع بھی۔

۲۔ ایلورا کے غار ELLORA CAVES

مغربی ہندوستان میں مندر کی فنِ تعمیر کا ایک خوبصورت نمونہ ایلورا کے غار ہیں، جو

۵ ویں صدی سے لے کر ۱۳ ویں صدی تک تعمیر ہوئے ہیں، چٹانوں کو کاٹ کر ان کو مندر کی شکل میں تبدیل کر دینے میں ایلورا کے غار کو ہمیشہ سے اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان مندروں میں بدھ، برہمہ، اور جین عقیدے کا اظہار ملتا ہے۔ ۳۴ غاروں میں مندروں کی تعمیر اور ان کی دیواروں پر مورتیوں کی کاریگری کو دیکھ کر عہدِ وسطیٰ کے ہندوستانی فنِ سنگ تراشی کا نمایاں اظہار ہوتا ہے۔

۵ ویں صدی سے لے کر ۷ ویں صدی عیسوی تک شروع کے ۱۲ مندر یا خانقاہیں ہیں جن کو بدھ مذہب سے عقیدت رکھنے والے راجاؤں نے تعمیر کروایا ہے۔ ان مندروں میں بدھ مذہب اور جاتک کہانیوں کو مورتیوں کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ دراصل یہ وہی زمانہ ہے جب مغربی ہندوستان میں "مہایانہ" عقیدے کے ماننے والوں کا کافی زور تھا، اور انھیں لوگوں نے اپنے عقیدے کے پیشِ نظر ایلورا کے غاروں میں مندروں کی تعمیر کروائی۔ اِن میں غار نمبر ۱۰ سب سے زیادہ اہم اور قابلِ دید ہے کیوں کہ اس کی دیواروں اور چھتوں پر فنِ تعمیر کے علاوہ نقاشی و تزئین کا بہترین کام ہے۔ عام طور پر اس غار کو "وشوکرما" کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس میں ایک وسیع اور کشادہ ہال میں گوتم بدھ کی قدِ آدم مورتی رکھی ہوئی ہے جو فنِ سنگ تراشی کی تمام خوبیوں کی حامل ہے۔ ہال نمبر ۵ کو تین منزلہ تعمیر کیا گیا ہے جس کو مذہبی اصطلاح میں "وہارا" کہتے ہیں جو کہ سب سے بڑا اور وسیع ہے۔ اس غار کو خانقاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور سب سے اوپری منزل پر گوتم بدھ کی مورتیاں دیواروں پر منسلک ہیں۔

برہمہ کے غاروں کی یہ خصوصیت ہے کہ مندروں کی تمام تر تعمیری خصوصیات Temple Architecture کا یہاں اظہار کیا گیا ہے اور چٹانوں کو کاٹ کر مندر بنانے کی بہترین مثال پورے ہندوستان میں صرف یہیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ غار نمبر ۱۳ سے ۲۹ تک کے تمام مندر اس برہمہ عقیدے کے ماننے والوں کے ذریعہ بنوائے گئے ہیں۔ جن میں غار نمبر ۱۶ سب سے اہم اور شاندار ہے۔ ان غاروں میں مورتیاں زیادہ مزین اور زیادہ مشاق کاریگری کی مظہر ہیں۔ اور مندر کی تمام بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتی ہیں۔

جن میں کیلاش، لینگ، اور نندی کے مجسموں کو نہایت چابک دستی کے ساتھ تیار کیا گیا ہے۔ دراصل ہندو دھرم میں مندر کی خصوصی بنیاد ہی منڈپ، شکھر اور مذکورہ مجسموں کے تال میل سے بنتی ہے جو یہاں پوری طرح موجود ہیں۔ برہمہ کے غاروں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے غار نمبر ۱۶ میں دو "ڈھوج استمبھ" ہیں جو اس عہد کے نادر نمونہ ہیں۔ ایلورا کے اسی مخصوص غار میں ایک جگہ پر مجسموں کے ذریعہ راون کو کیلاش پہاڑ اٹھاتے ہوئے دکھایا گیا ہے جو اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ برہمہ سے متعلق ان تمام غاروں کے تعمیراتی پہلوؤں کو ایک انفرادی حیثیت پورے ہندوستانی آرٹ میں حاصل ہے۔

ایلورا کے غار کی تیسری قسم وہ ہے جو جین مذہب کے پیروکاروں نے بنوائے تھے۔ یہ نمبر ۳۰ سے ۳۴ تک ہیں۔ چونکہ یہ آخرالذکر غار سب سے بعد میں تعمیر ہوئے ہیں اور جینی مذہب کے عقیدے کی نمائندگی ان میں ہے اس لئے قدرتی مناظر، پیڑ پودوں کے علاوہ جین کی مورتیاں زیادہ بہتر طریقہ سے پیش کی گئی ہیں۔ ان مندروں کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ پتھروں پر باریک فن سنگ تراشی اور مجسموں میں بڑے احتیاط کے ساتھ ترتیب و پیش کش کا خیال رکھا گیا ہے۔ اس طرح ایلورا کے یہ غار نہ صرف تین منفرد مذاہب کے نمائندہ ہیں بلکہ ان میں ہندوستانی فن تعمیر اور چٹانوں میں کاریگری کا بہترین اظہار بھی ہیں۔

۴۔ آگرہ کا قلعہ AGRA FORT

سنہ ۱۵۲۶ء سے ہندوستان میں ظہیرالدین محمد بابر کی آمد کے ساتھ مغل دور کی ابتداء ہوتی ہے جس نے آگرہ ہی کو اپنی راجدھانی بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بابر بادشاہ نے بعض دوسری عمارتوں کے علاوہ ایک قلعہ بھی آگرہ میں تعمیر کروایا تھا۔ لیکن مغل سلطنت کے تیسرے شہنشاہ، جلال الدین محمد اکبر نے اسی جگہ پر ایک شاندار قلعہ کی بنیاد از سر نو ڈالی۔ یہ آگرہ کا قلعہ اکبر کی تعمیر کردہ عمارتوں میں سے ابتدائی دور کا ہے۔ اگرچہ دور اکبری کی بہت ساری عمارتیں اب آگرہ کے قلعہ میں منہدم ہو چکی ہیں مگر پھر بھی اس کی چہار دیواری اور خندق وہی ہے۔ یہ قلعہ سنہ ۱۵۶۵ء سے سنہ ۱۵۷۵ء کے دوران تعمیر کروایا گیا جو سہ رخی انداز کا

بنا ہوا ہے اور لگ بھگ دو کلومیٹر کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے جس میں چار اہم دروازے ہیں
اُن میں سے سب سے زیادہ شاندار اور جاہ جلال کا حامل دروازہ "دلّی دروازہ" ہے جو
اب بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

اکبر کے بعد بھی جہانگیر اور شاہجہاں بادشاہوں نے آگرہ کے قلعہ کو اپنا عارضی مسکن بنایا
اور کچھ مزید تعمیرات کیں جن میں جہانگیری محل، خاص محل، دیوانِ خاص، دیوان عام، مچھلی بھون
اور موتی مسجد قابلِ ذکر ہیں۔ جیسا کہ مغل فن تعمیر کی خصوصیت رہی ہے کہ اس دور کی بنی ہوئی
عمارتوں میں سرخ پتھر Red Sand Stone اور سنگ مرمر کے ساتھ پچہ کاری اور قیمتی پتھروں
کو بھی عمارتوں میں استعمال کیا گیا ہے وہی تمام خصوصیات آگرہ کے قلعہ میں بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔
اکبر کے بعد سنہ ۱۶۳۰، سنہ ۱۶۵۵ میں دورشاہجہانی میں اس قلعہ کو مزید فن معماری سے آراستہ کیا گیا۔

(۴) تاج محل TAJ MAHAL

عالمی شہرت یافتہ عمارتوں میں سے ایک اہم عمارت "تاج محل" بھی ہے جس کو ساری
دنیا میں ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ آگرہ شہر میں جمنا ندی کے داہنے کنارے پر
یہ نادر العصر عمارت آج بھی کھڑی ہوئی گذشتہ ساڑھے تین سو سال سے دو محبت کرنے والوں
کی داستان سنا رہی ہے۔ ابو صالح کنبوہ، "شاہ جہاں نامہ" میں لکھتا ہے کہ بادشاہ سلامت
کی سب سے چہیتی بیگم ارجمند بانو بیگم عرف "ممتاز محل" کے اچانک انتقال سے ظل سبحانی کو
کافی صدمہ پہنچا ان کا دل دنیا و جہاں سے اکتانے لگا مگر جلد ہی انھوں نے فیصلہ کیا کہ بیگم کی
یاد میں ایک ایسے مقبرے کی تعمیر کروائی جائے جو صدیوں تک محبّت کے آداب اور ملکہ کی قبر
کو لوگ یاد رکھیں۔ چنانچہ آگرہ کے قلعہ سے ڈیڑھ کلومیٹر کی دوری پر یہ مقبرہ بنوانے کے
لئے جگہ کا انتخاب کیا گیا ___ تاج محل کی تعمیر کا کام سنہ ۱۶۳۱ء میں شروع ہوا، اور سترہ سال
کے متواتر عرصہ میں مکمل ہوا، جس کے سب سے اہم نگہبان استاد احمد لاہوری تھے۔ لاکھوں روپیوں
ہزاروں مزدوروں اور بے تحاشہ محنت کے بعد یہ عمارت تیار ہوئی، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ
تاج محل کی تعمیر میں ۲۱ سال لگے ہیں۔

اس عمارت کی ایک انفرادی خوبی یہ ہے کہ مغل دور کی بنی ہوئی دوسری عمارتوں سے الگ خصوصی عمارت یا مقبرہ کو جمنا ندی کے کنارے اور چار باغ کے ایک کونے میں تعمیر کیا گیا ہے۔ جب کہ مغلیہ دور کی دوسری بنی ہوئی عمارتیں یا مقبرے باغ کے درمیان میں بنائے جاتے تھے۔ فن معماری کے ماہرین کا یہ خیال تھا کہ سنگ مرمر سے تراشی ہوئی یہ عمارت اتنی حسین اور اس قدر دیدہ زیب ہے کہ گویا باغ کے پیڑ پودے اور ہری بھری گھاس اور اس کے دامن میں اس کو دادِ تحسین دے رہی ہے۔ ارجمند بانو بیگم کو تاج بی بی بھی کہا جاتا تھا۔ اس مناسبت سے اس کو بجائے مقبرہ کہنے کے تاج محل کا نام دیا گیا۔ اس عمارت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر شئے کو نہایت ہی تناسب کے ساتھ بنایا گیا ہے۔ عمارت کے دونوں جانب ایک ہی جیسی دو عمارتیں سرخ اور سیاہ پتھر کی بنائی گئی ہیں جن میں بائیں جانب والی عمارت تو مسجد ہے جبکہ اسی طرح کی دوسری دائیں طرف کی عمارت کو مہمان خانہ کا نام دیا گیا ہے۔ مرکزی پیشانی پر کندہ قرآنی آیات فن خطاطی کی اعلیٰ ترین مثال ہیں جو ثلث رسم الخط میں تحریر کردہ ہیں۔ اندرونی حصہ میں قیمتی پتھروں کو سنگ مرمر کے اندر اس طرح پیوست کیا گیا ہے جو اعلیٰ ترین میناکاری اور پچہ کاری کی نشاندہی کرتے ہیں۔ دراصل اس زمانے میں ایک نقلی قبر بنانے کا رواج تھا، اس طرح تہ خانے میں تو ممتاز محل اور اس کی ایک جانب شاہ جہاں کی قبر ہے اور ٹھیک اسی سے ذرا اوپر کی منزل پر بھی اسی طرح کی قبر بنائی گئی ہے۔ ہشت پہل انداز کی یہ پوری عمارت اپنے اطراف میں ایک چہار دیواری کے ساتھ آج بھی موجود ہے جس کے صدر دروازے پر پہونچتے ہی تاج محل کی سحر انگیز خوبیوں کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔

(۵) کنارک کا سورج مندر SUN TEMPLE KONARK

صوبۂ اڑیسہ میں واقع ایک چھوٹا سا شہر "کنارک" پہلی صدی عیسوی سے ایک اہم بندرگاہ رہا ہے۔ جہاں سورج مندر کی وجہ سے لوگوں کی سیر گاہ کا اہم مرکز ہے۔ ۱۲۵۰ء میں اس مندر کی تعمیر ہوئی تھی جو اس وقت کے راجہ نرسمہا دیوا (۱۲۳۸ - ۱۲۶۴ء) نے بنوایا تھا۔

اس مندر کو سورج نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ سورج دیوتا کی ایک نمایاں مورتی اس میں رکھی گئی ہے۔ ہندوؤں کا مذہبی عقیدہ ہے کہ سورج دیوتا روشنی، دن اور گرمی کا پرتیک ہے اس لئے اس کی پوجا کی جاتی ہے۔

مندر کی پوری عمارت ایک رتھ کی شکل کی بنی ہوئی ہے جس کو سات متحرک گھوڑے بارہ جوڑ پہیوں کے ساتھ گھسیٹ رہے ہیں۔ پہیوں اور گھوڑوں پر بنی ہوئی سنگ تراشی کی بہترین نمائندگی ہے۔ اس مندر میں بھورے رنگ کے پتھر کی امتیازی شان ہے اور اس پر جگہ جگہ باریک کاریگری اس دور کی اڑیسہ آرٹ کی خصوصیت رہی ہے۔ مندر کی دیواروں پر ہندو دیوی اور دیوتاؤں کی بہت ساری چھوٹی بڑی مورتیاں بھی ہیں۔ ساتھ ہی کچھ ایسی یکشی اور یکشنی کی مورتیاں بھی ہیں جو عالم فرط و انبساط میں شہوانی لذتوں سے ہمکنار ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مندر میں اس طرح کے جنسی مناظر کی پیش کش کے پس پردہ خدا یا بھگوان تک پہونچنے کا ذریعہ یہ بھی ہے کہ جب تک انسان شہوانی لذّتوں سے پوری طرح سیرابی حاصل نہیں کر لے تب تک وہ ایشور کی طرف ٹھیک سے دھیان کر ہی نہیں سکتا۔ یا یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مندر میں داخل ہونے کے بعد انسان کے ذہن میں اس طرح کے مناظر بھی کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتے۔ کنارک کے اس مندر کی یہ خصوصیات ایک طرف تو اس کو عوام کو اپنی طرف آنے کے لئے آمادہ کرتی ہے اور ساتھ ہی تیرھویں صدی کے اڑیسہ کے فن تعمیر کی ایک مکمل اور ترقی یافتہ شکل بھی پیش کرتی ہے۔

(۶) مہابلی پورم کے مندر MAHABALI PURAM

جنوبی ہندوستان زمانۂ قدیم ہی سے آرٹ، فنون لطیفہ اور ہندوستانی مذاہب کا گہوارہ رہا ہے۔ صوبۂ تامل ناڈو کا یہ شہر مہابلی پورم بھی اس اعتبار سے بہت اہم ہے۔ وہاں کھدائی کے ذریعہ جو آثار ملے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ پہلی صدی عیسوی سے ہی یہ جگہ ایک اہم بندرگاہ کے طور پر جانی جاتی رہی ہے لیکن ساتویں صدی کی تیسری دہائی میں پلوا حکمراں کے زمانے میں "نرسمہا ورمن"، راجہ نے مہابلی پورم کو از سر نو آباد کرایا۔ کیوں کہ ان راجاؤں کو

"حملا" کہا جاتا ہے، اس کی مناسبت سے حملا پورم اور بعد میں مہابلی پورم کہا جانے لگا۔ ۶۳۰ء سے ۶۶۸ء تک اس جگہ پر بہت سے مندروں کی تعمیر ہوئی۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے لوگوں نے یہاں ہجرت کی اور یہ جگہ علم و دانش کی ایک اہم زیارت گاہ بن گئی۔ دراصل مہابلی پورم سمندر کے کنارے آباد ہے اس لئے تجارت کے نقطۂ نظر سے بھی یہاں کافی فروغ ہوا۔ ساتویں صدی میں یہاں مندروں کی تعمیر وسیع پیمانے پر ہوئی، اور پہاڑوں کو کاٹ کر تعمیرات کی گئیں۔ جن میں ارجن، گووردھن، مہشا سُر مردنی کی یاد میں مندر بنوائے گئے جو آج بھی انفرادی حیثیت رکھتے ہیں۔ تین منزلوں پر مبنی عمارتیں جن میں رتھ اور اس پر ارجن و دروپدی سوار ایک ایسا تعمیر کا پہلو ہے جس کو دیکھ کر جنوبی ہند کی تعمیراتی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بھیم، گنیش، اور سہدیو کے رتھ کو بھی پتھروں پر نہایت خوبصورتی کے ساتھ تراشا گیا ہے۔ پھر چولا دورِ حکومت میں بھی اس جگہ پر کچھ اور مزید تعمیرات ہوئیں۔ ان تمام عمارتوں کو ایک جگہ دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ ہر شخص محوِ عبادت ہے۔ اور قدرتی مناظر کے پس منظر میں پورا علاقہ ہندوستان کی قدیم تہذیب کی مظہر نظر آتی ہے۔ مہابلی پورم کے مندروں کی فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے یہ خوبی ہے کہ سطح سے بلندی کی طرف نہایت ہی تناسب کے ساتھ پوری عمارت پتلی ہوتی چلی جاتی ہے اور پورا ڈھانچہ مختلف مجسموں اور پھول پتیوں سے اس قدر زیادہ آراستہ کیا جاتا ہے جسے دیکھ کر ان کاریگروں کی ذاتی دلچسپی کی داد دینی پڑتی ہے۔ ان عمارتوں کا سب سے اہم حصہ وہ ہیں جن میں رتھ کو بنایا گیا ہے۔ انھیں دیکھ کر ہندو دیومالا اور مذہبی واقعات کی تاریخ کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

(۷) گوا کے گرجا گھر اور خانقاہیں CHURCHES OF GOA

ہندوستان کے جنوب مغرب میں "گووا" ایک ایسا علاقہ ہے جو اپنی تہذیب، سیاسی اور سماجی زندگی، معاشرہ اور زبان کے لحاظ سے سب سے منفرد ہے۔ یہاں "کوکنی" زبان بولی جاتی ہے اور آبادی کا کثیر حصہ عیسائی مذہب کو ماننے والا ہے۔ یہاں کا سب

سے اہم پہلو اس کے "گرجا گھر" ہیں جو ۱۶ ویں اور ۱۷ ویں صدی میں تعمیر ہوئے ہیں۔ جن میں کیتھیڈرل بھی شامل ہیں۔

گوا کا وسیع و عریض رقبہ مختلف حصوں میں بٹا ہوا ہے جن میں وہ علاقہ بھی قابلِ ذکر ہے جو بحرِ عرب کے کنارے بسا ہوا ہے۔ سمندری کنارہ سیاحوں کی دلچسپی کا ایک اہم مرکز ہے۔ دوسرا حصہ "پنجم" کہلاتا ہے جو شہر کی تجارت کا ایک اہم مرکز ہے یہاں بازار، دوکانیں، ہوٹل اور پرتگالیوں کے عہد کی بنائی ہوئی عمارتیں قابل دید ہیں مگر گوا کا پرانا حصہ جو اولڈ گوا کے نام سے جانا جاتا ہے وہ عہدِ وسطیٰ میں بنائے گئے گرجا گھروں اور خانقاہوں کی وجہ سے آثار قدیمہ میں تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ سینٹ کیتھیڈرل اور گرجا گھر، اسا سی کے سینٹ گرجا گھر۔ سینٹ کیتھوئین کا چیپل، بوم جیس کا بسلیکا۔ میڈم روزری اور آوگیسٹائن کے گرجا گھر فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ گوا کا یہ علاقہ انھیں عمارتوں کی وجہ سے مشہور ہے۔

یہ عمارتیں روم کی قدیم خانقاہوں کے نقشِ قدم پر بنائی گئی ہیں۔ ان پرانی عمارتوں کی تعمیری نقطۂ نظر سے یہ خوبی ہے کہ اندرونی حصہ میں چھت اور دیواروں پر بہترین نقاشی کے نمونے ملتے ہیں جن میں زیادہ تر کام لکڑی کا ہے جس کو مختلف رنگوں کی آمیزش سے آراستہ کیا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ اور مریم کی مورتیاں بھی پتھروں پر تراشی ہوئی دیکھنے کو ملتی ہیں یہاں ایک میوزیم بھی ہے جو ۱۹۶۴ء میں قائم ہوا تھا۔ آج بھی یہ میوزیم سینٹ فرانسس اسا سی کے کونونٹ میں موجود ہے۔ جس میں پرتگالی گورنروں کی مزین تصاویر کے علاوہ برہمنی انداز کے مجسمے بھی موجود ہیں۔ کچھ پرتگال حکومت کے پرانے سکّے اور جہازوں کے ماڈل بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

(۸) کھجوراہو کے مندر

KHAJERAHO

مدھیہ پردیش کے ضلع چھترپور میں ایک چھوٹا سا مگر تاریخی اہمیت کا ایک شہر "کھجوراہو" ہے۔ جو پتھریلے پہاڑوں اور چٹیل میدانوں کے درمیان بسا ہوا ہے۔ یہاں ابھی

ریل گاڑی کی سہولتیں مہیا نہیں ہو سکی ہیں۔ جھانسی یا بھوپال سے سڑک کے ذریعہ پہونچا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہوائی جہاز کے سہارے بھی جانے کی سہولت فراہم ہے۔

دسویں صدی عیسوی میں چندیلا حکمرانوں نے کھجوراہو کو ایک اہم تجارتی اور ثقافتی مرکز بنایا تھا۔ وہاں نہ صرف چندیلا بادشاہوں نے اپنی راجدھانی قائم کی بلکہ تالاب، باغات اور خوبصورت مندروں کی بھی تعمیر کی۔ ایک روایت کے مطابق کہا جاتا ہے کہ یہاں ابتداء میں ۸۵ مندروں کی تعمیر ہوئی تھی۔ جن میں سے اب صرف ۲۵ مندر ہی باقی رہ گئے ہیں۔ یہ مندر مختلف زمانے میں بنتے رہے جو بھورے اور گلابی زرد رنگ کے پتھروں کے بنے ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے راجہ یشو ورمن نے ۹۵۴ء میں وشنو بھگوان کی یاد میں ایک مندر کی تعمیر کروائی جو اب لکشمن مندر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بعد میں وشوا ناتھ، پارسوا ناتھ، ویدناتھ، مندروں کی تعمیر راجہ ڈھانگہ نے کروائی۔ مغربی سمت میں تعمیر کئے ہوئے مندروں میں جگدمبی اور چترگپتا قابلِ ذکر ہیں۔

کھجوراہو کا سب سے بڑا شاندار مندر "کندھاریہ مہادیوا" کہلاتا ہے۔ ان مندروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دسویں صدی سے فن تعمیر کے اعلیٰ نمونوں کو پیش کرتے ہیں، مورتیوں کے لباس، ان کے زیورات، چہروں اور جسم کے تأثرات، ایسا لگتا ہے جیسے مورتیوں میں جان پڑ گئی ہے۔ ان مورتیوں کے ذریعہ جنسی خواہشات کا اظہار بھی کیا گیا ہے جو نہ صرف اس دور میں بلکہ آج بھی فن سنگ تراشی کی نادر مثال ہیں ــــ ان مندروں کی ایک یہ بھی انفرادیت ہے کہ پوری عمارت کو اونچے چبوترے پر بنایا گیا ہے جس کے اطراف کشادہ اور وسیع میدان ہے جس سے ان کا حسن اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے۔

(۹) ھمپی کے آثار قدیمہ HAMPI

ہندوستان کے جنوب میں دریائے تُنگا بھدرا کے کنارے ایک چھوٹا سا شہر ہمپی ہے۔ کسی زمانے میں یہی جگہ وجے نگر حکمرانوں کی راجدھانی تھی جو ۱۳۳۶ء سے ۱۵۷۰ء کے درمیان ایک اہم مرکز رہا ہے۔ اسی دوران یہاں بہت سی عمارتیں بنائی گئیں۔ قلعہ اور

محل تعمیر ہوئے۔ ہری راجہ سے لے کر سداشیوا رایا راجہ تک ہمپی کو خصوصی اہمیت حاصل رہی۔ بعد میں "سلووا" اور "تلووا" حکمرانوں نے بھی اس جگہ کو اپنی جائے اقامت قرار دیا۔ اِن سب میں سب سے زیادہ اہمیت کرشن دیوا رایا کو ملی جس کے عہد میں ہمپی نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پورے وسط ایشیا میں اپنی ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں کی وجہ سے جانا جاتا تھا۔ اس دَور میں ہندو فنون لطیفہ اور فن تعمیر پر کافی توجہ دی گئی۔ اُس عہد میں دور دراز ملکوں سے مثال کے طور پر عرب، اٹلی، پرتگال اور روس کے سفیر و سیاح ہمپی آیا کرتے تھے۔ جنھوں نے اپنے سفرنامے میں اس عہد وسطیٰ کے شہر ہمپی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

آج بھی اس شہر میں کھدائی کے بعد جو آثار نمودار ہوئے ہیں اُن میں اس وقت کی دیواریں، راجہ کے تخت کی جگہ، اور محلوں کے جاہ و حشمت سے بھرپور کمرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہاں مندروں میں ہندو اور جین مذہب کے مجسمہ بھی دستیاب ہوئے ہیں جو نہایت ہی وسیع اور بڑے ہیں جن پر باریک نقاشی اور تحریریں ملتی ہیں۔ کچھ مندروں میں تو رامائن اور مہابھارت جیسی گرنتھوں کے اشلوک بھی کندہ نظر آتے ہیں۔ آج بھی پمپاوتی کا مندر عقیدت مندوں کے لئے عبادت گاہ بنا ہوا ہے جو اس دور کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ حال ہی میں کھدائی کے دوران ہمپی سے پہلی اور دوسری صدی عیسوی کے کچھ بدھ مذہب کے مجسمہ دستیاب ہوئے ہیں جو اس شہر کو تاریخ کے ابتدائی دور سے وابستہ کرتے ہیں۔

(۱۰) فتحپور سیکری FATEHPUR SIKRI

آگرہ سے تقریباً ۴۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر فتحپور سیکری آباد ہے۔ جو مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر نے اپنے بیٹے کی پیدائش کی خوشی میں سنہ ۱۵۶۹ء میں بسایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کے بزرگ حضرت شیخ سلیم چشتی کی دعاؤں کے اثر سے شہزادہ سلیم اور ایک سال بعد شہزادہ مراد پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۵۷۱ء میں شہنشاہ اکبر نے حکم دیا کہ اس بزرگ کے احترام میں فتحپور سیکری میں ایک شاندار محل، اور عوام کے رہنے کے لئے مکانات تعمیر

کروائے جائیں۔ اس طرح چند سالوں کے اندر ہی شاندار محل، مسجد اور منظم شہر کی تعمیر مکمّل ہوگئی۔ جن میں بادشاہ کا محل، بلند دروازہ، جامع مسجد، اور خود سلیم چشتی کا مزار مغل عہد کی بہترین عمارتیں ہیں۔

شہر کی تعمیر کے بعد اکبر نے اپنی راجدھانی آگرہ سے فتحپور سیکری منتقل کرلی اور جلد ہی پورا شہر ایک بین الاقوامی تجارت کا مرکز اور لوگوں کی دلچسپی کی جگہ بن گیا۔ جو عمارتیں تعمیر ہوئیں اُن میں نقار خانہ، ٹکسال، شاہی کارخانے، خزانہ، دیوانِ عام، مریم زمانی کا مکان، جودھا بائی کا محل، بیربل کا مکان، اور پنج محل آج بھی سیاحوں کو دعوت نظارہ دیتی ہیں۔

فتحپور سیکری میں مغل عہد کی یہ عمارتیں ایک طرف تو اس عہد کے فنِ تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں، ساتھ ہی ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی بھی مکمّل آئینہ دار ہیں۔

(۱۱) پٹاڈکل کے آثار قدیمہ PATTA DAKAL

ہندوستان کے جنوب میں واقع ایک چھوٹا سا علاقہ "پٹاڈکل" کہلاتا ہے جو ۷ویں اور ۸ویں صدی عیسوی میں آرٹ اور فنون لطیفہ کا ایک اہم مرکز تھا۔ اس جگہ کو چالکیا راجاؤں نے اپنی آماجگاہ بنایا۔ خوبصورت اور شاندار مندروں کی تعمیر کروائی۔ جن میں "سنگامیشورا" مندر آج بھی اپنی عظمت اور جاہ وجلال کا پتہ دیتا ہے، یہ مندر چالکیا کے راجہ "وجے آدتیہ ستنیہ سروا" نے ۶۹۷ء میں تعمیر کروایا تھا۔ دراصل جنوبی ہندوستان میں ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں چالکیا راجاؤں نے فنِ سنگ تراشی اور مجسمہ سازی کو ایک انفرادی شناخت دی۔ جن میں نٹ راج اور بعض دوسری مورتیوں کے رقص کے مختلف مدارج کو مجسمہ کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔

یہاں کے مندروں میں ہندو دیومالاؤں اور گرنتھوں کے بعض مناظر کو بھی مورتیوں کے ذریعہ نمایاں کیا گیا ہے جن میں رامائن، مہابھارت، بھگوت گیتا، اور پنج تنتر کی کہانیوں اور واقعات کو دیکھا جاسکتا ہے۔

آج بھی "پٹادکل" کے مندر اور عمارتیں اگرچہ سادہ ہیں مگر ان کو دیکھنے سے چالکیا آرٹ اور اس عہد کے فن تعمیر کی بہترین مثالیں کہا جا سکتا ہے

(۱۲) ایلیفنٹا کی گپھائیں Eliphanta Caves

بمبئی شہر سے قریب، بحر عرب میں ایک جزیرہ ہے جس کو اب "ایلیفنٹا" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس نام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اسی جزیرے کو جس کو "گھرا پوری" کہا جاتا تھا یہیں پر ۱۸۰۲ء میں پتھر کا بنا ہوا ایک ہاتھی پایا گیا اور اسی مناسبت سے اس کو "ایلیفنٹا" کہا جانے لگا۔ دراصل اسی جزیرے میں چھٹی صدی عیسوی کے دوران "کونکن موریہ" کی راجدھانی تھی جنھوں نے وہاں کی چٹانوں کو کاٹ کر مندروں اور عمارتوں کی تعمیر کی تھی۔

ایلیفنٹا کی گپھاؤں میں مجموعی طور پر سات گپھائیں ہیں جن میں سب سے زیادہ اہم "مہیشا مورتی" گپھا ہے جو سامنے سے ۳۹ میٹر چوڑی ہے اس کے علاوہ تین مورتی کا مجسمہ بھی قابل دید ہے۔ مندر کے دروازے پر "دوارپال" یا مندر کے دروازوں پر کھڑے ہونے والے دربانوں کی مورتیاں بھی الیفنٹا کی زینت ہیں۔

ان مورتیوں کے علاوہ دوسری گپھاؤں میں مورتیوں کے حوالہ سے پوری ہندو تاریخ کا اظہار کیا گیا ہے جس میں "اردھ ناری"، "شیو اور پاروتی" راون اور دوسری مذہبی روایات سے منسلک مورتیاں ہیں۔

ایلیفنٹا کی یہ گپھائیں مغربی ہندوستان میں چٹانوں کو کاٹ کر مندروں کی تعمیر کے سلسلہ کی کامیاب مثال ہیں، اور ہمارے ملک کا قیمتی سرمایہ بھی۔

(۱۳) تنجور کے مندر Tanjavour

تامل ناڈو کے علاقے میں تنجور کے مندر نہ صرف جنوبی ہندوستان میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ پوری دنیا میں اپنے مخصوص آرٹ اور فن کی بنا پر مشہور ہیں۔ ان میں سب سے اہم وہاں کا "برہدیشورا" مندر ہے۔ جو چولا دور کے حکمرانوں کی کاوشوں سے

۹۸۵ء سے ۱۰۱۲ء کے دوران تعمیر کیا گیا۔ جنوبی ہندوستان میں چولا حکومت کو عہد وسطیٰ کا زرّیں دَور کہا جاتا ہے اس عہد میں، کانسہ، پیتل، پتھر اور بعض دوسری دھاتوں کے ذریعہ اس قدر خوبصورت اور متناسب مورتیاں اور شبیہیں بنائی گئی ہیں جو آج بھی اس عہد کی فنکارانہ صلاحیتوں کی غماز ہیں — تقریباً ایک کلو میٹر کے رقبہ میں پھیلا ہوا یہ علاقہ چھوٹے بڑے مندروں سے بھرا ہوا ہے۔ جس کی دیواروں پر مندو دیو مالاؤں میں مذکور دیوی، دیوتاؤں اور کچھ مخصوص جانوروں کے مجسموں کو تراشا گیا ہے۔ مندر کے صدر دروازے پر چوکھٹ کے پاس اور منڈپ کے قریب "برہ لنگا" کی مورت نصب ہے۔ اور مندر کے اطراف دالان بنے ہوئے ہیں جہاں عقیدتمند اور سیاح بیٹھ کر اس عمارت کی فن سنگ تراشی کی تخلیقی خوبیوں سے لطف لیتے ہیں — اس کے قریب ایک آرٹ گیلری بھی ہے جس میں چولا عہد کی منتخب تصاویر اور کانسہ کے بنے ہوئے مجسمہ رکھے ہوئے ہیں جنھیں دیکھ کر دسویں اور گیارہویں صدی کے جنوبی ہندوستان کی مکمّل نمائندگی ہوتی ہے۔

یہ مذکورہ آثار قدیمہ ہندوستان کا ایک ایسا قیمتی سرمایہ ہیں جنھیں نہ صرف قومی سطح پر بلکہ بین الاقوامی معیار پر بھی اہمیت دی گئی ہے اور عالمی سرمایہ کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے — ہر سال ہندوستان میں ماہ نومبر میں ایک عالمی ورثہ کا ہفتہ منایا جاتا ہے جس میں ان جگہوں پر خصوصی نمائش اور سمینار کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ ملک کے عام لوگوں میں اس بات کا احساس اجاگر ہو کہ یہ ہماری قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں ان کی دیکھ بھال اور ترویج و ترقی میں ہر ایک کا حصّہ ہے۔

دیوارِ چین

ملک چین کی تاریخ اور تہذیب کے سلسلہ کی ایک اہم اور قدیم کڑی دیوار چین ہے۔ جس طرح ہندوستانی تہذیب کا تاریخی رشتہ ہڑپا اور موہنجو دارو تک جاتا ہے اسی طرح چین کا ذکر آتے ہی وہاں کی اس بین الاقوامی شہرت یافتہ دیوار کے ذکر کے بغیر چین کا تاریخی گرد وپیش بھی ادھورا ہے۔ چین کی ایک کہاوت ہے کہ جب تک کوئی بھی اس ملک کا باشندہ دیوارِ چین کا دیدار نہیں کر لیتا ہے اس وقت تک اس کو صحیح معنوں میں چین کا رہنے والا نہیں کہا جا سکتا ہے۔

دیوارِ چین کے بارے میں لوگوں کے ذہن میں عام غلط فہمی یہ ہے کہ یہ ملک چین کی حفاظت کرتی ہے اور پوری دیوار ایک ہی دَور میں ایک خاص قسم کے فنِ تعمیر سے آراستہ ہے جو مشرق سے مغرب کی طرف ہزاروں میل لمبائی میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف حقیقت یہ ہے کہ یہ دیوار اب نہ تو چین کی سرحد پر ہے اور نہ ہی یہ کسی حدِ فاصل کا کام کرتی ہے اور نہ ہی ترتیب وار یہ ایک عہد میں بنائی گئی ہے۔ یہ دیوار تو سانپ کی طرح آڑی ترچھی اور مختلف سمتوں میں گردش کرتی ہوئی چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ کچھ جگہوں پر تو یہ دیوار اکہری اور پتلی بنی ہوئی ہے جبکہ بعض جگہ پر تو یہ بیس تہوں میں تعمیر کی گئی ہے۔

اس دیوارِ چین کے مختلف حصوں کو الگ الگ زمانے میں انفرادی سلطنت کے بادشاہوں کی مرضی سے گزشتہ دو ہزار سال کے عرصہ میں بنایا گیا ہے۔ جس میں علاقائی مٹی، پتھر، لکڑی اور اینٹوں کے مشترک استعمال سے تیار کیا گیا ہے۔ کچھ ریگستانی حصوں

میں معماروں نے روئی، بانس اور بالو کا بھی استعمال کیا ہے۔ تاریخ کے حوالوں سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس دیوارِ چین کی تعمیر میں اُس ملک کی فوج کے جوانوں اور جیل کے قیدیوں کی مدد لی گئی تھی ـــــ اس مشہور زمانہ دیوار کو بنانے میں قدیم چینی بادشاہوں کی تقریباً بیس حکومتوں کی شمولیت رہی ہے جن میں سب سے پہلے کین حکومت ـــــ کین حکومت (Qin Dynasty) نے 206-221 B.C قبل مسیح کے عرصہ میں اس دیوار کی بنیاد ڈالی تھی۔ پھر 206 B.C تا 220 A.D کے عرصہ میں ہان (HAN) اور منگ (MING) حکومتوں نے اس دیوار کو پانچ ہزار کلومیٹر کے حلقہ میں تعمیر کیا جو تقریباً سولہ قدیم صوبوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ پھر منگولیہ کے زیر اثر اس کی اور توسیع کی گئی ہے اور اس کے حلقہ کو بڑھا کر پندرہ ہزار کلومیٹر کے حصہ میں پھیلا دیا گیا۔

تاریخ کے ایک اور حوالہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی تعمیر کی ابتداء چو، کی یان Chu Ki Yam بادشاہ نے ۸۰۰ قبل مسیح میں ملک کی شہر پناہ کے لئے کی تھی جو موجودہ بی جنگ Beejing شہر میں شروع ہوئی تھی۔ کیونکہ چو، کی، یان کے عہد میں ملک چین کو اپنے اطراف کے علاقے کے دشمنوں سے کافی خطرہ لاحق ہو گیا تھا اس لئے ایک ایسی فصیل کی ضرورت پیش آئی جو اندرونِ خانہ اور ملک کے باشندوں کو بیرونی حملوں سے نجات دلا سکے۔ لیکن اس دیوار کا سب سے نمایاں اور قابلِ ذکر حصہ وہ ہے جو کین شی ہوانگ Kin Shi Huang کے عہد میں دوسری صدی قبل مسیح کے دوران شمال چین میں تعمیر کرایا گیا ـــــ اس دیوار پر مختلف جگہوں پہ بُرج اور کنگورے بھی بنے ہوئے ہیں ساتھ میں کئی میل تک متواتر دیوار کا سلسلہ ابھرے انداز میں دور تک پھیلا ہوا اب بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد تیسری صدی عیسوی میں اس دیوار کی مختلف جگہوں پہ دوبارہ مرمت بھی کی گئی ہے اور ہان و منگ بادشاہوں کے ذریعہ اس کو وسیع پیمانے پر ٹھیک کیا گیا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دیوارِ چین کا زیادہ تر حصہ دورِ منگ میں تعمیر کیا گیا۔

چین کی یہ عظیم دیوار مختلف علاقوں میں الگ الگ اونچائی کے ساتھ پائی جاتی ہے، مثال کے طور پر شہر بدالنگ Badaling میں شمال مغرب کی طرف اس کی اونچائی

لگ بھگ ۸ میٹر ہے اور دیوار کی چوڑائی چھ میٹر ہے۔ دیوار کے اندر کے حصہ میں زینے بنے ہوئے ہیں جن کے ذریعہ بالائی سطح پر جایا جا سکتا ہے۔ کچھ جگہوں پر لوہے کے دروازے بھی لگے ہوئے ہیں ـــــ مشہور چینی سیاح ہیان سانگ کا کہنا ہے کہ دیوار پر چڑھ کر ایک ساتھ پانچ گھوڑے سرپٹ دوڑ سکتے ہیں، اور دس آدمی آسانی کے ساتھ برابر چل سکتے ہیں۔ زیر بحث چین کی دیوار کو اینٹوں کے ذریعہ تعمیر کیا گیا ہے اس پر تین میٹر بھورے رنگ کے چوڑے پتھروں کو چسپاں کیا گیا ہے۔ فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے یہ ایک ایسا نمونہ ہے جو ہزاروں میل میں پھیلی ہوئی اس دیوار کا نقطۂ عروج ہے۔ اس فصیل کے بالائی حصہ میں چھوٹے چھوٹے سوراخ بنے ہوئے ہیں جن میں سے وقت ضرورت اندر سے دشمنوں کو دیکھا جا سکتا ہے اور ٹھیک ان چھوٹے سوراخوں کے نیچے قدرے بڑے چھید بنے ہوئے ہیں جن کے سہارے دشمنوں پر گولی چلائی جا سکتی تھی۔ پوری تعمیر شدہ دیوار کے اوپر نالیاں بنی ہوئی ہیں جن کے ذریعہ بارش کے پانی کی نکاسی ہوتی تھی۔ ساتھ ہی دیوار کے اوپر بنی ہوئی سڑک پر جگہ جگہ ایسی چھتریاں بھی موجود ہیں جو وقت ضرورت بارش اور تیز ہوا سے بچنے کے لئے ایک ٹھکانہ تھیں۔ دیوار کے درمیانی حصہ میں کچھ کشادہ کمرے بھی بنائے گئے ہیں جو آرام گاہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے یا لمبہ عرصہ کے لئے ان میں اناج وغیرہ کا بھی ذخیرہ جمع کیا جا سکتا تھا۔ کچھ مؤرخین کا یہ بھی خیال ہے کہ دیوار کے درمیانی حصہ میں بڑے بڑے کمروں کو اسلحہ یا دوسرے سامان کو جمع کرنے کے کام میں استعمال کیا جاتا تھا۔ دیوار چین کا وہ حصہ جو پہاڑی چوٹیوں سے منسلک ہے فوج کی مستقل قیام گاہ کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا، اور قدرتی طور پر ملک کی فصیل کا کام کرتی تھی۔ پہاڑ کی چوٹیوں پر سے قدیم تاریخی دور میں دشمنوں سے ہوشیار رہنے کے لئے آگ جلا کر یا دھواں سلگا کر اشارے کا کام بھی لیا جاتا تھا۔

دو ہزار سال کے عرصہ میں بنائی جانے والی اس دیوار چین کے بعض حصوں کو ہندوستان کے ان علاقوں سے بھی دیکھا جا سکتا ہے جہاں سے ہند اور چین کی سرحدیں ملتی ہیں۔ اس کے بارے میں چین کے بہت سارے آثار قدیمہ کے ماہرین اور معتبر مورخین

کو یہ تشویش ہونے لگی ہے کہ اگر اس کی دیکھ بھال اور دوبارہ تعمیر کی طرف توجہ نہ کی گئی تو دھیرے دھیرے جلد ہی اس کا بیشتر حصّہ نیست و نابود ہو جائے گا۔ کیونکہ چین کے بعض غیر آباد اور جنگلی علاقوں سے جہاں یہ دیوار گزرتی ہے وہاں کے غیر تہذیب یافتہ اور جاہل لوگوں نے اس دیوار کو منہدم کر کے اس کے ملبہ سے اپنے گھروں کی تعمیر کرنا شروع کر دیا ہے جس سے رفتہ رفتہ دیوار کا بیشتر حصّہ غائب ہو گیا ہے۔

دیوارِ چین نہ صرف کسی ایک ملک کا تہذیبی تاریخی ورثہ ہے بلکہ یہ تو قدیم دنیا کی تہذیب اور تاریخ کی مشترکہ میراث ہے اور اب بین الاقوامی سطح پر اس کی حفاظت کے اقدامات کئے جا رہے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں بھی ایشیائی ممالک کے فروغ اور تہذیبی دور کے ماضی کی امانت کو دیکھ سکیں۔

۳۔

تاریخی عمارتیں

مشترکہ تہذیب کی علامت

ہندوستانی تہذیب اور ثقافت ہزاروں سال پرانی ہے۔ اس تہذیب کو بنانے میں مختلف دور، مختلف مذاہب اور مختلف طبقوں کا حصہ رہا ہے۔ اس ملک کے مندر، قلعہ، لاٹیں، کنوئیں، شاہراہیں، مسجدیں، گوردوارے اور مقابر گذشتہ زندگی اور ہماری مشترکہ تہذیب کے آئینہ دار ہیں ــــــ فنِ تعمیر اس ملک میں صدیوں پُرانا فن رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب پوری دنیا میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور لوگ تہذیب اور آرٹ کے نام سے بے بہرہ تھے۔ اس وقت سارے عالم میں صرف چند ہی ملک اپنی تہذیبی شناخت کروا چکے تھے۔ ایک یونان و مصر اور دوسرا ہندوستان، ہڑپا اور موہن جوداڑو آج سے پانچ ہزار سال قبل کے وہ تہذیبی شہر ہیں جن کی دیواروں اینٹوں اور روزمرہ استعمال کی جانیوالی اشیاء کے ذریعہ ہمیں آج بھی اس دور کی تہذیبی اور معاشی زندگی کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ آہستہ آہستہ قدموں نے زمین کھرچی اور راستے ہموار ہوتے گئے۔ ہندوستان میں بھی عرب، یونان، مصر، ایران اور یورپ کے لوگوں نے پیش قدمی کی۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے اس ملک کو اپنا وطن اور اپنی سرزمین سمجھ لیا اور یہیں مقیم ہو گئے۔ انہیں میں سے پہلا ہندوستانی مسلمان بادشاہ معزالدین محمد بن سام المعروف شہاب الدین غوری ہے۔ محمد غوری کے غلام قطب الدین ایبک نے اس ملک میں سب سے پہلی جو تاریخی عمارت بنوائی وہ "قطب مینار" ہے۔ (اگرچہ اس کی تکمیل اور مسجد "قوت الاسلام" کے

صدر دروازے کی تعمیر قطب الدین ایبک کا غلام جسے ایبک نے اپنا جانشین بنادیا تھا کرائی)۔ یہ عمارت فن تعمیر کا ایک ایسا نمونہ ہے جس میں اسلامی اور ہندو فن تعمیر کی مشترکہ خوبیاں موجود ہیں۔ اگر ایک طرف مذکورہ مسجد میں آیات قرآنی کندہ ہیں تو اس کے ساتھ ہی قدیمی مندر ہے۔ جس کی دیواروں پر ہندو اور جین مذاہب کے دیوی اور دیوتاؤں کی مورتیاں کندہ ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ صرف ایک تھی کہ جب مسلمانوں نے ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں قدم رکھا تو ان کی پوری سرزمین پر وہی لوگ نظر آئے جن کا تعلق ہندو، ہندوستانی تہذیب سے تھا۔ جن میں کاری گر، معمار اور سنگ تراش وغیرہ تھے۔ ایسے حالات میں یہ ممکن نہ تھا کہ ہندوستانیوں کی مدد کے بغیر مسلمان حکمراں حکومت چلاسکیں۔ نتیجتاً ہندو اور مسلمانوں نے مل کر ایک دوسرے پر بھروسہ کر کے ایک ملی جلی اور مشترکہ حکومت کی بنیاد ڈالی، اور جو کچھ بھی تعمیر ہوئی، اس میں دونوں مذاہب اور متفرق فرقہ کے لوگوں نے حصہ لیا۔ جب تاریخی عمارتوں کو بنانے اور انہیں خوبصورت طریقہ سے تعمیر کرنے کا سوال اُٹھا تب بھی مسلم اور ہندو دونوں نے مل کر اس کام میں حصہ لیا۔ جس کا اظہار اس طرح ہوا کہ مسلمانوں کے دور میں بنائی گئی مختلف عمارتوں، مسجدوں، قلعوں اور محلات میں مشترکہ تہذیب کے نمونے عیاں ہونے لگے۔ قوت الاسلام مسجد کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ اُوپر سے خمیدہ ہے۔ اس کے تین عظیم الشان دروازے ہیں۔ جن پر بڑی ہی خوبصورتی کے ساتھ آیات قرآنی کندہ ہیں۔ ساتھ ہی ۵ ویں صدی عیسوی کی گپتا دورِ حکومت کی ایک لوہے کی لاٹ بھی بیچ صحن میں کھڑی ہوئی ہے۔ جس پر سنسکرت میں راجہ چندر گپت اور ہند کی ماضی کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔ مسجد کے جنوبی برآمدہ کی چھت پر غور کرنے سے ہندو تہذیب اور آرٹ کا نمونہ دکھائی دے گا۔ چھت کی اوپر اندرونی حصہ میں بڑی ہی باریکی کے ساتھ صرف ہندوستان میں پائے جانے والے پھلوں اور پھولوں کی نقاشی کی گئی ہے اور تقریباً دس میٹر کی گولائی کے ساتھ کئی تہوں میں کھلا ہوا کنول کا پھول بنا ہوا ہے۔ دیوار کے مختلف حصوں میں زنجیر اور گھنٹیاں بنی ہوئی ہیں۔ دراصل اس طرح کی نقاشی اور کاریگری اس دور میں ہندوستان کے دیگر مندروں اور عمارتوں میں بھی پائی جاتی تھیں۔ مسجد کی دیواروں کے

باہری جانب وشنو، رادھا اور مختلف دیوی دیوتاؤں کے مجسمے صاف بنے ہوئے ہیں۔ مسجد میں داخل ہونے والی سیڑھیوں کی بناوٹ بھی مندروں کی سیڑھیوں کی طرز پر ہے۔ کچھ پتھروں کی ایک جانب کوئی رسم الخط میں آیاتِ قرآنی درج ہیں تو اسی پتھر کی دوسری جانب دیویوں کی تصاویر کھدی ہوئی ہیں۔۔۔۔ یہ تمام باتیں کسی کی آزاری کے لئے نہ تھیں بلکہ اس دور میں ہندو کاریگروں معماروں نے اپنے طور پر جو کچھ کہ وہ جانتے تھے، فن تعمیر میں پیش کردیا۔ اور مسلمانوں نے اسے محض ہندوستانی تہذیب کا ایک حصہ سمجھ کر قبول کرلیا۔

اسی طرح قطب مینار بھی چونکہ اسی عرصہ یعنی بارہویں صدی عیسوی کے اواخر کی بنی ہوئی عمارت ہے۔ اس میں بھی ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی بہت ساری علامتیں موجود ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی یہ کچھ ایسے ولی اللہ، صوفی، بزرگ اور درویش آئے جنھوں نے محض سچائی، ایمان داری، بھائی چارہ اور دوستی کا پیغام دیا۔ یہ ایک ایسا پیغام تھا جس کی وجہ سے ہزاروں بلکہ لاکھوں ہندوستانی مذہب و قوم کا خیال کئے بغیر ان کے مرید ہوگئے۔ اسی طرح کی ایک اور مثال اجمیر شریف کی ایک تاریخی عمارت " اڑھائی دن کا جھونپڑہ " سے بھی دی جاسکتی ہے۔ یہ عمارت ۱۳ ویں صدی کی دوسری دہائی میں شمس الدین التمش نے بنوائی تھی۔ یہ ایک مسجد ہے جس کی بنیاد ہندوستان کی چند ابتدائی عمارتوں کے ساتھ پڑی تھی، کہا جاتا ہے کہ التمش بادشاہ جب معین الدین چشتیؒ کی زیارت کے لئے اجمیر شریف گئے تو وہاں ایک ایسی عمارت کی بنیاد ڈالنی چاہی۔ جس سے ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کا اظہار ہوسکے۔ بادشاہ نے ڈھائی دن قیام کرکے اپنی خواہش کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا حکم صادر فرمایا اور اس طرح وہاں جو عمارت تیار ہوئی اس کا نام " اڑھائی دن کا جھونپڑہ " رکھا گیا۔

اس مسجد کی داغ بیل بھی مندروں کی طرزِ تعمیر پر رکھی گئی ہے۔ چونکہ اس کو بنانے والے بیشتر ہندو کاریگر تھے۔ اور وہ اسلامی طرزِ تعمیر سے ناواقف تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنے ڈھنگ کی عمارت تعمیر کردی۔ جس میں پتھروں پر کندہ شبیہوں کے ساتھ ساتھ اسلامی طرز اور آیات کلام اللہ بھی نمایاں ہیں۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مسلمان اور ہندو دونوں نے ایسی تاریخی

عمارتوں کو عقیدت اور تحسین کی نظر سے دیکھا اور آنے والے وقتوں کے لئے ایسی تمام تعمیری عمارتیں مشترکہ تہذیب کی علامت بن گئیں۔

دھیرے دھیرے خلجی، تغلق اور لودھی دورِ حکومت میں ریاستوں کی تعداد بڑھنے لگی اور ریاستوں میں، عمارتوں کی تعمیر کا کام ہونے لگا۔ مدرسے، مسجدیں، مسافر خانے، مقبرے، کنویں، باؤلیاں بننے لگے اور ان تمام عمارتوں پر مشترکہ تہذیب کا اثر نمایاں ہونے لگا۔ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ اور علاقے کے لحاظ سے بھی وہاں کی تاریخی عمارتوں کی تزئین ہونے لگی۔

مثال کے طور پر دکن میں بیجاپور، گلبرگہ، بیدر اور گولکنڈہ میں جن عمارتوں کی تعمیر ہوئی ان پر علاقائی چھاپ کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم تہذیب کا اثر بھی مشترکہ طور پر دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح بہار، بنگال، گجرات اور مہاراشٹر میں بنی ہوئی تاریخی عمارتوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو وہاں بھی مشترکہ تہذیب کی آمیزش کے ساتھ مقامی رنگ نمایاں ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ معمار اور کاریگر چونکہ مقامی انداز کے فن تعمیر سے واقف ہوا کرتے تھے۔ اس وجہ سے وہاں کی عمارتوں پر بھی وہی رنگ غالب رہا۔ لیکن چونکہ مسلمان بادشاہوں کی حکومت کم و بیش پورے ہندوستان میں پھیل چکی تھی، اس لئے ہندو مسلم طرزِ تعمیر کا ملا جلا انداز اپنایا گیا۔ چونکہ ہندوستان میں معماروں کا طریقۂ کار مندر، دھرم شالائیں اور سمادھی بنانے کے طریقہ پر تھا اس لئے انھوں نے اسلامی طرز کی عمارتوں میں بھی کم و بیش وہی طریقۂ کار اپنایا۔ لیکن چونکہ سرپرستی کسی مسلمان حکمران کی ہوتی تھی، اس لئے ہندو مسلم مشترکہ فن تعمیر اور تہذیب کی علامت بن کر وہ عمارتیں منظرِ عام پر آئی تھیں۔

چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں علاؤ الدّین خلجی بادشاہ نے ایک حکم جاری کیا کہ دارالسلطنت دہلی میں ایک ایسا تاریخی تالاب بنایا جائے، جس کی تعمیر میں ہندوستان کے سبھی مذاہب کے ماننے والوں کی مشترکہ محنت ہو۔ چنانچہ ملک کے کونے کونے سے ہندو، جین، بدھ اور مسلمانوں کو بلوا کر اس تالاب کی تعمیر کا کام شروع ہوا اور جب تالاب تقریباً چار سال کی مدت میں مکمل ہوا تو سب نے مل کر اس کے پانی کو استعمال کیا۔ یہ تالاب دہلی میں حوض خاص کے علاقے میں اب بھی موجود ہے۔ جو حوض خاص یا حوض علائی کے نام سے جانا جاتا ہے۔

مغلوں کے عہد تک آتے آتے مسلمان بادشاہوں کو ہندوستان میں تین سو سال سے زائد عرصہ ہو چکا تھا۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان کاریگر اور معمار خود ہندوستان میں موجود تھے۔ ایران، یورپ، عرب اور ترکی کی فن معماری کا طریقہ اور انداز ہندوستان میں بھی اپنایا جانے لگا تھا۔ محراب، مقبرے، قلعہ، مدرسہ، مسجدیں اور دیگر ہندو راجاؤں کے محل اور عمارتیں مختلف مذاہب کے ماننے والے کاریگروں کی کوششوں سے بننے لگی تھیں۔

بہت سے ہندو راجاؤں نے اپنے محلات کی تعمیر مسلمان معماروں سے اسلامی طرز کے طریقہ تعمیر پر بنوانے کا حکم دیا۔ گوالیار کے راجہ مان سنگھ نے ۱۶ ویں صدی کی ابتدا میں جو قلعہ تیار کروایا، اس میں ہندو مسلم طرز تعمیر کے ساتھ ساتھ یورپی اثر بھی صاف ظاہر ہوتا ہے۔ محرابوں وسیع وعریض دالان اور اونچے اونچے دروازوں کے ساتھ چمکنے اور رنگ برنگے ٹائلز بھی اس قلعہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان ٹائلز کو دیوار میں سجانے کی ابتدا ہندوستان میں ۱۵ ویں صدی میں یورپینی معماروں نے کی تھی۔

راجستھان کے بہت سے علاقوں خصوصاً جے پور، اُدے پور، بیکانیر، اور ڈیگ میں، ۱۷ ویں اور ۱۸ ویں صدی کے دوران جاٹ اور دیگر ہندو راجاؤں کا قبضہ تھا۔ انھوں نے اپنے عہد میں جتنے بھی قلعہ، محلات اور عمارتیں بنوائیں، ان سب کی طرزِ تعمیر خالص اسلامی طرز کی ہے۔ ان تمام عمارتوں کے دیکھنے سے ہندو مسلم مشترکہ تہذیب اور آپسی میل ملاپ کا کھُلا ہوا ثبوت ملتا ہے۔

مغلیہ عہد کی بعض عمارتیں تو پورے طور پر کئی مذاہب کی مشترکہ تہذیب کی عکاس ہیں۔ مثال کے طور پر فتح پور سیکری میں شہنشاہ اکبر کا بنوایا ہوا محل، مسجد بلند دروازہ اور خواجہ سلیم چشتی کا مقبرہ وغیرہ۔

اگر صرف وہاں کے محل کا جائزہ لیا جائے تو مشرقی جانب تو اکبر بادشاہ نے اپنی مسلمان بیوی کی خواب گاہ خالص ترکی اور مسلم طرزِ تعمیر پر کرائی ہے اور اس سے تھوڑی دور کے فاصلے پر ہندو بیوی جودھا بائی کے لئے جو رہائش گاہ بنوائی، اس کو مکمل طور پر ہندو طریقہ پر تعمیر کروایا۔ اس کے دروازے اور دیواروں پر پھل پھول، زنجیر اور گھنٹیاں منقش کروائیں۔ جگہ جگہ پر کلس

اور دیویوں کی شبیہ کندہ ہے۔ کمرہ کے ایک کونہ میں چھوٹا سا مندر بھی بنا ہوا ہے اور ساتھ ہی اس سے ملحق دالان میں کرشن، شیو اور رادھا کی تصاویر نہایت ہی دلکش انداز میں دیواروں پر بنی ہوئی ہیں۔ خود ایک جگہ پر شہنشاہ اکبر اور جودھا بائی کی تصویر دیوار پر نقش ہیں۔ محل کے صحن میں کئی منزل اونچی عمارت خالص ہندو طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عمارت کی بالائی منزل پر چڑھ کر جودھا بائی صبح کے وقت سورج کی پوجا کیا کرتی تھیں۔ اس دور کے مشہور گلوکار اور موسیقار تان سین کے لئے بھی کشادہ چبوترہ بنا ہوا ہے۔ جہاں بیٹھ کر تان سین گانے کی مشق کیا کرتے تھے۔ اسی طرح خواجہ سلیم چشتیؒ کی مزار کی چھت کو خوشبودار لکڑی اور سیپ سے بنایا گیا ہے جو اس دور میں خالص ہندو عمارتوں کی زینت ہوا کرتی ہے۔ مزار کی باہری دیوار یں سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ہیں۔ جس پر پھول اور پتّوں کی کاریگری کے ساتھ ساتھ سانپ کی شکل میں نقاشی کی گئی ہے۔

اکبر ہی کی بنوائی ہوئی ایک عمارت "سکندرہ" ہے جو آگرہ سے تقریباً ۱۱ کلومیٹر کے فاصلہ پر بادشاہ نے خود اپنے مقبرے کے لئے بنوائی تھی۔ اس کے جنوبی دروازے کے کنارے کنارے تینوں طرف سفید کالے اور کتھئی رنگ کے پتھر جڑے ہوئے ہیں اور وہ اس طرح سے نقش کئے گئے ہیں جن سے عیسائی، ہندو اور مسلمانوں کے مذاہب کی شناخت ہوتی ہے۔ اس طرح کی تاریخی عمارتوں کو دیکھ کر ایک ایسے ہندوستان کا تصور ابھرتا ہے۔ جو مشترکہ تہذیب کی علامت ہے اور یہاں ہزاروں کی تعداد میں ایسی عمارتیں موجود ہیں، جو مختلف مذاہب، مختلف تہذیبوں اور مختلف روایات کا سنگم ہے۔ اسی طرح دہلی کے لال قلعہ کے اندر ایک عمارت "موتی مسجد" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس مسجد کو مغل سلطنت کے آخری شہنشاہ اورنگ زیبؒ نے بنوائی تھی۔ یہ فن تعمیر کا بہت ہی خوبصورت نمونہ ہے۔ چھوٹی سی اس مسجد کی اندرونی دیواروں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو اس میں کنول کے پھول، دیگر ہندوستانی پھل پھول اور پتیاں اس طرح سے سنگِ مرمر پر تراشی گئی ہیں، جو بنیادی طور پر ہندو عمارتوں میں پائی جاتی تھیں۔ ساتھ ہی پوری مسجد میں کسی جگہ پر بھی آیاتِ قرآنی یا عربی و فارسی تحریر نہیں ملتی۔ جبکہ عام طور پر دوسری مسجدوں اور مقبروں وغیرہ میں قرآن مجید کی آیات کا لکھا جانا عام بات ہے۔ خصوصاً مسجد کے اندر ممبر کو

اس طرح پتھر تراش کر بنایا گیا ہے کہ بالکل ایک کھڑے ہوئے شیر کی شکل سے مشابہ ہے۔ اس طرح موتی مسجد کو بھی اگر مشترکہ تہذیب کی علامت سے تعبیر کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ خود لال قلعہ کے دیوانِ خاص میں جگہ جگہ ستونوں پر اس طرح سے مینا کاری اور نقاشی کی گئی ہے جس سے چین، جاپان، ترکی، عرب، ایران اور ہندوستان کی روایتی کاریگری اور تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔

اسی قلعہ میں تسبیح خانہ یا خاص محل کی شمالی محراب کے اوپر بھی سورج، شنکھ، زنجیر، گھنٹیاں اور کنول کے پھول کو ایسے حسین پیکر میں تراشا گیا ہے، جس سے ہماری مشترکہ تہذیب کا اظہار ہوتا ہے اور ایسی ہی نہ جانے اور کتنی تاریخی عمارتیں ہیں جو ہندوستان کے مختلف حصوں میں موجود ہیں، جن سے ہماری مشترکہ تہذیب کو تقویت اور فروغ ملتا ہے۔ ٭٭٭

مہرولی کا آہنی مینار

دلّی ہندوستان کا دارالسلطنت بھی ہے اور تاریخی، تہذیبی اور سیاسی اعتبار سے ایک اہم مرکز بھی۔ معتبر تاریخ داں اور ماہرین آثار قدیمہ دلی شہر کا تاریخی سلسلہ گزشتہ تین ہزار سال پرانی تہذیب سے جوڑتے ہیں۔ جبکہ سلسلہ وار عام طور پر اس کا رشتہ دسویں صدی عیسوی سے جا ملتا ہے۔ دلی اور خصوصاً مہرولی کے علاقہ میں کچھ ایسے پرانے بلکہ بہت پُرانے تاریخی نمونے ملتے ہیں جو بجا طور پر چوتھی صدی عیسوی کے ہیں۔ انھیں میں سے ایک اہم نادر نمونہ مہرولی کا آہنی مینار بھی ہے — یہ گپتا دور حکومت کا بنا ہوا ہے۔ لیکن عین گمان یہ ہے کہ دلی سے باہر کسی اور جگہ سے لاکر اس لوہے کے کھمبے کو لگ بھگ دسویں صدی عیسوی میں قطب مینار کے پاس مسجد قوۃ الاسلام کے صحن کے درمیان نصب کر دیا گیا تھا۔ اس خیال کی تائید اس بات سے بھی ہو جاتی ہے کہ اس عہد یعنی چوتھی صدی عیسوی کا اور کوئی بھی تاریخی نمونہ آس پاس کے کسی بھی علاقہ میں اب تک نہیں پایا گیا ہے — ایک روایت کے مطابق کہا جاتا ہے کہ راجہ اننگ پال دسویں صدی عیسوی میں مہرولی اور آس پاس کے علاقہ میں رہا کرتے تھے۔ وہ کسی غیر معروف جگہ سے اس آہنی مینار یا (Iron Pillar) کو اٹھا لائے تھے اور اپنے علاقہ لال کوٹ میں نصب کر دیا تھا۔ اننگ پال تومر خاندان کا ایک راجہ تھا اور ہندو مذہب کا سچا ماننے والا تھا۔

اس آہنی مینار پر سنسکرت زبان میں گپتا رسم الخط میں تحریر بھی کندہ ہے۔ اس تحریر سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کھمبے کا وجود اور ساخت و پرداخت چوتھی صدی میں راجہ گپتا کے ذریعہ سے ہوا تھا۔ سنسکرت تحریر سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ راجہ چندر گپت نے بھگوان وشنو کی یاد میں اس آہنی مینار کو کسی وشنو پد نامی پہاڑی کی چوٹی پر نصب کروایا تھا۔ اور اس پر اپنے دور حکومت کا جھنڈا لہرایا تھا۔ تاکہ لوگ چندر گپت کے عہد کو یاد رکھیں۔ اس لوہے کے مضبوط اور بہت ہی بھاری کھمبے کے اوپری حصہ پر ایک سوراخ بھی ہے۔ غالباً اس وجہ سے کہ کسی زمانے میں اس کھانچہ میں بھگوان وشنو کی مورتی نصب تھی ــــ موجودہ دور میں اس لوہے کے مینار کو قوۃ الاسلام مسجد کے صحن میں نصب دیکھ کر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بھلا مسجد کے صحن میں لوہے کے اس کھمبے کا کیا کام؟ وہ بھی جس پر سنسکرت زبان میں بھگوان وشنو کے بارے میں کچھ لکھا ہوا ہے؟ اس کا بہت سیدھا اور سمجھ میں آنے والا جواب یہ ہے کہ راجہ اننگ پال جس کو دلی کو پہلی بار آباد کرنے والا راجہ کہتے ہیں۔ اُس نے اپنے علاقہ لال کوٹ میں نصب کروایا تھا۔ اس عہد میں یعنی دسویں صدی عیسوی میں دلی کے کسی بھی حصہ میں مسلمانوں کی کوئی تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ پھر بارہویں صدی عیسوی میں جب شہاب الدین محمد غوری اور بعد کے مسلمان بادشاہ آتے تو انہوں نے بھی اس علاقہ کو اپنی آماجگاہ بنایا۔ قطب مینار اور دوسری عمارتیں بنوائیں۔ مسجد قوۃ الاسلام کو عین اسی جگہ تعمیر کروایا جہاں یہ لاٹ نصب تھی اور پرانی تہذیب کی علامت کے طور پر اس نادر آہنی مینار کو وہیں رہنے دیا۔ مسجد کے صحن میں ہندو عہد کی بنی ہوئی لوہے کی لاٹ جس پر گپتا سنسکرت میں تحریر موجود ہے ہندو مسلم اشتراکیت کی ایک واضح مثال ہے جو آج بھی قائم ہے اور دو مختلف نسلوں اور تہذیبوں کی آئینہ دار ہے۔ اس لوہے کی لاٹ کی مجموعی لمبائی سات اعشاریہ

بیس میٹر (۷٫۲۰) ہے۔ جس میں سے ۹۳ سینٹی میٹر زمین کے اندر ہے۔ اس کا اندرونی
حصہ پنجوں کی شکل کا بنا ہوا ہے۔ تاکہ زمین کی جڑوں میں اچھی طرح پیوست ہو سکے۔ زمین کے
اوپری حصہ پر ۳ میٹر کی گولائی لیتے ہوئے ایک ڈھکن کی شکل میں یہ گڑا ہوا ہے تاکہ انسانی
طاقت کے باوجود اس مینار کو ہلایا جا نہ سکے۔ مرزا سنگین بیگ نے اپنے فارسی قلمی نسخہ
سیر المنازل میں دلی کی تقریباً تمام تاریخی عمارتوں کا ذکر کرتے ہوئے ۱۸۲۱ء میں اس
آہنی مینار کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ مسجد قوۃ الاسلام کے صحن کے درمیان میں لوہے
کی ایک کیل ہے۔ اس کا تعلق رائے پتھورا سے مشہور کر دیا گیا ہے لیکن یہ غلط ہے چونکہ
اس زمانے میں گھڑیال نہیں تھا۔ اس لئے دن کے اوقات معلوم کرنے کے لئے اسے
بنایا گیا تھا ۔۔۔ گھڑیال کی ایجاد پہلی بار فیروز شاہ کے عہد میں ہوئی اور تب سے دنیا
میں اس کا رواج ہوا"۔۔۔ اس لوہے کی لاٹ کے بارے میں سنگین بیگ نے اختصار سے
کام لیا ہے اور اس کو گھڑیال کے طور پر دن کا وقت معلوم کرنے کا ایک آلہ بتایا ہے
یہ بات کسی حد تک قرین قیاس ہو سکتی ہے کہ کسی زمانے میں لوگ اس کو بطور گھڑیال کے
استعمال کرتے ہوں۔ مگر اس لوہے کے کھمبے پر لکھی ہوئی تحریر سے ایسی کوئی بات ظاہر
نہیں ہوتی ہے ۔۔۔ ہاں اس بات کا اندازہ ضرور لگایا جا سکتا ہے کہ لوہے کی یہ لاٹ
یا (Iron Pillar) گذشتہ سولہ سو سال پرانا ہونے کے باوجود تمام طرح کے موسموں کو
جھیلنے کے بعد بھی آج اسی طرح صاف شفاف دھات کا ایک اعلیٰ نمونہ پیش کرتا ہے جس پر زنگ یا
ٹوٹا پھوٹا کا ایک بھی نشان موجود نہیں ہے۔ اس سے گپتا عہد حکومت کی کاریگری کی فنی
صلاحیتوں اور دھات کی اشیاء کی اعلیٰ ترین بناوٹ کا پتہ ملتا ہے۔ آج بھی یہ آہنی مینار
قطب مینار کے پاس مسجد کے صحن میں نصب ہے۔ جو سیاحوں اور عام ناظرین کے لئے
ایک نادر نمونہ ہے۔

ہمارا قومی نشان

شمالی ہندوستان میں تاریخی اہمیت کی حامل ایک جگہ ہے جس کا نام سارناتھ ہے۔ بنارس سے تقریباً ۱۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر سارناتھ کو موریہ عہد حکومت سے مسلسل ایک تاریخی، تہذیبی اور مذہبی اہمیت حاصل رہی ہے — یہی وہ جگہ ہے جہاں بہ گوتم بدھ نے پہلی بار فلسفۂ حیات و موت اور بدھ مت یا مذہب کی اشاعت و تبلیغ کے لئے پہلا خطبہ دیا تھا۔ یہیں سے بدھ مذہب کی ترویج و توسیع ہوئی اور یہیں پر اس مذہب کی خانقاہیں، استوپ اور دھرم چکر پرورتن Dharma Chakra Parivartana یعنی مذہبی قوانین کے روایتی ڈھانچہ میں نمایاں تبدیلی کی بنیاد ڈالی گئی۔ اور یہی وہ جگہ ہے جہاں گوتم بدھ کے نروان کے لگ بھگ دو سو سال بعد یعنی آج سے دو ہزار سال سے بھی زیادہ پہلے سمراٹ اشوک نے عدم تشدد کے راستے پر گامزن ہو کر استوپ، خانقاہیں Monolithic Pillars یعنی پتھروں کو تراش کر مضبوط کھمبوں کی بنیاد ڈالی — انھیں میں وہ اہم کھمبا بھی یہیں پر ہے جس پر کبھی شاندار Lion Capital بھی بنا ہوا تھا، جو اب سارناتھ میوزیم میں محفوظ ہے، اور ہمارا قومی نشان بھی ہے۔ تیسری صدی قبل مسیح کا بنا ہوا Lion Capital بھورے رنگ کے پتھر پر تراشا ہوا موریہ عہد کی فن سنگ تراشی کا ایک ایسا نادر نمونہ ہے جس کی باریکی، نفاست اور متناسب قد و قامت نہ صرف اس دور کی فنی صلاحیتوں کی بلندی کا اظہار ہیں بلکہ سمراٹ اشوک کی پوری موریہ حکومت کا ایک اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اشوک استمبھ پر سجا ہوا

یہ قومی نشان (2.31 m) ۲ اعشاریہ ۳۱ میٹر اونچا ہے، اور نیچے سے اوپر کی طرف چار مختلف حصوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ پیچھے کا ایک حصہ ایک گھنٹی کی شکل کا ہے، جس پر کنول کے پھول اور پتوں کی کاریگری کی گئی ہے۔ اس کے بعد درمیانی حصہ ایک گول چوکی کی طرح بنا ہوا ہے۔ جس پر منا سب گولائی والے حصہ میں چار متحرک جانوروں کی شبہیں ہیں۔ ان میں سے ہر جانور یعنی ہاتھی، سانڈھ، گھوڑا اور شیر کے ساتھ ساتھ دھرم چکر کا ایک پہیہ ان میں سے ہر ایک کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ بالائی حصہ پر ایک ہی پتھر کے ٹکڑے پر تراشے گئے چار بیٹھے ہوئے شیر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا رُخ چاروں سمتوں کی طرف ہے۔ اور سب سے اوپری سطح پر تاج کی نمائندگی کرتا ہوا ایک پہیہ بنا ہوا تھا۔ جس پر ۳۲ گہرے نشان کھدے ہوئے تھے۔ جس کو "دھرم چکر" کہا جاتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق [illegible] میں محمود غزنوی نے سارناتھ پر حملہ کے دوران اس LION CAPITAL کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کی اور متواتر ضرب سے اس کا دھرم چکر ٹوٹ کر گر پڑا تھا۔ [illegible] میں سر جان مارشل نے سارناتھ میں کھدائی کے دوران اس کے بیشتر حصوں کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ اور اس کے ٹوٹے ہوئے کچھ ٹکڑے آثار قدیمہ کے سارناتھ میوزیم میں اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر اس LION CAPITAL یا ہمارے قومی نشان کو ہر دور میں فن سنگ تراشی کا ایک شاہکار کا مرتبہ عطا کیا گیا ہے۔ اس پر بنے ہوئے مختلف نشانات کی مفروضاتوں کے طور پر وضاحت کی گئی ہے۔ لیکن سب سے واضح اور نمایاں تشریح کچھ اس طرح کی گئی ہے۔ کہ اس پر بنا ہوا دھرم چکر DHARM CHAKRA بدھ مذہب کے قوانین اور مذہبی اصول کا اظہار ہے ــــ اور اس پر بنے ہوتے چار چنگھاڑتے ہوئے شیروں کا مطلب دنیاوی لذتوں سے پرہیز کی تلقین اور خوف زدہ رہنے کی طرف اشارہ ہے۔ ان شیروں کا ہر چہار سمت منھ کئے ہونے کا مطلب بھی یہی ہے کہ پوری دنیا میں ہر سمت خوف و ہراس اور وحشت ہے، اس سے فرار ممکن نہیں ــــ اور چار متحرک جانوروں کی نمائندگی اس بات کی علامت ہے کہ دنیا چاروں مادی حصوں میں بٹی ہوئی جو الگ الگ طاقتوں کا اظہار ہے۔ اس کی مزید وضاحت گوتم بدھ کی مذہبی اصولوں پر مبنی کتاب میں بھی کی گئی ہے، اور نیچے کی طرف گول

دائروں میں بنے ہوئے کنول کے پھول اور پتے تخلیق اور زندگی کی علامت ہیں۔ دراصل پتھر پر تراشے ہوئے اس نشان کی فنی خوبیوں پر اگر نظر دوڑائی جائے تو اس عہد کی دست کاری، سنگتراشی اور کاریگروں کی صلاحیتوں کے اعلیٰ ترین مزاج کا پتہ چلتا ہے، اور اگر اس پر بنے ہوئے نقوش کا نفسیاتی، سماجی اور مذہبی جائزہ لیا جائے تو موّرخوں، دانشوروں اور ادیبوں کے خیال میں ہر نقش کی خاصیت مذہب اور فلسفہ کے اظہار کی ایک علامت ہے۔ مجموعی طور پر یہ نشان مذہبی، سیاسی، سماجی، تاریخی اور فنی خوبیوں کا ایک اعلیٰ ترین اظہار ہے، جو آج ہمارے ہندوستان کا قومی نشان ہے۔ ہمیں اس کی تاریخی اہمیت کا علم رکھنا چاہیئے۔ اور نیشنل ایمبلم یعنی قومی نشان کی حیثیت سے اس کا احترام بھی کرنا چاہیئے۔

ہندو مسلم فنِ تعمیر کے خصوصی پہلو

ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں کی آمد کے بعد سے مختلف فنونِ لطیفہ اور فنِ تعمیر کے خصوصی پہلوؤں کا مشترکہ اظہار ہوتا ہے اور آرٹ و آرکیٹکچر میں ایک نئے اور انفرادی باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس سے فنِ تعمیر میں نہ صرف کچھ نئے ضابطے اور طریقے سامنے آئے بلکہ سماجی اور مذہبی زندگی کے پیشِ نظر ایک نیا آرٹ ابھر کر ہندوستان کی سرزمین پر نمودار ہوا۔

ہندو، بدھ یا جین فنِ تعمیر کا طریقہ یہ تھا کہ کسی بھی عمارت کو بناتے وقت تعمیراتی ڈھانچہ، چھتوں پر شہتیر اور ستونوں میں اینٹ یا پتھر کے مسلسل عروج کے ساتھ تیار کیا جاتا تھا اور ایک کاربل (! Corbel :) کی سی شکل سامنے آتی تھی اور سارا کا سارا عمل اس انداز کا ہوتا تھا کہ سطح سے بلندی کی طرف متواتر عمارت چوڑائی سے تنگ ہوتی چلی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ عمارت کا بالائی حصہ صرف ایک پتھر کے تختہ سے ڈھکا جاسکتا تھا۔ اس طرح کا فنِ تعمیر مندروں کے لئے خاص تھا۔ ہندو طرز کی بنائی ہوئی عمارتوں میں دیوی دیوتاؤں کی شبیہیں، زنجیر اور گھنٹیاں نیز کنول، ناریل اور شنکھ کی بھی نمائندگی ہوتی رہی ہے۔ عام طور پر ہندوستانی طرز کی بنی ہوئی عمارتوں کی چھتیں سیدھی ہوا کرتی تھیں۔ جن کو شہتیر کے ذریعہ روکا جاتا تھا اور چھت کے اندرونی حصہ میں کنول کے پھول وغیرہ سے نقاشی کی جاتی تھی۔ اس کا مذہبی پہلو یہ تھا کہ مندروں کی تعمیر

میں عقیدت مندوں کی آمد یکے بعد دیگرے ہوا کرتی تھی۔ لہذا مندر کے دروازے نسبتاً تنگ اور چھوٹے ہوا کرتے تھے اور مندر کے اندر کا حصہ بھی ایک چھوٹے سے چبوترے پر مبنی ہوتا تھا۔ جہاں بیک وقت بہت سے لوگوں کا اجتماع تو ممکن نہ تھا، مگر مندر کی ضرورت کے مطابق عقیدت مند تھوڑی تعداد میں آتے اور واپس چلے جایا کرتے تھے۔ مندر کے اندر جہاں مورتی رکھی جاتی اس کو "گربھ گرہا" کہا جاتا اور جہاں بیٹھ کر پجاری بھگوان کی پوجا کرتا اس کو "منڈپ" کہا جاتا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں مندروں اور بعض دوسری عمارتوں کی شکل ایک مخصوص طرزِ تعمیر کی مظہر ہے ـــ جس کو آرکیولوجی کی اصطلاح میں "ہندو فنِ تعمیر" کہا جاتا ہے۔

مسلم فنِ تعمیر کی داغ بیل اسلامی ضروریات کے پیشِ نظر ظہور پذیر ہوئی۔ اسلام کا تقاضا تھا کہ پانچ وقت کی نمازِ باجماعت کا اہتمام کیا جائے۔ وضو کی آسانیاں فراہم کی جائیں۔ خطبہ اور ممبر نیز امام کے لئے معقول جگہ ہو۔ نمازیوں کے لئے کشادہ اور وسیع جگہ ہو، تاکہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جاسکے۔ ہر مسجد کی تعمیر اس طرح کی جائے کہ اس کا رُخ کعبہ یعنی مغرب کی طرف ہو نہ صرف یہ بلکہ ہندو اور اسلامی طریقہ کے مطابق مردہ کی تجہیز و تکفین کے طریقہ بھی جُدا جُدا تھے۔ مسلمان طریقہ کے مطابق مقبروں اور مزاروں کا وجود ہوا۔ گنبد اور درگاہیں بنائی گئیں جبکہ اس سے پہلے ہندو طرزِ تعمیر میں ایسی باتوں کی چنداں ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ حالانکہ اسلام کی بالکل ابتدائی عمارتوں کو دیکھ کر یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت نہ تو کوئی گنبد تھا اور نہ ہی کوئی مینار اور نہ ہی اس وقت تک اسلامی فنِ تعمیر کے کچھ اصول مرتب ہوئے تھے۔ کیوں کہ اگر اسلام کی سب سے پہلی عمارت "خانہ کعبہ" کو دیکھا جائے تو صرف ایک چوکور اور مساوی انداز کی بنی ہوئی عمارت ہے لیکن جوں جوں اسلام پھیلتا گیا، ایک نیا اور منفرد فنِ تعمیر بھی عالمِ وجود میں آنے لگا۔

ہندو فنِ تعمیر میں عمارتوں کے اندر و باہر دیواروں اور چھتوں کو مزین کرنے کے لئے دیسی پھل و پھول اور دیوی و دیوتاؤں کی شبیہیں بنائی جاتی تھیں، مگر اسلام کے

نقطۂ نظر سے اس طرح کی تمام زندہ شبیہوں کو حرام قرار دیا گیا۔ نتیجے کے طور پر اسلامی عمارتوں کی تزیین کے لئے پھول پتیوں کے علاوہ قرآنی آیات اور عربی و فارسی کی تحریروں کو ان پر پیش کیا جانے لگا۔ جس سے حسن و خوبصورتی کے ساتھ ساتھ فن تعمیر میں ایک نئے اظہار کا طریقہ رائج ہونے لگا۔۔۔۔ ہندو فن تعمیر کی یہ خصوصیت تھی کہ ان پر ابھرے ہوئے انداز میں تصاویر اور مجسمہ بنائے جاتے تھے مگر اسلام کے طریقہ کے مطابق پلاسٹر کی ہوئی دیواروں اور محرابوں پر (Low Relief) یعنی پلاسٹر پر کھدائی کے ذریعہ نقاشی کی جانے لگی۔۔۔۔ اب عمارتیں پہلے کی طرح اونچائی کی طرف پتلی نہیں ہوتیں بلکہ پورا ڈھانچہ سطح سے بلندی کی طرف اور بھی زیادہ چوڑا ہوتا جاتا اور کبھی چوکور کبھی ہشت پہل اور کبھی ایک دائرے کی شکل میں نمودار ہوتا جاتا۔ ہندو فن تعمیر میں چونے کا استعمال نسبتاً کم ہوتا تھا مگر اسلامی طرز کی عمارتوں میں چونے کو اہمیت دی گئی۔ اور اس طرح گارے اور چونے کی مدد سے نہ صرف چنائی کا کام ہونے لگا بلکہ چونے، گوند اور رنگ کے میل سے دیواروں پر پلاسٹر کا کام بھی کیا جانے لگا۔۔۔۔ اسلامی طرز کی تعمیر ابتدائی عمارتوں پر ہندو اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بسا اوقات ہندو طرز پر عمارتیں بنانے والے کاریگروں کی مدد سے ہی عمارت بنوائی گئی جن پر ہندو آرکیٹکچر کے آثار نمایاں ہیں۔ مگر دوسرے مرحلہ میں جب ہندوستان میں اسلامی آثار نے اپنی ایک پہچان بنالی تو مکمل اسلامی ضابطوں پر عمارتوں کی تعمیر ہونے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ "قطب مینار" "مسجد قوۃ الاسلام" اور "اڑھائی دن کا جھونپڑہ" جیسی ابتدائی دور کی بنی ہوئی عمارتوں پر جب نظر ڈالی جائے تو ان میں نہ تو محراب ہیں نہ گمبد ہیں صرف دیواروں و چھتوں پر فنِ خطاطی کے بہترین نمونے ہی ملیں گے۔۔۔ اس دوسرے دور کی بہترین مثال دلی کا "علائی دروازہ" ہے۔

دھیرے دھیرے ہندو اور مسلم مشترکہ تہذیب کے ملاپ سے ایک نیا اور منفرد فن تعمیر ابھر کر سامنے آیا جس میں ہندو اسلامی فن تعمیر کا اظہار ہوا۔ ایسی عمارتوں میں کچھ طریقے تو ہندو طرز تعمیر سے لئے گئے اور کچھ اسلامی انداز کے اور ایک ایسا ڈھانچہ

سامنے آیا جسے ہند اسلامی فن تعمیر کا نام دیا گیا۔ ہندوستان کی سرزمین پر ایسی بہت سی عمارتیں بننے لگیں جن کے کاریگر تو اسی ملک کے ہوتے۔ وہ عمارت کا ڈھانچہ اور بنیاد ہندو فن تعمیر کے انداز پر رکھتے، مگر عمارت کے ابتدائی نقوش مرتب ہو جانے کے بعد اس میں اسلامی انداز کی آمیزش کی جاتی۔ گنبد، محراب اور فن خطاطی کے استعمال سے ان کو ایک انفرادی شکل دی جاتی۔

پھر دورِ سلطنت یعنی سنہ ۱۱۹۳ء سے سنہ ۱۵۲۶ء تک کی عمارتوں میں تھوڑے بہت ردّ و بدل کے ساتھ عام طور پر عمارت کا ڈھانچہ یا تو چوکور رہا ہے، اور یا مندر کے طریقہ پر عمارت کی ساخت سطح سے بلندی کی طرف قدرے تنگ ہوتی چلی گئی ہے۔ مثال کے طور پر تغلق عہد کی بعض عمارتیں اور مقبرے اس انداز پر تعمیر ہوئے ہیں کہ ان پر نقاشی کے لئے چونے کا وافر استعمال کیا گیا ہے اور اس کے پلاسٹر پر رنگ کی آمیزش سے پھول پتیوں کے علاوہ فن خوشنویسی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ عام طور پر سرخ اور بھورے رنگ کے پتھروں کا استعمال ہوا ہے۔ اینٹ کو بہت کم استعمال کیا گیا ہے۔ اور ہندو فن تعمیر کے بنیادی ڈھانچہ کے آپسی میل سے عمارتوں کی تعمیر ہوئی ہے۔ لیکن مغل دور کے ہندوستان میں آتے ہی سنہ ۱۵۲۶ء کے بعد سے اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں بادشاہوں کے زمانے میں بنی ہوئی عمارتوں میں سنگ مرمر، محرابوں میں کاریگری اور قیمتی پتھروں کو دیواروں میں چسپاں کر کے پچہ کاری اور مینا کاری کا کام ابھر کر سامنے آیا۔ دوہرے گنبد کا وجود ہوا۔ چارباغ پیرایہ میں عمارتوں یا مقبروں کی تعمیر ہونے لگی۔ اس طرح کی بہترین عمارتوں میں سے "آگرہ کا قلعہ "سکندرہ" دلی کا ہمایوں کا مقبرہ یا تاج محل بہترین مثالیں ہیں — اس کے علاوہ کچھ ہندو راجاؤں نے بھی اسلامی فن تعمیر سے متاثر ہو کر جو عمارتیں بنوائیں ان میں بھی ہندو مسلم مشترکہ طرز تعمیر کا اظہار ہونے لگا۔ فارسی رسم الخط میں لکھے ہوئے فن خطاطی کے نمونے، "مینا کاری اور پچہ کاری" کا کام سامنے آنے لگا۔ جس کی بہت ساری مثالیں راجستھان کے "ڈیگ" بھرت پور، جے پور، جودھ پور، اور

گجرات و مدھیہ پردیش کے بہت سارے علاقوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔
مختصر یہ کہ ہندو طرزِ تعمیر کا خاصّہ یہ تھا کہ اُن کی عمارتیں مساوی اور کد مبرگہ طریقہ
(Pyramidal) پر بنی تھیں اور ڈھانچہ بلندی کی طرف پتلا ہوتا جاتا تھا۔
اور دروازے، کھڑکیاں یا چوکھٹ سیدھی یا پوتیکا (CORBEL) انداز کی ہوتی
تھیں۔ اور دیواروں پر مورتیاں اور پھل و پھول وغیرہ اُبھر کر سامنے نظر آتے تھے۔
جبکہ اس کے برعکس اسلامی فنِ تعمیر میں محراب کا تعارف کرایا گیا۔ چوکور اور بلند و وسیع
عمارتیں بنائی گئیں اور اونچے اور عظیم الشان دروازوں کا وجود ہوا۔ گنبد اور پھر دوہرے
گنبد کا چلن عام ہو گیا اور خاص کر فنِ خطاطی کو عمارت کی خوبصورتی کا اہم ذریعہ بنایا گیا۔

ریڈیو فیچر!

قطب کے احاطے کے آثار قدیمہ

تاریخ انسان کا ماضی ہی نہیں، تہذیب کی ایک داستان بھی ہے۔ تاریخ کا یہ ارتقائی سفر بہت طویل ہے ——— (موسیقی) عہد قدیم ہی سے اس ملک کو پوری دنیا میں ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ لیکن، عہد وسطیٰ میں دلّی کو خصوصی طور پر تہذیب، تمدن، آرٹ، کلچر، اور دوسرے فنون لطیفہ کے فروغ میں شمار کیا جانے لگا تھا ——— یہ وہ زمانہ تھا جب ۱۲ ویں صدی کے اواخر میں دلّی کی سرزمین پر ایک ایسی انقلاب برپا کر دینے والی ہستی نے اپنا قدم جمالیا تھا جو ۱۱۹۲ء میں کئی ہزار فوجی لشکر، صوفی بزرگ اور عالمان علم و فن کی رفاقت میں مہرولی کے قرب و جوار میں اپنا پڑاؤ ڈال دیتی ہے ——— اس علاقے کو اپنا جائے مسکن اور سرزمین کو اپنا وطن تسلیم کر لیتی ہے۔ (موسیقی ..... قافلہ اور لشکروں کے چلنے کی آواز)

اس سرزمین پر صدیوں بلکہ ہزاروں سال پرانی تہذیبوں کے نشان آج بھی کسی نہ کسی شکل میں اپنے شاندار ماضی کی داستان دہرا رہے ہیں ——— ایک حسین دلفریب دلکش اور دلربا داستان، غم زدہ، غم گین، پریشان کن، اور نصیحت آمیز داستان۔ داستانوں کا یہی سلسلہ ہندوستان کی تاریخ میں دلّی کو زمانۂ قدیم کے سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی رشتوں سے جوڑتا ہوا آج بھی آمادۂ سفر ہے۔

(موسیقی کے ساتھ آبشار کی آواز)

دلی ہندوستان کا دل بھی ہے اور ہندو مسلم، سکھ عیسائی اور بہت سے دوسرے مذاہب کی مشترکہ میراث بھی ——— تومر اور راجپوت راجاؤں نے اس کے ماتھے پہ چاند سا جھومر سجایا۔ ترکی النسل کے مسلمانوں نے اس سرزمین پر دوزانو ہو کر سجدہ ریزی کی۔ اور مشترکہ تہذیب کے ایک ایسے نقش کا مظاہرہ کیا جس کی دیدہ زیب اور حسین ساخت و پرداخت سے نہ صرف ہندوستان بلکہ پورا عالم کون و مکان اس علاقہ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر نظریں جمانے لگا۔

صدیوں پرانا یہ شہر آج بھی، جنوب کی جانب مہرولی کے بوسیدہ کھنڈرات میں آثار قدیمہ کی دھندلی اور کہیں روشن شکل میں تاریخ کے آٹھ سو سالہ سفر کی کہانی سنا رہا ہے ——— ایسا لگتا ہے پتھر اور گارے کی بنی ہوئی یہ تاریخی عمارتیں بے جان، بے حس اور ساکت و جامد شئے نہیں بلکہ ایک ایسی زندہ حقیقت ہیں جن کی زبان سے نکلنے والی آواز نقاروں کی گونج پر یہ کہتی سنائی دے رہی ہوں ؎

مجھ کو تاریخ کے قصوں میں نہ ڈھونڈو لوگو
میں حقیقت ہوں، مجھے آنکھ سے دیکھا جائے

مہرولی کے آثار قدیمہ، اپنی انفرادی شناخت کے ساتھ آج بھی ایک زندہ حقیقت کی شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان تاریخی عمارتوں کا ایک طویل سلسلہ دور تک پھیلا ہوا آج بھی دکھائی دیتا ہے۔

راجہ اننگ پال ہو یا پرتھوی راج چوہان، قطب الدین ایبک ہو یا شمس الدین التمش ان میں سے ہر ایک نے اپنے دور کے تہذیبی اور تعمیری رجحانات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ جس کا نمایاں اثر یہ ہوا کہ قلعے مندر، تالاب، محل، مسجدیں، مقبرے اور مینارے عالم وجود میں آنے لگے۔

مہرولی کے اس طویل و عریض کینوس پر جس حصہ کو خصوصی اور نمایاں اہمیت حاصل ہوئی اسے احاطۂ قطب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے ——— مجموعی طور پر بھی وہ جگہ ہے جہاں سے مسلمان بادشاہوں نے اپنی حکومت کا آغاز کیا۔ دہلی کو اپنا پایۂ تخت قرار اس

حصّہ کو اپنی آماجگاہ بنایا ___ اور بہت جلد ایک ایسی سیاسی اور تہذیبی و تعمیری مرکزیت بخشی جس کی بنا پر یہ خطہ علم پروری اور ادب نوازی کا گہوارہ تصور کیا جانے لگا۔

بغدادِ ہند، دار البرکت، اور دار المعارف جیسے معزز خطابات سے نوازا جانے لگا۔ اور پورا دلّی شہر، اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ احاطۂ قطب میں مخصوص ہو گیا۔ گویا دریا کو کوزے میں سمیٹ لیا گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب یہاں مسلمانوں کی آمد آمد تھی۔ اس سرزمین پر ایک نئی تہذیب، ایک نیا طبقہ جڑیں مضبوط کر رہا تھا۔ ایسے میں سیاسی اور سماجی تقاضوں نے دوستی اور تعاون کی ایک نئی فضا کو جنم دیا ___ رفتہ رفتہ دو منفرد اور مختلف تہذیبیں ایک دوسرے کے مزاج سے ہم آہنگ ہوتی گئیں جس نے بہت جلد ہند اسلامی مشترکہ تہذیب کی داغ بیل ڈالی۔

زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ وہ سماجی ہوں یا مذہبی، عادات و رسومات ہوں یا فن اور ادب، فاتح مفتوح ہر ایک نے ایک دوسرے کو بجا طور پر متاثر کیا اور ہندوستانی تاریخ کا ایک نیا باب قطب کے حلقہ میں مرتب کیا جانے لگا ___ جس کی ابتدا مسجد قوۃ الاسلام کی تعمیر سے ہوتی ہے۔

ابھی بارہویں صدی عیسوی نے اپنی آخری دہائیوں میں قدم رکھا تھا کہ سلطان شہاب الدین محمد غوری کی سرکردگی میں اُس کے سپہ سالار اعظم، قطب الدین ایبک نے ۱۱۹۲ء میں پرتھوی راج چوہان کو شکست دے کر قلعہ رائے پتھورا کے پورے علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ پوری دلّی میں فتح کا جشن منایا گیا (شہنائی) کامیابی کی خوشی میں سلطان کے نام کا ایک سکّہ جاری کیا گیا۔ جس پر لکشمی دیوی کی شبیہ اور محمد بن سام بادشاہ کا نام ناگری رسم الخط میں کندہ کر دیا گیا۔

اُسی سال ایک ایسی جامع مسجد کی تعمیر کا حکم صادر فرمایا گیا جو نہ صرف فن معماری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہو بلکہ اس کی پہچان بھی منفرد اور یکتائے زمانہ ہو۔

اور اس طرح ہند و مسلم فن تعمیر کی ابتداء، قطب الدین ایبک کے ذریعہ اُس جامع مسجد

کی تعمیر سے ہوتی ہے جسے عرف عام میں "مسجد قوۃ الاسلام" کے نام سے جانا جاتا ہے۔
ابھی اس عظیم الشان مسجد کی بنیاد دہرول کے علاقہ میں ڈالی جارہی تھی۔ اس وقت کے ماہر اور فنکار ہندو معماروں نے بھی مسجد کی داغ بیل ڈالنے میں ہاتھ بٹایا۔ شکستہ اور منہدم عمارات کے ملبے سے اس کی ساخت و پرداخت کی۔

ہندوستان کی سرزمین پر ابھی مسجد کا تصور نیا اور اجنبی تھا۔ یہاں کے کاریگر مسجد بناوٹ کے اصولوں سے ناواقف تھے۔ اور ایک نیا اور انوکھا طرز تعمیر سامنے آ رہا تھا۔ اسی لئے ہندو طرز تعمیر کے ڈھانچہ پر اس مسجد کی تعمیر ہونے لگی۔

۱۱۹۸ء کے آس پاس جب مسجد قوۃ الاسلام مکمل ہوئی تو ایک طرف اس کی دیواروں، ستونوں، اور چھتوں پر خالص ہندو تعمیری اثرات دکھائی دے رہے تھے۔ کنول کے پھول، زنجیر، گھنٹیاں، اور دیوی دیوتاؤں کے نقوش ابھرے ہوئے تھے۔ تو دوسری جانب مسجد کی محرابوں اور دروازوں پر آیات قرآنی اور کلمات طیبہ سجے ہوئے تھے۔

اس طرح پوری ہندوستانی تاریخ میں یہ پہلی عمارت ہے جسے ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کی علامت کہا جا سکتا ہے۔ اس مسجد پر ابھرے ہوئے حروف میں لکھے ہوئے فن خطاطی کے نمونے اس کے حُسن کو دوبالا کرتے ہیں۔

مسجد کے شمالی دروازے کی محراب پر یہ عبارت، خط کوفی اور نسخ میں کچھ اس طرح لکھی ہوئی ہے:-

بسم اللہ الرحمن الرحیم ___ واللہ یدعوا إلی دارِ السلام و یَہدی مَن یشاءُ إلی صراطِ المُستقیم ___ ھذاہِ العمارات العالی أمر السُلطان العظیم، المعُزّ الدنیا والدین ___ محمد بن سام ناصر امیر المومنین، فی شھورِ إثنی و تِسعین وخمسة مِائة۔

قرآنی آیات کے بعد، کتبہ کا ماحصل یہ ہے کہ یہ عمارت محمد بن سام کے حکم سے ۱۱۹۵ء

یعنی سنہ ۱۱۹۵ء میں تعمیر ہوئی ۔۔۔

قطب الدین کے عہد کی قابل ذکر عمارت، وہ مینار ہے جو اب "قطب مینار" کے نام سے دنیا بھر میں مشہور ہے ۔۔۔ فن تعمیر کا یہ ایک ایسا نادر نمونہ ہے جس کا مقصد ایک طرف تو یہ تھا کہ ہندوستان میں ایک ترکی نژاد بادشاہ کی آمد کا اعلان ہو جائے۔ پرچم اسلام کو روشناس کرایا جائے اور ساتھ ہی اذان کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے اس کی اونچائی پر چڑھ کر خدا کے بندوں کو نماز کی دعوت دی جائے۔

اذان .... !

بلندیوں کو چھونے والا اور آسمان سے باتیں کرتا ہوا یہ مینار آج بھی اُسی طرح زمانے اور حوادثات کی ستم ظریفیوں کے باوجود اپنی جگہ پر ثابت قدمی سے ڈٹا ہوا ہے۔

یہ مینار ساڑھے ۷۲ میٹر اونچا، اور ساڑھے ۱۴ میٹر گولائی کے نقشہ کے ساتھ چوڑا ہے۔ جس کی آخری منزل تک ۳۷۹ سیڑھیاں جاتی ہیں۔

بھورے رنگ کے پتھروں سے جتی ہوئی یہ عمارت ایک ایسا شاہکار ہے جس کی کاریگری کو دیکھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اُس کا تناسب اس کی صناعی، اس کی گولائی، اس کی اونچائی، اُس کے چھجّے، اور اس پر ابھرے ہوئے عربی حروف، نہ صرف قطب مینار کو آثار قدیمہ کا ایک ایسا انمول نمونہ ثابت کرتے ہیں بلکہ پورے ہندوستانی فن تعمیر کے ارتقائی سفر میں ایک سنگِ میل کا درجہ عطا کرتے ہیں۔

قطب الدین ایبک کا دَور یوں تو اس مینار کی تکمیل کے ساتھ اپنے تدریجی مراحل طے کرتا ہوا سنہ ۱۲۱۰ء میں ختم ہو گیا۔ مگر ابھی فن تعمیر کا اور بھی مظاہرہ ہونا تھا۔ ابھی نگاہ وقت کو ایسے انسانوں کا انتظار تھا جو مہرولی اور خصوصاً قطب کے علاقے کو اپنی فنکارانہ وسعتوں سے مالا مال کرے۔

چڑیوں کے چہچہانے کی آواز

وقت آگے بڑھا، اور ایک نئی و خوشگوار صبح نے سلطان شمس الدین التمش کے ہاتھوں

میں حکومت کی باگ ڈور پکڑ وادی ـــــ یہ سنہ ۱۲۱۱ء کا زمانہ تھا جب بادشاہِ وقت نے خطۂ قطب ہی کو اپنا محور اور مرکز بنایا۔ مسجد قوۃ الاسلام یا قبۃ الاسلام کی تعمیر کا کام مکمل کیا۔ اُس کے احاطہ اور صحن کو وسیع کیا، اس کی چہار دیواری کی تعمیر کروائی۔ اور صحن کو اتنا وسیع اور کشادہ کر دیا کہ قطب مینار مسجد کے احاطہ میں شامل ہو گیا ـــــ دیواروں اور محرابوں پر اسلامی طرز کی نقش و نگاری کروائی، اور خود اپنی زندگی میں اپنے مقبرے کی تعمیر کروائی ـــ یہ مقبرہ سرزمین ہند پر ہشت پہل طرز کی ایک ایسی عمارت کی شکل میں نمودار ہوا جس میں پہلی بار گنبد کا تصوّر سامنے آیا۔

شمس الدین ایلتمش کے مقبرے کی دیواروں کا اندرونی حصّہ ہندوانداز کی نقاشی اور اسلامی طرز کی بیل بوٹیوں سے اس قدر زیادہ آراستہ ہے جسے دیکھ کر غزنہ اور بغداد کی عمارتوں کی جھلک نمودار ہونے لگتی ہے۔ اس منتظم، فن شناس اور لائق بادشاہ کے عہد میں قطب مینار کی توسیع کا کام بھی ہوا۔

التمش وہ قابل اور دانشور بادشاہ تھا جس نے قطب کے احاطہ میں پہلی بار، دینی مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور اُسے "مدرسۂ معزی" کا نام دیا۔

(موسیقی ... ... مدرسہ میں پڑھائی کی آواز)

یہاں صَرف، نحو، فقہ، اصول، حدیث تفسیر، حکمت و فلسفہ کے علاوہ حافظِ قرآن کے لئے علٰحدہ شعبے تھے۔ فنِ خطاطی اور تاریخ نویسی کی با قاعدہ تعلیم و تدریس کا کام ہوتا تھا ـــــ ترکی، عربی، فارسی اور بعض دوسرے زبان و ادب کی طرف بھی خاطر خواہ توجہ دی جاتی تھی۔

اس مدرسہ میں طالبان علم و فن کثیر تعداد میں شریک ہوتے تھے۔ اس مدرسہ کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ نو مسلموں کی لسانیاتی ضرورت کو پورا کیا جائے، اُن کو قرآن کی تعلیم دی جائے، اور سرکاری عہدوں پر معمور ملازموں کی تہذیبی پرورش کی جائے۔

قطب کے علاقے میں جو بھی تعمیرات ہوئیں ان میں ہند اسلامی اشتراک عمل سے ایک نیا فنِ تعمیر وجود میں آیا۔ جو آگے چل کر ماہرینِ آثارِ قدیمہ اور مؤرخین کے لئے تحقیق

کا نیا اور دلچسپ موضوع بنا۔

(موسیقی)

سلطان التمش کے دور کے مشہور مؤرخ اور عالم، منہاج بن سراج ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ، ایک دفعہ، ایک سوداگر بادشاہ کے دربار میں ایک سو غلام فروخت کرنے کی غرض سے لے کر حاضر ہوا۔ سلطان نے سوائے ایک کے باقی تمام غلام خرید لئے۔ بچے ہوئے غلام نے بادشاہ سے سوال کیا کہ، آپ نے یہ سارے غلام کس کے لئے خریدے ہیں ؟۔
جواب ملا کہ اپنے لئے ـــــ بچہ نے پھر درخواست کی کہ آپ مجھے، اللہ کے لئے خرید لیجئے۔
اور اس طرح یہ نحیف، چھوٹا، اور بدصورت غلام بچہ سلطان شمس الدین کے دربار میں داخل ہوا۔
اور یہی بچہ اپنی ذہانت اور محنت سے آگے چل کر، غیاث الدین بلبن کے نام سے دہلی کے تخت پر فائز ہوا۔

بلبن نے اپنے دورِ حکومت میں یوں تو قطب کے احاطہ میں کوئی نیا تعمیری کام نہ کیا مگر موجودہ عمارتوں کی مرمت اور دیکھ بھال بڑی ذمہ داری سے کی۔
۱۲۸۰ء کے قریب اُس نے ایک محل کی تعمیر کروائی جو اب منہدم ہو چکا ہے۔ لیکن کہیں کہیں اس کے آثار آج بھی نمایاں ہیں۔
ان کھنڈرات میں اسلامی طرز کے تعمیری رجحانات کا سراغ ملتا ہے۔ اور محراب کی ابتدائی شکل کی نمایاں پہچان ملتی ہے۔
غیاث الدین بلبن کی آنکھ بند ہوتے ہی دلّی کا تخت ڈاماں ڈول ہونے لگا۔ وہ سورج جو ترکی بادشاہوں کی حکومت میں کبھی نہ ڈوبتا تھا اب غروب ہونے والا تھا ـــ افراتفری کے اس عالم میں بلبن کے پوتے کیقباد کو تخت پر بٹھا دیا گیا ـــــ مگر یہ عیش پرست نوجوان تن آسودگی اور شراب نوشی میں ایسا مست ہوا کہ دبے پاؤں باغیوں نے حرکت کرنی شروع کر دی۔

انتشار کے اس عالم میں مہرولی اور قرب وجوار پر سناٹا چھا گیا ـــــ ہندوستان میں ترکی حکمرانوں کی طاقت کمزور ہونے لگی اور ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ حکومت کی

باگ ڈور کیقباد کے ہاتھوں سے نکل کر ایک خلجی وزیر کے ہاتھوں میں آگئی اور ۱۲۹۰ء میں دلّی کا حکمراں جلال الدین فیروز آگیا۔

موسیقی.......وقفہ.......

تبدیلی وقت کا اٹل قانون ہے۔ بڑی بڑی قدآور اور نبرد آزما ہستیاں اس سرزمین پر آئیں اور ختم ہوگئیں — مگر کچھ شخصیتیں ایسی بھی گزری ہیں جو ایک لافانی کردار کی طرح رہتی دُنیا تک قائم رہیں گی۔

ایسی ہی ایک ہستی کا نام علاء الدین خلجی تھا۔ جس کو قرون وسطیٰ کے ہندوستان کا ہیرو کہا جانا غلط نہ ہوگا۔ یہ وہ نرالا کردار ہے جس نے پورے ہندوستان کی تاریخ میں اپنے عہد کی یادگار عمارتوں اور اعلیٰ ملکی نظام کی وجہ سے موریہ عہد کی کھوئی ہوئی برتری کو دوبارہ حاصل کر لیا تھا۔

وہ ایک دوررس انسان تھا اور محبت و جنگ میں ہر طرح کی چالوں کے تجربے رکھتا تھا۔ ابھی شگوفوں نے آنکھ نہیں کھولی تھی کہ ۲۰ر جولائی سنہ ۱۲۹۶ء کی صبح علاء الدین خلجی کی حکومت کا اعلان ہوجاتا ہے۔

علاء الدین کو بھی اپنے متقدمین کی طرح قطب کا علاقہ بہت پسند تھا۔ وہاں تعمیر کردہ عمارتیں اِس بادشاہ کو بھی دعوتِ نظارہ اور آمادۂ فکر و تخلیق کر رہی تھیں — یہ صرف ایک فاتح اور منتظم بادشاہ نہ تھا بلکہ ماہر تعمیرات بھی تھا۔

علاء الدین نے قطب کے احاطے میں کئی خوش گوار اور فنِ تعمیر کے اضافے کئے۔ مسجد قوۃ الاسلام کی توسیع و ترویج کروائی۔ اس کے اطراف میں مزید دروازوں کی تعمیر کروائی۔ جس میں سے علائی دروازہ اسلامی ضابطوں پر مبنی فن تعمیرات کی ایک ایسی مثال ہے جس کا ثانی نہ تو اُس سے پہلے دیکھا گیا اور نہ ہی بعد میں کسی نے بنانے کی جرأت کی۔

علائی دروازے کی تکمیل سنہ ۱۳۱۱ء میں ہوئی جو چوکور شکل میں چار دروازوں پر مشتمل عمارت ہے۔ سنگ سرخ، سنگ مرمر، اور دوسرے بہت سے قیمتی پتھروں کے ذریعہ بنائی گئی

یہ عمارت اپنے دور کا ایک ایسا شاہکار ہے جو ساڑھے ۵۶ فٹ کے رقبہ میں بنی ہوئی ہے۔

ہشت پہل طرز کی یہ عمارت آیات قرآنی سے مزین ہے جس پر دلکش انداز میں کاریگری اور بیل بوٹے بنائے گئے ہیں۔ اس کی محراب، علائی دروازے کی وہ انفرادی اور بنیادی خصوصیت ہے جس نے فنِ تعمیر میں ایک نئی اور منفرد شکل کی محراب کو متعارف کرایا جس کی شکل گھوڑے کی نعل سے مشابہ ہے۔ اس طرح کی محراب اس سے پہلے یا اس کے بعد پھر دوبارہ نہ بن سکی۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اسلامی فن تعمیر کا نگینہ کہا جاتا ہے۔

علاءالدین کے عہد کا تعمیری سلسلہ پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا ہے مگر قطب کے گرد و نواح پر اس بادشاہ کی بھی خصوصی توجہ رہی اس نے یہاں اسلامی مدرسہ بنوایا۔ قطب مینار کو مزید سجایا سنوارا اور وہیں قریب، قطب مینار سے دوگنی اونچائی والا ایک اور علائی مینار بنوانا شروع کیا مگر حوادث ایام نے اس کو پورا نہ ہونے دیا اور آج بھی دیو ہیکل دندانے دار پہیئے کی شکل کا کھڑا یہ "علائی مینار" قطب مینار کے احاطہ میں اپنی بدنصیبی کی کہانی سنا رہا ہے۔

وہ بادشاہ جس نے صرف ایک معاشرہ ہی کو نہیں بلکہ پوری قوم اور ملک کو پرشکوہ عمارتوں اور بلند ترین آسائشوں سے روشناس کرایا، وہی عظیم المرتبت حکمراں ایک معمولی سی قبر میں کھنڈرات کے ڈھیر میں قطب مینار سے بالکل قریب پڑا ابدی نیند سو رہا ہے۔

علاءالدین کا عہد خوش حالی، امن اور پیسے کی فراوانی کا دور کہلاتا ہے۔ فن تعمیر کے فروغ اور کمال کا دور کہلاتا ہے۔ علم و ادب، تہذیب و ثقافت، موسیقی و مصوری اور فنون لطیفہ کی دوسری اصناف کے فروغ کا دور کہلاتا ہے۔ مجموعی طور پر عہد زریں کی تمام خصوصیت کا حامل ہے۔

(دریا میں پانی بہنے کی آواز)

ہندوستانی فنکاروں نے ہمیشہ سے مختلف تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ چاہے یہ کھردرے پتھروں کو تراش کر مجسمہ بنانے اور عمارتیں تعمیر کرنے کا فن ہو، چاہے یہ ادب اور شاعری کے ذریعہ انفرادی اور اجتماعی طبقہ کی خواہشات کا اظہار ہو اور

چاہے یہ مصوری اور موسیقی کے ذریعہ روح کو فرحت و تازگی بخشنے کا فن ہو۔

قطب مینار اور اس کے احاطے میں خاموشی کے ساتھ ابدی نیند سونے والے یہ دانشور اور طاقتور بادشاہ آنے والے دور کے لئے فنِ تعمیر کا ایک ایسا سرمایہ پیش کر گئے ہیں جو اُس دور کی تہذیبی، سیاسی، معاشی اور تاریخی زندگی کا آئینہ دار بھی ہے ـــــ اور ایک ایسا منظر نامہ ہے جسے دیکھ کر ہم ماضی کے فنکاروں کی خلاقانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔

موسیقی

اُسی عہد میں حضرت امیر خسرو بھی منظرِ عام پر آئے۔ جنھوں نے ہندی اور فارسی کی آمیزش سے ایک نئی زبان اور نئے لہجہ کی تخلیق کی۔ روزمرہ بولے جانے والے محاورے اور جملوں کو لطیفوں اور پہیلیوں کے ذریعہ عوام میں مقبول کیا۔

شاعری اور موسیقی کے فن کو شاہی دربار کی چار دیواری سے باہر نکالا۔ دنیا، جھانجھ، بانسری اور مردنگ جیسے آلات موسیقی کے فن کو خود بھی سمجھا اور سیکھا۔ چنگ، سارنگی، دف، دستک، مزامیر، ستار جیسے موسیقی کے سازوں میں خود بھی مہارت حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت امیر خسرؒو کو بھی قطب مینار اور اس کے اطراف کا حصہ بہت پسند تھا۔

وہ اکثر صبح کی پو پھٹتے ہی یہاں چلے آتے تھے اور دھوپ نکلنے تک موسیقی کا ریاض کرتے رہتے تھے ـــــ بعض کتابیں اور بہت سارے اشعار امیر خسرؒو نے اسی قطب کی چھاؤں میں بیٹھ کر لکھے ہیں ـــــ یہاں تک کہ قران السعدین میں موسیقی کے فن اور اس کی تاریخ کا تفصیلی طور پر ذکر حضرت امیر خسرؒو نے کیا ہے ـــــ بعض ساز اور موسیقی کے موجود ہونے کا شرف بھی حضرت امیر خسرو کو حاصل ہے ـــــ جس کی وجہ سے انھیں طوطیٔ ہند کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔

(امیر خسرؒو کے دور کا کوئی ساز)

موسیقی انسان کو روحانی غذا اور ذہنی تسکین عطا کرتی ہے۔ جس طرح موسیقی کے تار اپنی ضرب سے ایک نئی آواز اور نیا لہجہ تخلیق کرتے ہیں اسی طرح تجربات اور

حوادثات آنے والی قوموں کے لئے مشعلِ راہ بنتے ہیں۔

غلام اور خلجی بادشاہوں کا دور بھی اب ختم ہوچکا تھا۔ خواجہ بختیار کاکیؒ جیسے صوفی اور بزرگ سے لے کر حضرت نظام الدین اولیاء کا زمانہ بھی اب صرف اپنے نقوش ثبت کرکے اللہ کی رحمت کے ساتھ ابدیت کا درجہ اختیار کرچکا تھا۔

اور دلی کی سرزمین پر اب کسی نئی حکومت کا انتظار تھا کہ تغلق حکمرانوں نے آگے قدم بڑھاکر جنوبی دلّی کے ساتھ مشرق اور شمالی دلّی کی طرف بھی تعمیرات کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ فیروز شاہ تغلق نے قطب اور مسجد قوت الاسلام کو مزید تقویت بخشی، اس کے احاطہ کی منہدم دیواروں کو پھر سے بنوایا۔

کیونکہ وہ جانتا تھا کہ قطب کا علاقہ نام نہاد اُن سات دلّی کے شہروں میں سے سب سے اوّلین شہر ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کو ہر ذہین راجہ اور بادشاہ نے اپنے لئے منتخب کیا اور فنِ تعمیر کے اعلیٰ نمونوں سے آراستہ کیا۔

موسیقی

اور اس طرح وقت گزرتا گیا۔ سورج ڈوبتا اور نکلتا رہا۔ چاند اپنا سفر طے کرتا رہا۔ قدرت اپنے کرشمے دکھاتی رہی۔ اور پہاڑوں کے سینے چاک کرکے اُن چٹیل اور کھردرے پتھروں کو تراش کر انسان اپنی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتا رہا۔

مگر قطب مینار کا یہ حصہ اپنے وسیع و عریض دامن میں اپنے شائقین، ناظرین، اور نگہبانوں کے مدفون جسم کی نگہبانی آج بھی کررہا ہے۔ کیوں کہ ان [illegible] کے تعمیر کردہ یہ آثار قدیمہ اُن کی ابدیت، جاہ و حشمت اور کارناموں کی داستان آج بھی سنا رہے ہیں۔

آج یہ تاریخی عمارتیں اپنا آٹھ سو سالہ متواتر سفر طے کرنے کے باوجود مسکرا رہی ہیں۔ تھکن اور گھبراہٹ کا ان کے چہرے پر شائبہ تک نہیں ـــــ ان کا سفر اب بھی جاری ہے۔ دن مہینہ، سال، اور صدیاں پھلانگتی ہوئی یہ پرانی مگر تازہ دم قطب کے احاطہ کی عمارتیں ابھی کچھ ہی عرصہ میں ۲۱ ویں صدی میں شامل ہوجائیں گی۔

ریڈیو فیچر

لال قلعہ

عمارتیں بولتی ہیں، عمارتیں کہانیاں سناتی ہیں، عمارتیں زندہ رہتی ہیں اور وقت کے اپنی خاموش زبان سے ماضی کے جاہ و جلال اور سطوت و بلندی کی حکایت بیان کرتی ہیں۔ انھیں محض گارے اور اینٹ کی بنی ہوئی دیواریں نہ سمجھنا چاہیے۔ انھیں صرف پتھروں کی بے حس اور بے جان تعمیر بھی نہ سمجھنا چاہیے، بلکہ یہ وہ آثار ہیں جن سے گزرے ہوئے زمانے کی تہذیب کے نقوش مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ ایسی ہی زندہ جاوید عمارتوں میں سے ایک عظیم الشان عمارت ہے، جس کو ہم اور آپ گزشتہ ساڑھے تین سو سال سے لال قلعے کے نام سے جانتے ہیں۔

دہلی کا لال قلعہ اپنے دامن میں ایسی یادیں سمیٹے ہوئے ہے جن کو ایک ایک کر کے اگر ترتیب دیا جائے تو سیکڑوں ایسے شہ پارے نظر آئیں گے، جن کا ایک ایک ورق فردوسِ گمشدہ کی طرح آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتا ہے۔ اس لال قلعہ میں مغل بادشاہوں، شہزادوں اور شہزادیوں نے ایک جنت بنائی تھی، جہاں محض خوشیوں اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ جہاں صرف شہنائیوں اور بانسری کی مدھر دھنوں پر رقص و سرور کی محفلیں آراستہ کی جاتی تھیں۔ جہاں ساون میں گیت اور بہار میں گل و بلبل کے ترانے گائے جاتے تھے۔ جہاں دن کو جلالِ شہنشاہی کے آگے صدائے لبیک بلند ہوتی تھی، تو رات کو کھلی ہوئی چاندنی میں تمام شب جشنِ ماہتابی منایا جاتا تھا۔ یہ دہلی کا قلعۂ معلّیٰ ہے جہاں دیوانِ عام میں

بادشاہ سلامت خود اپنی رعایا کے دُکھ درد کو دُور کرتے تھے۔ اور یہ وہی دیوانِ خاص ہے جس کے مزیّن فرش پر دبیز قالینوں اور مخملی پردوں کی سجاوٹ کے ساتھ محفلیں آراستہ ہوتی تھیں۔ جنبش ملکن، ہوشیار باش، کی بانگ کے ساتھ ظلِ سبحانی نمودار ہوتے تھے۔ رنگ محل میں گھنگھروؤں اور شہنائی کی آواز کے ساتھ پورا شاہی قلعہ گونجنے لگتا تھا۔ شہزادے اور شہزادیوں، کمخواب، زربفت، پوتھ، اطلس اور مخمل کے بنے ہوئے قیمتی لباس میں آراستہ جشن کو زینت بخشتی تھیں۔ اور مصاحبین، ململ، تنزیب، آبِ رواں، چین گھاس، تار زر نگا، بنارسی، چندیری، چکن اور جامدانی جیسے نفیس ملبوسات کو زیبِ تن کئے ہوئے شریکِ محفل ہوتے، اور ایک خوشگوار ماحول میں مغلیہ دربار پریوں اور فرشتوں کی آماہ جگاہ بن جاتا۔

مگر وقت نے لال قلعہ کی تقدیر کے ماتھے سے اس کا جھومر نوچ لیا۔ کیونکہ تبدیلیِ وقت کا اٹل قانون ہے۔ مگر یہ قلعہ اب بھی، اسی جگہ پہ کھڑا، اپنی ماضی کی کہانی سنا رہا ہے۔ یہ شہاب الدین محمد شاہ جہاں بادشاہ غازی کا قلعہ اور محل ہے۔ جس نے بابر، ہمایوں، اکبر اور جہانگیر کی مغل سلطنت کو اپنے مضبوط ارادوں اور انتظامی سرگرمیوں کی بنا پر نہ صرف قائم رکھا بلکہ سنہرے دور کا آغاز بھی کیا۔ شاہ جہاں کی رگوں میں شاہی خون کی روانی تھی۔ اپنی راجپوت ماں جگت گوسائیں کی طرح عزم اور حوصلہ کی پختگی تھی۔ اس کے مزاج میں فنِ تعمیر کا ایک منفرد اور امتیازی تصور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاہ جہاں نے آگرہ میں ۱۲ سال مسلسل حکومت کرنے کے بعد ایک ایسی جگہ تلاش کی، جس کو اس نے نہ صرف پایۂ تخت بنایا، بلکہ پوری دنیا میں اس شہر کو ایک نیا مقام اور انفرادی مرتبہ عطا کیا، اور اس طرح دلی میں ایک نیا شہر بنا کر اُسے شاہ جہاں آباد کا نام دیا۔ اور ایک ایسے قلعہ کی تعمیر کروائی جسے عرفِ عام میں لال قلعہ کہا جاتا ہے۔ شاہ جہاں نامہ میں ابوصالح کنبوہ لکھتا ہے:۔

"قلعۂ مبارک کی بنیادوں کی تعمیر کا کام ۱۶ اپریل ۱۶۳۹ء بروز جمعہ ٹھیک صبح پانچ بجکر بارہ منٹ پر شروع ہوا اور نو برس کی مدّت میں ایک کروڑ روپے کی لاگت سے بن کر تیار ہوا۔ ۲۴ ربیع الاوّل ۱۰۵۸ھ یعنی ۱۶۴۸ء کو شاہ جہاں بادشاہ غازی صاحبِ قرآنِ ثانی، دریا کے راستہ سے آگرہ تا دلّی تشریف لائے اور خضر دروازے سے جو شاہ محل میں کھلتا ہے، قلعہ اور

دولت خانے میں داخل ہوئے۔ ظلِ سبحانی نے بنفسِ نفیس پورے قلعہ کا دورہ کیا۔ [illegible]
اور احمد کے اس تعمیر کردہ قلعہ کی داد دی، اور حکم فرمایا کہ دیوانِ خاص کی دیوار پر [illegible]
حرفوں سے یہ شعر تحریر کیا جائے۔ ؏

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمیں است وہمیں است وہمیں است

اگر جنت کہیں زمین پر ہے تو وہ یہیں ہے۔ یہیں ہے۔ یہیں ہے۔ [illegible]
بادشاہ کی یہ خواہش تھی کہ لال قلعہ اتنا وسیع و عریض ہو جو پچھلے تمام قلعوں سے [illegible]
زیادہ خوبصورت ہو۔ اس کی اس خواہش کی تکمیل ہوئی اور تقریباً [illegible]
لمبا یہ قلعہ لگ بھگ ڈھائی کلومیٹر کے رقبہ میں تعمیر کروایا گیا۔ ۳۳ میٹر اونچی [illegible]
کو اس کے گرد بنوایا گیا۔ گویا ہر آفتِ ناگہاں سے نجات کا ایک [illegible] لال قلعہ [illegible]

کہا جاتا ہے کہ لال قلعہ کے اس وسیع و عریض خطے میں شاندار [illegible]
عمارتوں اور محلوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ مگر حوادثات نے کچھ کو بے نام و نشان [illegible]
کردیا۔ مگر آج بھی جو عمارتیں موجود ہیں، ان کی سطوت و بلندی کو دیکھ کر [illegible]
ہے کہ مغل شہنشاہوں کے عہد میں ان کی کیا شان رہی ہوگی، آج بھی [illegible]
ممتاز محل، رنگ محل، خاص محل، دیوانِ خاص اور حمام جیسی عمارتیں موجود ہیں [illegible]
کے جانب حیات بخش باغ، چوکور نقشہ میں بنا ہوا ہے۔ لاہوری دروازے سے [illegible]
کی لمبی سڑک نوبت خانے تک آتی ہے، اور دلی دروازہ، جامع مسجد کی طرف [illegible]
گویا خدا کی حمد و ثنا میں محوِ عبادت ہے۔ قلعہ کے درمیانی حصہ میں نقار خانہ یا نوبت خانہ [illegible]
تین منزلہ ایک مستطیل عمارت ہے۔ جس کی چھتوں اور دیواروں پر رنگین [illegible] سے
نقش نگاری کی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں پر ہر روز پانچ مرتبہ نقاروں کی گونج سے بادشاہ
کی رعایا کو مغلیہ سلطنت کے وجود کا احساس دلایا جاتا تھا۔ یہی وہ جگہ ہے۔ جہاں ہر شخص کو
ہاتھی سے اتر کر دربارِ مغلیہ میں داخل ہونے کی اجازت لینی پڑتی تھی۔ اور یہی وہ [illegible]
جہاں مظلوم اور کمزور مغل بادشاہ، جہاندار شاہ، اور فرخ سیر کو جام شہادت پینا پڑا تھا، اور آج

اسی نوبت خانے کی بالائی منزل پر اسلحہ کا عجائب گھر ہے۔

نوبت خانے کے بالکل سامنے، لال قلعہ کی وہ اہم عمارت ہے، جسے دیوانِ عام کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ عمارت قیمتی پتھروں اور ٹھوس سونے کے کام سے آراستہ تھی۔ اس کے محراب دار دروں پر دبیز مخملی پردے پڑے رہتے تھے۔ یہاں بادشاہ سلامت خود جلوہ افروز ہوا کرتے تھے۔ اور رعایا اپنے آقا کا دیدار کرتی تھی۔

دیوانِ عام کی پشت پر صرف ذرا دور پر رنگ محل ہے۔ یہ عمارت رنگ و نور میں ڈوبا ہوا ایک حصہ لگتی تھی۔ مغل بادشاہ اسی جگہ پر اپنی تفریح کے لئے محفلیں آراستہ کرتے تھے۔ اس کے اطراف کے کمروں میں شہزادیاں اور بیگمات چلمن کی اوٹ سے محفل کا لطف لیتی تھیں۔ فرانسیسی سیاح اور اورنگ زیب کا طبیب فرانسفو برنیر اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ قلعہ مبارک کی شان وشوکت اور چمک دمک دیکھنی ہو تو کوئی شاہجہاں بادشاہ کے دور کے جشن کو دیکھے۔ وہ جب تختِ طاؤس پر چمکتے ہوئے کوہِ نور پتھر کے ساتھ تاج پوشی کرتے تھے تو ہزاروں غریبوں کو خیرات اور کپڑے بانٹے جاتے تھے۔ پورا لال قلعہ آتش بازیوں کی چمک سے چکا چوند ہو جاتا تھا۔ برنیر مزید لکھتا ہے کہ بادشاہ کا خاص محل تسبیح خانہ اور خواب گاہ کی چھتوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ان پر ایرانی قالین چسپاں کر دیئے گئے ہوں۔ سنگِ مرمر سے بنی ہوئی دیواروں پر جالی کا کام اور قیمتی پتھروں کے بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں۔ ان میں فنِ سنگ تراشی اور فنِ معماری کا ایک ایسا دلکش نقشہ دیکھنے کو ملتا ہے جو صرف شاہ جہاں بادشاہ کے دور کی امتیازی خصوصیت رہی ہے۔

اور یہ دیوانِ خاص ہے جس کی دیواریں سنگِ مرمر، قیمتی نگینوں اور رنگین پتھروں کے جڑاؤ سے آراستہ تھیں۔ دیوانِ خاص اپنے شاندار ماضی کی داستان آج بھی سناتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں تختِ طاؤس رکھا تھا۔ جہاں چین، ترکی، ایرانی اور عربی تہذیب اور فنِ تعمیر کے مشترک نمونوں کی نمائندگی آج بھی نظر آتی ہے۔ یہ وہی محل ہے جس کے فرش پر بادشاہ سلامت اپنے مقربین اور مصاحبین کے ہمراہ محوِ گفتگو ہوتے تھے۔ اور شعر و ادب نیز سیاست و حکمت پر تبادلۂ خیال فرماتے تھے۔ یہ وہی دیوانِ خاص ہے جہاں

کی دیواروں نے بڑے بڑے دانشوروں اور شاعروں کی فنکاری کے جوہر دیکھے ہیں [illegible]
وہ حمام ہے جس کو پورے طور پر ترکی ضابطوں اور تعمیری طریقوں پر بنایا گیا ہے۔ یہاں [illegible]
وہ تمام آسائشیں میسر تھیں جو صرف مغل بادشاہوں کے حصے میں آئی تھی۔ [illegible]
بھی گزرتی ہوئی شاہ برج تک پہونچتی ہے۔ جسے نہرِ بہشت یا نہرِ کوثر کہا جاتا ہے۔ [illegible]
باغات بھی مغلیہ دور کی عظمت اور ان بادشاہوں کے جمالیاتی شعور کا پتہ دیتے [illegible]
آج بھی حیات بخش باغ کو دیکھا جاسکتا ہے۔ جس کی گود میں ساون اور بھادوں [illegible]
ہوئے کنول کی مانند کھڑی مسکرا رہی ہیں۔

شاہ جہاں کا عہد یوں تو ۱۶۵۹ء میں ختم ہوگیا۔ مگر اس کے بیٹے اورنگ زیب [illegible]
بادشاہ نے بڑی حد تک لال قلعہ کی رونق برقرار رکھا۔ یہاں اس نے موتی مسجد تعمیر [illegible]
اور لاہوری دروازے کے اطراف اونچی گھونگھٹ دیوار تعمیر کروائی۔ شہزادوں اور محل [illegible]
بیگمات کو ہر طرح کا عیش و آرام عطا کیا۔ جشن اور محفلیں منعقد کروائیں۔ [illegible]
لاڈلی بہن روشن آرا بیگم نے لال قلعہ کے ماہتاب باغ میں ایک خصوصی جشن [illegible]
جس میں قلعہ کی بیگمات، شہزادیوں اور نواب و امراء کی بہو بیٹیوں نے شرکت کی۔ [illegible]
پرندی گاؤ تکیے سجائے گئے تھے اور پھر خاطر تواضع کا دور شروع ہوا۔ بادام کا ٹھنڈا شربت [illegible]
ورق میں لپٹے پان اور حقہ پیش کیا جاتا اور پھر دسترخوان کو شاہی انداز سے [illegible]
کا ایک ایک ٹکڑا کتے بلیوں کو کھلایا جاتا تاکہ یہ پتہ لگ جائے کہ کھانے میں زہر تو نہیں [illegible]
سنگِ یشب کے پیالوں میں کھانا سجایا جاتا۔ روشن آرا کے حکم پر بیٹھے مردوں میں موسیقی اور
گانا شروع ہوجاتا اور مغلائی دسترخوان کا ایک ایک شتاب شہنشاہ اورنگ زیب کی [illegible]
اور مہمان نوازی کا پتہ دیتا ہے۔ یخنی پلاؤ، قورمہ پلاؤ، مچھلی پلاؤ۔ کوکو پلاؤ، بریانی، قیمہ نرگسی،
بادامی، روغن جوش، باقر خانی، شیرمال، رومالی، نان نعمت پراٹھے، کباب، کوفتے [illegible]
مرغِ شوربہ، مرغِ مسلم، خاگینہ، شب دیگ، دم پخت، حلیم، ہریسہ، سموسے، [illegible]
شیر برنج، زردہ، سلائی۔ حلوہ، فالودہ۔ آب شورہ، سات غروش، مربا، اچار، چٹنی [illegible]
کی قلفیاں اور اسی طرح کی نہ جانے کتنی نعمتیں مہمانوں کے سامنے پیش کی جاتیں۔ رات بھر

یہ جشنِ ماہتابی منایا جاتا۔ چنبیلی، بیلے، موگرے، رات کا رانی، گلاب اور نہ جانے کن کن پھولوں کی خوشبوؤں سے معطر یہ جشن فجر کے وقت تک جاری رہتا۔

لیکن ہر عروج کے بعد زوال لازمی ہے۔ لال قلعہ کی اونچی فصلیں اور گہری خندقیں بھی مغلیہ جاہ و جلال کو روک نہ سکیں۔ برٹش حکمرانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور مغل شہزادوں کی آپسی چپقلش نے اس کے وقار کو ضرب لگائی اور کوئی بھی مغل حکمران اس بڑھتے ہوئے انقلاب کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اورنگ زیب کے بعد کئی مغل بادشاہ آئے، مگر ناکام رہے۔ محمد شاہ نے چند سال لال قلعہ پر حکومت کی، مگر وہ بھی ناکارہ نکلا۔ عیش و عشرت میں وہ اس قدر مدہوش ہو گیا کہ نادر شاہ سے مقابلہ کرنے کی اس میں سکت ہی باقی نہیں تھی۔ اور اسی طرح لال قلعہ کا سہاگ اُجڑ گیا۔

ہزاروں بے گناہ انسانوں کا خون بہا۔ مغل بادشاہوں کی جمع کی ہوئی دولت کا کثیر حصہ اور قلعہ معلّٰی کا بیشتر قیمتی سامان نادر شاہ لے کر ایران چلا گیا۔ اور اسی طرح احمد شاہ عالمگیر ثانی، اور شاہ عالم کو لال قلعہ کی اُجڑی ہوئی دیواریں اور برہنہ تخت نصیب ہوا اور جب اکبر شاہ ثانی کو تختِ مغلیہ میسّر ہوا تو اس کے پاس لال قلعہ کے علاوہ کچھ بھی باقی نہ بچا تھا، جو وہ اپنے فرزند اور ولی عہد، آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کو عطا کرتا۔ ؎

سبزانِ تازہ رو کی جہاں جلوہ گاہ تھی
اب دیکھئے تو واں نہیں سایہ درخت کا!!
دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں!!
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

اور آخر کار یہ دل جلا شاعر اور آخری مغل حکومت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی ۱۸۵۷ء میں برٹش سامراج کے آگے گھٹنے ٹیک دیتا ہے۔ لال قلعہ میں اب برطانوی سامراج کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ وہ قلعہ جو کبھی قلعہ مبارک اور قلعہ معلّٰی کے نام سے پکارا جاتا تھا، اب صرف RED FORT ہو کر رہ گیا تھا۔ مگر ہندوستان کے بہادر سپاہیوں نے ابھی ہمت نہیں ہاری تھی اور جلد ہی آزادی کے نعرے پھر سے بلند ہونے لگے۔ جدوجہد آزادی کا ایک نیا باب پھر سے کھل گیا۔ ہمارے دانشوروں اور سیاسی رہنماؤں نے لال قلعہ سے ایک ایسی مشعل کو روشن کیا جس کی آگ

پورے ہندوستان میں بھڑک اُٹھی۔ ہمارے بعض مجاہدین آزادی کو لال قلعہ کی کال کوٹھری میں قید بھی کیا گیا۔

اور اس طرح ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ ہندوستانی جانبازوں کی کوشش کامیاب ہوئی اور لال قلعہ انگریزوں کے قبضہ سے جاتا رہا۔ اور آخر کار ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان نے آزادی کے ترانے کے ساتھ لال قلعہ پر ترنگا جھنڈا لہرا کر ان مظلوم شہیدوں اور مغل شہزادوں کی روح کو سکون بخشا۔ ٭٭٭

جنتر منتر

ھندوستان کی راجدھانی دہلی کے مصروف ترین علاقے اور مشہور کناٹ پلیس میں جدید طرز کی بنی ہوئی عمارتوں کے درمیان آج سے تقریباً دو سو سال پرانی ایک آثار قدیمہ کی بھی عمارت ہے جو گول اور تیکھے انداز میں بنی ہوئی "جنتر منتر" کے نام سے آج بھی جانی جاتی ہے۔ یہ ایک فلکیاتی آلہ ہے جو رصد گاہ (OBSERVATORY) کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کو سنہ ۱۶۹۹ء سے سنہ ۱۷۴۳ء کے عرصہ میں جے پور شہر کے بانی مہاراجہ سوائے جے سنگھ ثانی نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ مہاراجہ اپنے عہد میں ایک عظیم معمار اور فنِ فلکیات کا جاننے والا تھا۔ یہ زمانہ مغل دورِ حکومت کا ہے۔ اس وقت دہلی کے تخت پر محمد شاہ بادشاہ براجمان تھا۔ جس کی فرمائش پر مہاراجہ جے سنگھ نے سیاروں، ستاروں اور علم نجوم کی خاطر خواہ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے جنتر منتر نامی رصد گاہ دہلی میں تعمیر کروائی تھی۔ تقریباً سات سال کی لگاتار محنت اور ذاتی دلچسپی کے بعد یہ رصدگاہ عالم وجود میں آئی۔

جے سنگھ نے پہلے تو ملک کے تمام نامور اور قابل عالموں کو اپنے پاس اکٹھا کیا، اور علم نجوم کی معقول معلومات فراہم کیں۔ ستاروں اور فلکیات کے تمام اثرات اور ان کے عمل کا مواد اکٹھا کیا۔ چاند، سورج اور دوسرے سیاروں کی حرکت کا علم حاصل کیا اور پھر یہ تمام تفصیلات جاننے کے بعد دہلی کی اس رصدگاہ کی بنیاد رکھی۔ کہا جاتا ہے کہ محمد شاہ بادشاہ کے حکم سے جے سنگھ نے سنہ ۱۷۲۴ء میں جنتر منتر کی تعمیر کا کام شروع کروایا۔ اس زمانے

میں اسی سے ملتی جلتی کچھ اور رصد گاہیں بھی تعمیر کروائی گئیں۔ جو جے پور، اجین، وارانسی اور
متھرا میں علی الترتیب سامنے آئیں۔ دہلی کی تاریخ اور یہاں کی عمارتوں کا ذکر کرتے ہوئے
"سیر المنازل" کے مصنف سنگین بیگ نے لکھا ہے کہ مہاراجہ جے سنگھ نے پہلے [illegible]
کا ایک بڑا سا آلہ بنایا۔ جس کے ذریعہ سے اس نے فلکیات کے علم کو سمجھنے کی [illegible]
میں اس کی مدد سے اس نے یہ عمارت تعمیر کروائی تاکہ اس وقت کی دارالخلافت شاہجہاں
آباد میں اس رصدگاہ کا چرچا ملک سے باہر بھی لوگ ایک عجیب و غریب اور بے مثال
فن تعمیر کے نمونے کے طور پر کیا کریں۔ اس احاطہ کی عمارتوں کا نام اس نے جنتر منتر
اور رام ینتر کے علاوہ سمراٹ ینتر بھی رکھا۔ یہ رصدگاہ دراصل ہندوستان کے اس قدیم
علم نجوم سے تعلق رکھتی ہے جس کا ذکر قدیم ہندوستان کی سنسکرت کتابوں میں
بار ملتا ہے۔ ویسے تو یہ عمارت پتھر، اینٹ اور چونے و گارے کی بنی ہوئی ہے۔ لیکن
اس کے آڑھے ترچھے انداز تعمیر میں فن اقلیدس اور ہندسہ کے ذریعہ وقت، موسم
چاند و سورج کی گردشوں کا پورا حساب لگایا جا سکتا ہے۔ اس عمارت اور [illegible]
نشانات کے ذریعہ پوری طرح فلکیات کی تمام حرکات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس وقت جبکہ
گھڑی اور موسم کا پتہ لگانے والے آلہ نہیں تھے۔ تو اسی جنتر منتر کے ذریعہ ان تمام باتوں
کو سمجھ لیا جاتا تھا۔ یہ ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعہ سے اس فن کو پوری طرح
سمجھنے والے پوری طرح رصدگاہ کا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس جنتر منتر کی تعمیر کے بعد
باقاعدہ طور پر رصدگاہ کو سمجھا اور جانا جانے لگا۔ خود مغل بادشاہ کو اس سے خصوصی
دلچسپی تھی۔ اور وقتاً فوقتاً وہ اس کے ذریعہ سے موسم کا حال معلوم کیا کرتا تھا۔ اس
اینٹ اور گارے کی بنی ہوئی عمارت کو پوری ہندوستانی تاریخ کے آثار قدیمہ میں
ایک انفرادی حیثیت حاصل ہے جو نہ صرف فن تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے بلکہ
سائنس اور علم نجوم کی یادگار ہے۔

مغربی مورخین اور علم فلکیات کا علم رکھنے والوں کے لئے یہ ایک ایسی مثال بنا
جس کو دیکھنے کے لئے ملک اور بیرون ملک سے ماہرین فن آتے اور جنتر منتر کی تعمیر

کو دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ آخری مغلیہ دور میں جب کہ اس ملک پر تابڑ توڑ بیرونی حملے ہو رہے ہیں، اور پورا ملک ایک افراتفری کے دور سے گزر رہا تھا۔ تمام اہم تعمیراتی کام ٹھپ پڑ چکے تھے۔ نادر شاہ کا حملہ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی سامراج ملک پر غالب ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ عین اس زمانے میں مہاراجہ جے سنگھ کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے پوری ذمہ داری کے ساتھ اس عجیب الخلقت عمارت کو تعمیر کردیا۔

اس جنتر منتر کے احاطے میں جو قابل ذکر رصد گاہیں ہیں، اُن کے نام یہ ہیں۔ سمراٹ ینتر"..... جو اس احاطے کی سب سے اہم اور نمایاں عمارت ہے جو تکونی اور مثلث انداز میں بنی ہوئی ہے۔ یہ ایک خطِ استوار کی طرح ہے جس پر بہت سارے زینے بنے ہوئے ہیں۔ جن کے ذریعہ سورج کی گردش کے سہارے وقت کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ سمراٹ ینتر اس طرح بنایا گیا ہے کہ اس فن کے سمجھنے والے اس کے ذریعہ سے ایک سیکنڈ کا بھی حساب لگا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اس پر بنے ہوتے نشانات کے ذریعہ سیاروں کی حرکت اور اُن کے اثر کا بھی علم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے جنوب میں "جے پرکاش ینتر" ہے جو سطح سے ذرا اوپر کو اٹھا ہوا نصف کرۂ ارضی کا آلہ ہے۔ جس کے ذریعہ سے سورج کی درجہ حرارت اور دوسرے سیاروں کی گردش کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ آلہ اس بات کی بھی نشاندہی کرتا ہے کہ کون سا سیارہ کس بُرج میں ہے؟ علم نجوم کے جاننے والے اور ماہر فلکیات سیاروں کی متواتر حرکت سے اپنی زندگی یا کسی اور کے شب و روز میں پیش آنے والے واقعات کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے تھے ـــــ تیسری رصد گاہ کا نام "رام ینتر" ہے۔ جو اس احاطے کے بالکل جنوب کی حدوں میں واقع ہے جو دو متوازی گول یا مدور عمارتوں پر مشتمل ہے۔ اُن میں سے ہر عمارت کے بیچ میں ایک اونچا ستون بنا ہوا ہے۔ اس کی دیوار پر بنے ہوتے مثلث اور چپٹے انداز کے نشانات خطِ استوا کے اطراف گردش کرنے والے سیاروں کا پتہ دیتے ہیں۔ جس سے انسانی زندگی پر پڑنے والے اثرات کا بھی علم ہوتا ہے۔ دراصل ہر انسان کی پیدائش کے حوالے سے ہر سیارہ کا اس کی زندگی،

سے گہرا تعلق ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں پیش آنے والے اچھے یا برے حالات
کا رشتہ اسی سیارے سے تعلق رکھتا ہے۔ لہذا اس نام جنتر کے ذریعے انسان کے
انفرادی سیارے کے اثرات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ جنتر منتر کے علاقے میں شمال کی جانب "[illegible]
ینتر" ہے جہاں چار رصد گاہیں ایک ساتھ بنی ہوئی ہیں۔ جن [illegible]
کے ذریعہ سورج کی گردش کا علم اس طرح ہوتا ہے کہ یورپ (EUROPE) کے [illegible]
جنوب میں کس وقت دوپہر ہوتی ہے پتہ چل جاتا ہے۔ اسی طرح [illegible]
میں بھی دوپہر کے وقت کا اندازہ دہلی میں اس رصد گاہ کے ذریعہ معلوم [illegible]

آج بھی دہلی کے اس جنتر منتر میں یہ تمام عمارتیں [illegible]
زیر نگرانی موجود ہیں۔ جن کی دیکھ بھال حتی الامکان کی جا رہی ہے۔ [illegible]
کے اطراف اونچی اور فلک بوس عمارتوں کے بن جانے کی وجہ سے [illegible]
ٹھیک سے پہونچ پاتی ہے اور نہ ہی دھوپ کے ڈھلنے اور چڑھنے کا [illegible]
ہو پاتا ہے۔ اس کی وجہ سے ان عمارتوں کا عمل بھی مناسب [illegible]
ہے۔ ویسے بھی اس رصد گاہ سے مناسب طور پر وہی شخص فائدہ حاصل کر سکتا ہے
اس فن کو سمجھتا اور جانتا ہو۔ اس کے لئے اس موضوع پر لکھی ہوئی [illegible]
ضروری ہے۔

آج عام لوگوں کے لئے تو یہ صرف دو سو سال سے بھی زیادہ پرانا [illegible]
کی ایک عمارت ہے جو ایک قومی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

شہروں
کا
تاریخی پس منظر

ہستناپور
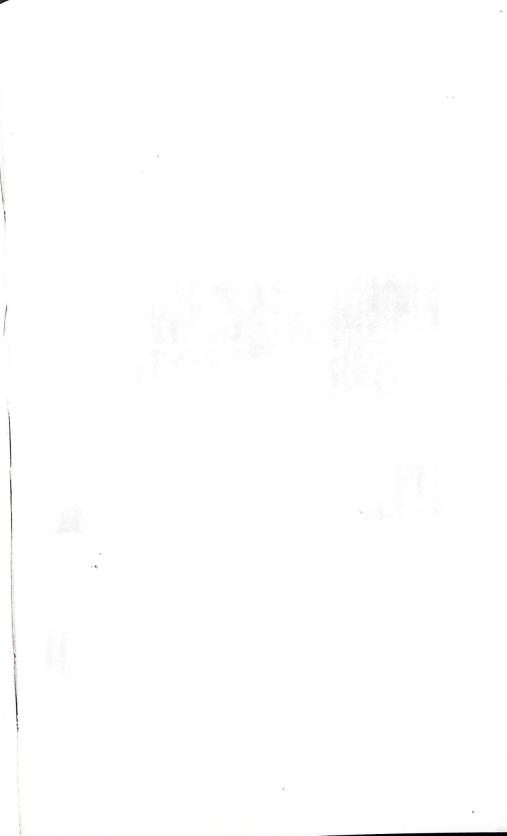
تاریخ ماضی کا آئینہ ہے تو تہذیب ہماری صدیوں پرانی روایات کی محافظ۔ مذہب مکمل اخلاقیات کی تلقین دیتا ہے تو اوتار روحانیت اور انسان دوستی کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح پورا ہندوستان، ہزاروں سال پرانے تہذیبی اور اخلاقی ورثہ کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہر دور میں نئے اور روشن امکانات سے تاریخ کے اوراق میں حقائق کی لڑیاں پروتا ہوا آمادۂ سفر ہے۔

ما قبل تاریخ کے اندھیرے دور سے لیکر وادیٔ سندھ کی تہذیبی زندگی تک کی داستان ہمیں پرانی اپنشد، کتھاؤں، اساطیری قصوں اور بعض گرنتھوں میں ڈھونڈتے اور تلاش کرنے سے کبھی مل جاتی ہیں اور کبھی تلاش کی یہی خواہش انسان کو مسلسل حقائق کی کھوج میں سرگرداں و پریشاں رکھتی ہے اور شاید یہی خواہش، مورخین کو حال کے جھروکوں سے ماضی بعید کے منظر پر کچھ دیکھنے اور تلاش کرنے پہ اکساتی رہتی ہے۔

جہاں وید، رامائن، گیتا اور مہابھارت جیسی اخلاقی، سماجی، سیاسی، تاریخی اور مذہبی تصورات پر مبنی تصانیف زندگی کے نت نئے گوشوں کو اُجاگر کرکے ہمیں ماضی کے واقعات سے روشناس کراتی ہیں۔ انھیں گرنتھوں میں سے مہارشی وید ویاس کی ایک مقدس تخلیق "مہابھارت" ہے جس کا محور و مرکز "ہستناپور" ہے۔

ہستناپور جو قدیم بھارت کا ایک ایسا سرچشمہ ہے جس میں ہندوستانی زندگی کے ابتدائی آثار نمودار ہوتے ہیں۔ ہستناپور ایک ایسا ماخذ ہے جہاں آج سے ہزاروں سال پرانے باشندوں کے شب و روز اور معاشرتی حالات کا علم ہوتا ہے۔ اور ہستناپور تو وہ جگہ ہے، جہاں "شانتنو" کا جنم ہوا تھا، جہاں بھیشم کو زندگی ملی۔ اس سرزمین پر کوروں نے ایک نئے دور ایک نئی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ ہستناپور تو وہ دھرتی ہے جہاں یدھشٹرا، ارجن، بھیم، نکل اور سہدیوا جیسے بہادر، نڈر اور مثالی کرداروں نے جنم لے کر ہواؤں کے رُخ موڑ دیئے۔ اور ایسے کرشمہ دکھائے جنھیں سُن کر انسانی عقل حیران رہ جاتی ہے۔

ہستناپور مہابھارت کی ہزاروں سال پرانی تہذیب اور معاشرہ کا چشم دید گواہ ہے جو آج بھی دہلی سے تقریباً نوے کلومیٹر کی دوری پر ضلع میرٹھ میں گنگا ندی کے کنارے ایک قصبہ کی شکل میں آباد ہے۔ اس جگہ کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس وقت جب کہ ہڑپا اور موہنجوداڑو جیسے شہر اپنی تہذیب کے نقوش مرتب کر رہے تھے۔ ہستناپور ترقی کی منزلوں پر گامزن تھا۔ کچھ لوگوں کا تو یہ بھی خیال ہے کہ مہابھارت کا محور و مرکز ہندوستان کی قدیم ترین تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہستناپور مرور ایام کے ساتھ مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا رہا کہا جاتا ہے کہ اس کا اولین نام "اہستھلا" (AHISTHALA) تھا۔ مگر تین ہزار سال قبل مسیح کے عہد میں اس جگہ کو "اَسندیوت" کہا جاتا تھا۔ خود مہابھارت کی رزمیہ تصنیف میں لفظ ہستناپور کا کہیں ذکر نہیں ملتا ہے۔ البتہ اس مقام کو "ناگاسہوا" یا "گجپورہ" کے ناموں سے یاد کیا گیا ہے۔ تقریباً ایک ہزار سال قبل مسیح کی ایک اہم تصنیف "رگ وید" میں بھی ہستناپور کا تذکرہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس کے بعد کی آنے والی صدی میں "پانینی" نے اس نام کی کوئی وضاحت کی ہے۔ ان تمام آثار و قرائن سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ یہ بستی تو بہرحال زمانۂ قدیم سے اسی جگہ پر بسے رہی ہوگی مگر تاریخ اسے مختلف ناموں سے موسوم کرتی رہی —— اس طرح گزرتے ہوتے شب و روز کے ساتھ ساتھ لگ بھگ دوسری صدی عیسوی میں اس کو کسی ہستن نامی راجہ کے نام سے ہستناپور کہا جانے لگا۔ بعض محققین کی تو یہ رائے ہے کہ سنسکرت میں "ہستن" ہاتھی کو کہتے

ہیں اور شنگھ عہدِ حکومت میں یہاں ہاتھیوں کا بازار لگا کرتا تھا۔ تبھی سے اس جگہ کو ہستنا پور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس کی وجہ تسمیہ کچھ بھی رہی ہو مگر آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے یہاں کھدائی (EXCAV ATION) کے ذریعہ یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ جگہ آج سے لگ بھگ چھ ہزار سال پرانی ہے۔ جہاں اس وقت لوگ زندگی بسر کرتے تھے۔ اس دور کے گیروئے رنگ کے برتن (O.C.P) کی دریافت اپنے عہد کی نشاندہی کرتے ہیں۔ جن کو تقریباً اسی جگہ کھُدائی کے ذریعہ نکالا گیا ہے۔ ان مٹی کے برتنوں کا مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں ہستنا پور میں لوگ آباد تھے اور زندگی بسر کرتے تھے۔

ہستنا پور کا نام آتے ہی مہا بھارت کی اس معرکتہ الآرا کہانی کا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے جس میں ہستنا پور کے راج پاٹھ اور سنگھاسن کو حاصل کرنے کی کوشش میں کورو اور پانڈو کی عظیم جنگ پیش آئی۔ اس جنگ کا محور یہاں سے چند میل کے فاصلے پر "کروکشیتر" تو ضرور رہا مگر اس کے سارے کردار اور احوال و کوائف کا رشتہ ہستنا پور کی سرزمین پر ہی جنم لیتا ہے۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں " دریودھن " جیسے باغی، خود غرض اور چاپلوس کردار کا خاتمہ کرنے کے لئے دوارکا سے کرشن جی ہستنا پور کا رُخ کرتے ہیں، اور اسی دھرتی پر گنگا پتر، بھیشم، اپنے اعلیٰ کردار اور حق و باطل کا فیصلہ کرنے کے لئے میدانِ جنگ میں اس دور کے معاشرہ کی نمایاں تصویر کشی کرتے ہیں ـــــ اور یہی وہ ہستنا پور ہے جس کی سرزمین پر "گیتا" جیسی مقدس اور مکمل طور پر کرم اور اخلاقیات پر مبنی کتاب تمام انسانوں کے لئے پیش کی گئی۔ بھگود گیتا کا ایک ایک شلوک تمام نوعِ انسانی کے لئے زندگی کی نئی راہیں روشن کرتا ہے۔

مگر آج تمام دنیا کے دانشوروں اور مورخین کے لئے یہ مسئلہ ایک اُلجھے ہوئے سوال کی طرح ذہن میں گردش کر رہا ہے کہ آیا مہا بھارت محض ایک شاعر کی خیالی پرواز کا نتیجہ ہے یا سچ مُچ اس کا رشتہ حقیقت سے بھی کہیں ملتا ہے؟ کیا سچ مچ ہستنا پور میں کوروں اور پانڈوں کا کوئی وجود تھا یا یہ بھی محض ایک داستان ہے؟ کیا مہا بھارت کی جنگ

کا کوئی وجود ہے یا یہ صرف ایک معاشرہ کی من گھڑت کہانی ہے؟ ان تمام سوالوں کو حقیقت کی کسوٹی پر پرکھنے کے لئے آثارِ قدیمہ کے محققین نے بیسویں صدی کی پانچویں دہائیوں میں ہستناپور میں باضابطہ ایک کھدائی کے ذریعہ حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کی اور ہستناپور میں گنگا ندی کے کنارے ایک اونچے سے ٹیلے کو کھدائی کے ذریعہ اس کے اندر کی تہوں کو بے نقاب کیا۔ وہاں سے پائی جانے والی چیزوں اور خصوصاً گیروے رنگ کے مٹی کے برتن (O. C. P.) بھورے رنگ کے ملمع کئے ہوئے مٹی کے برتن اور کچھ اسلحہ کے ذریعہ اس کا اندازہ لگایا کہ یہاں پر جو لوگ رہتے تھے۔ اور جن کا حوالہ مہابھارت میں دیا جاتا ہے' اُن کا عہد کیا تھا؟۔۔۔ اس جگہ پر بہنے والی گنگا ندی سے یہ سُراغ ملتا ہے کہ یہاں مختلف ادوار میں قافلہ آئے، اور آباد ہو گئے۔۔۔ حوادثاتِ ایام نے اُن کے جاہ و جلال کو تو نیست و نابود کر دیا لیکن ان تہذیبوں کے آثار اب بھی وہاں کی ریت تلے دفن ہیں۔ تلاش کرنے والے ہاتھوں نے اُن ٹیلوں اور تودوں کو کھُرچا تو زمین کی تہوں میں پنہاں اُن تہذیبوں کے نقوش نمایاں ہونے لگے۔ ہستناپور میں کھدائی کے دوران کچھ ایسے مٹی کے برتنوں کا سُراغ لگا ہے جس کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ جگہ کوروؤں کی راجدھانی ہے سے پہلے بھی آباد تھی مگر سب سے نچلی سطح سے ذرا اوپر کے حصہ میں جن مٹی کے برتنوں کا انکشاف ہوا ہے انھیں آرکیولوجی کی اصطلاح میں (P. G. W) یعنی بھورے رنگ کے مٹی کے برتنوں کا دور کہا جاتا ہے۔ جو آج سے لگ بھگ تین ہزار سال پرانے کہلاتے ہیں، چونکہ اس طرح کے برتن ان تمام دوسری جگہوں پر بھی ملتے ہیں جہاں جہاں کوروؤں اور پانڈو کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس لئے مورخین کی رائے میں مہابھارت کے واقعہ کو تین ہزار سال پُرانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ مہابھارت کے یہ تاریخ ساز کردار" برناوا' بیراٹ' پانی پتھ' سونی پتھ' باگ پتھ' اندر پتھ' اور تل پتھ" میں بھی قیام پذیر رہے ہیں۔ ان تمام جگہوں پر بھی اسی طرح کا پُرانہ سامان ملتا ہے جو ہستناپور میں مہابھارت کے عہد سے منسوب کیا جاتا ہے اسی مہابھارت میں یہ بھی حوالہ ملتا ہے کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد پانڈو راج پاٹ چھوڑ کر،

اپنے ولی عہد "پرکشت" کو تخت نشین کر کے چلے جاتے ہیں۔ عین اسی کے کچھ عرصہ بعد ہی گنگا ندی میں باڑھ آجانے کی وجہ سے پورا ہستنا پور ڈوب جاتا ہے اور مجبور ہو کر پانڈوؤں کا آخری راجہ پرکشت یا اس کا ولی عہد' اپنے بزرگوں کی راجدھانی چھوڑ کر الہ آباد کے قریب جمنا ندی کے کنارے "کوشامبی" نامی ایک جگہ پر جا کر اپنی حکومت کی بنیاد از سر نو ڈالتا ہے۔ کوشامبی میں بھی کھدائی کے دوران وہی بھورے رنگ کے مٹی کے برتن (P. G. W.) ملتے ہیں۔ ان تمام تحقیقات کی روشنی میں مہابھارت کے واقعہ کی تصدیق کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ان تمام مقامات پر ایک ہی جیسا سامان برآمد ہوا ہے جس کا ذکر مہابھارت میں کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر "کروکشیتر" اور دلی میں پرانہ قلعہ کا علاقہ جس کے بارے میں یہ خیال ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جس کو "اندرپرستھ" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ ان جگہوں پر بھی ملتے جلتے آثار نمایاں ہوئے ہیں۔ ان تمام شواہد کی روشنی میں مہابھارت کے واقعہ کو محض ایک خیالی کہانی کے بجائے حقیقت میں پیش آنے والا واقعہ کہا جاسکتا ہے اور مہابھارت کے تمام کرداروں کا تعلق کسی نہ کسی صورت میں ہستنا پور ہی سے جا ملتا ہے۔ مہابھارت آج سے کم و بیش ساڑھے چار ہزار سال پہلے کی سب سے اوّلین تصنیف ہے جسے اس وقت کے ایک ادیب اور شاعر ویدویاس نے نظم کیا تھا جسے بعض حوالوں میں "جے" کا بھی نام دیا گیا ہے۔ اس کے بعد آنے والی صدیوں میں کچھ اور لوگوں نے بھی اس میں ترمیم اور اضافہ کیا ہے۔ لیکن اس مہابھارت کا سب سے اہم اور قابلِ ستائش وہ حصہ ہے جسے "بھگود گیتا" کہا جاتا ہے جو کرشن جی کی مسلسل اور اعلیٰ اخلاقی واقعات پر مبنی تصنیف ہے۔ دورِ حاضر کے مدبر اور نامور مؤرخ پروفیسر بی بی لال کی تحقیق کے مطابق مہابھارت کی جنگ کا واقعہ ڈیڑھ سے دو ہزار سال قبل مسیح کا ہوسکتا ہے۔ کیونکہ جو بھی سامان اس واقعہ کی مناسبت سے ملتا ہے۔ اس کا زمانہ بھی یہی ہے۔

لیکن بعض ادیبوں اور شاعروں کے خیال میں مہابھارت کی جنگ آج سے کم از کم ۱۲ ہزار سال پہلے ہوئی تھی لیکن تاریخ اور آثارِ قدیمہ کی روشنی میں اس خیال کی تردید ہوتی ہے

کورو اور پانڈوں کی حکومتیں تو صفحہ ہستی سے مٹ گئیں مگر ہستناپور کا وجود پھر بھی باقی رہا اور موریہ، شنگھ، کشان، گپتا، راجپوت اور بعد میں سلطنت دور کی حکومتوں کے پڑاؤ کے آثار بھی اس علاقہ سے دستیاب ہوئے ہیں۔ جس سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ قدیم دور سے لے کر دورِ وسطیٰ کے ہندوستان میں ہستناپور کو انفرادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ کھدائی کے دوران اوپر کی سطح پر مذکورہ ادوار کے سکّے، برتن، اسلحہ، مورتیاں، اور بعض دوسرا سامان بھی برآمد ہوا ہے جس میں ٹیراکوٹا یعنی پکی ہوئی مٹی کی مورتیاں، اور کچھ دوسرا سامان قابلِ ذکر ہے۔

بارہویں صدی کے شروع ہوتے ہی پورے شمالی اور مغربی ہندوستان میں بدھ اور جین کے پیروکاروں نے ہستناپور کو اپنا مخصوص مرکز قرار دیا۔ اور زیادہ تر مہاویر جین مذہب کے ماننے والوں نے اس جگہ کو مذہبی اہمیت بخشی اور کثیر تعداد میں بارہویں صدی سے لے کر پندرہویں صدی تک جین مندر کی تعمیر کا کام ہوتا رہا اور آج بھی ہستناپور کا یہ علاقہ جین مندر کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ وہ سرزمین جہاں پر شری کرشن جی نے گیتا کا پاٹھ کیا تھا۔ وہ جگہ جہاں پر مہابھارت کے مشہور کرداروں نے حق و باطل کی جنگ کے منصوبے بنائے تھے۔ پھر سے جین، ہندو اور دوسرے مذاہب کی مشترکہ آوازوں کے ساتھ اپنی پہچان کے کچھ نقوش بنانے لگا۔ ہستناپور قدیم ہندوستان سے لے کر دورِ وسطیٰ کے عہد تک کا ایک ایسا تاریخی شہر ہے، جہاں آج بھی پرانے ہندوستان کے تہذیبی اور معاشرتی حالات دفن ہیں۔

سارناتھ

ہندوستان کے قدیم تاریخی مآخذ اس بات کے شاہد ہیں کہ اس سرزمین پر بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں، مدبّر رہنماؤں اور عظیم دانشمندوں نے اپنی بزرگی، دیانت داری اور انسانی فلاح و بہبود کی تبلیغ و اشاعت نے نہ صرف اپنے دور کو متاثر کیا بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے بھی ایسے امکانات روشن کئے جس پر گامزن ہو کر متاخرین نے بھی اپنے راستہ ہموار کئے۔ ایسی ہی تاریخی اہمیت کی حامل شمالی ہندوستان میں ایک جگہ سارناتھ بھی ہے بنارس سے تقریباً ۱۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر سارناتھ کو موریہ عہدِ حکومت سے ہی مسلسل ایک تاریخی، تہذیبی اور مذہبی اہمیت حاصل رہی ہے — یہی وہ جگہ ہے جہاں پر گوتم بدھ نے پہلی بار فلسفۂ حیات و موت اور بدھ مذہب کی اِشاعت و تبلیغ کے لئے پہلا خطبہ دیا تھا — یہیں سے بدھ مذہب کی ترویج و توسیع ہوئی اور یہیں پر بدھ مذہب کی خانقاہیں، استوپ، اور دھرم چکر پرورتن یعنی مذہبی قوانین کے روایتی ڈھانچہ میں نمایاں تبدیلی کی بنیاد ڈالی گئی اور یہی وہ جگہ ہے جہاں گوتم بدھ کے نِروان کے لگ بھگ دو سو سال بعد سمراٹ اشوک نے عدمِ تشدد کے راستہ پر گامزن ہو کر استوپ، خانقاہیں اور پتھروں کے استمبھ کے تعمیر کروائی — یہیں پر وہ اشوک کا کھمبا بھی ہے جس پر شاندار اور چمکدار پتھر کا بنایا ہوا لائن کیپٹل (Lion Capital) تعینات تھا جو اب سارناتھ میوزیم میں محفوظ ہے،

اور ہمارے ملک کا قومی نشان بھی ہے۔

سارناتھ متواتر تیسری صدی قبل مسیح سے بدھ مذہب کی ایک اہم زیارت گاہ کے طور پر جانا جاتا رہا ہے۔ اور آج دو ہزار سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے بعد بھی اس شہر کو آثار قدیمہ کے ڈھیر سارے نوادرات کے گہوارے کے طور پر جانا اور پہچانا جاتا ہے۔

اس مقام کو آج کے دور میں اس وجہ سے بھی انفرادی حیثیت حاصل ہے کہ گزشتہ صدیوں میں پرانی تہذیب کے آثار نمایاں طور پر اس شہر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ نہ صرف ایک بدھ مذہب کی زیارت گاہ ہے بلکہ آرٹ اور کلچر کے نقطۂ نظر سے بھی ہندوستانی تہذیب کی نشاندہی کرتا ہے۔ شُنگ (S U N G A) کشان اور گپت دورِ حکومت کے بتدریج ارتقائی سفر کی داستان بھی یہاں کے پتھروں کے استمبھ، مورتیوں اور تعمیر کردہ خانقاہوں کے فن معماری کے نمونوں سے دیکھی جا سکتی ہے۔ راجہ چندر گپت ثانی کے عہدِ حکومت میں سارناتھ کو ایک اہم تجارتی مرکز قرار دیا گیا تھا۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ پانچویں صدی عیسوی میں جاپان، چین، روم اور مغربی ممالک کے بہت سارے سیّاح تجارت کی غرض سے یہاں آئے اور مہینوں قیام کرنے کے بعد ہندوستانی نوادرات کو کثیر تعداد میں معقول رقم کے عوض لے جاتے تھے۔

اسی عہد میں مشہور سیّاح فاہیان نے سارناتھ کا دورہ کیا۔ وہ یہاں تعمیر شدہ عمارتوں، استوپوں، اور خانقاہوں سے اس قدر زیادہ متاثر تھا کہ جسکے مقابلے میں اُسے ہندوستان کا کوئی بھی دوسرا شہر متاثر نہ کر سکا۔ فاہیان کا خود بیان تھا کہ اس کے اطراف کی فضا اور سرسبز و شاداب ہریالی اس قدر صحت افزا ہے کہ شاید ہی یہاں کوئی بیمار پڑتا ہوگا۔ اس کے بعد مہاراجہ ہرش وردھن کے دورِ حکومت میں ایک اور چینی سیّاح ہیون سانگ کا کہنا ہے کہ سارناتھ نہ صرف ہندوستان کا ایک مشہور اور اہم شہر ہے بلکہ اسے بین الاقوامی سطح پر بھی نمایاں طور پر جانا جاتا ہے۔ وہ مزید اظہارِ تعجب کرتے ہوتے کہتا ہے کہ یہاں بدھ مذہب اور سکون کے متلاشی مختلف مذاہب کے عقیدت مندوں کا ایک جم غفیر لگا رہتا ہے۔ کبھی کبھی اِن کی تعداد پچاس ہزار افراد سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ جن کے کھانے پینے اور مناسب قیام کا انتظام یہاں کی پندرہ سو خانقاہوں میں بآسانی ہو جایا کرتا ہے۔ یہاں پر ایک بات قابلِ غور ہے کہ

عہدِ وسطیٰ کے ابتدائی دنوں میں لوگوں کا اتنی بڑی تعداد میں سارناتھ کی سرزمین پر قیام کرنا اس کی اہمیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

سارناتھ کو مختلف اُدوار میں الگ الگ ناموں سے پکارا جاتا رہا ہے۔ عہدِ موریہ میں اس کو رشی پٹنہ (Rishi PATNA) کہا جاتا تھا۔ عہدِ کشان میں اس شہر کا نام — مرگدیوا (Mirgadeva) اور پھر پانچویں صدی سے اس کو سارنگا ناتھا (SARANGANATHA) کے نام سے موسوم کیا گیا — آخرالذکر نام رکھنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس مقام پر ہرنوں کا جھنڈ بے خوف و خطر گھوما کرتا تھا۔ وہاں کے باشندے ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے، نہاتے اور ہرنوں کو پیار کرتے ہوئے چلے جاتے — چونکہ سنسکرت زبان میں 'سارنگا ناتھا' کے معنیٰ بھی ہرنوں کی آماجگاہ کے ہیں۔ اس لئے اس کو اسی نام سے منسوب کردیا گیا۔ لیکن ہندوستان میں مسلمان سیاحوں، صوفی، سنتوں اور بادشاہوں کی آمد کے بعد سے اس جگہ کو سارناتھ کے نام سے پکارا جانے لگا — ١٠١٧ء میں ہندوستان پر محمود غزنوی کے حملہ کے دوران سارناتھ بھی متاثر ہوا — مشہور روسی سیاح البیرونی ایک جگہ پر لکھتا ہے کہ میں نے محمود غزنوی کے سارناتھ پر حملہ کے فوراً بعد اس جگہ کا دورہ کیا تو دیکھا کہ وہاں پر نصب اشوک کی لاٹ اور اس پر رکھے ہوئے ببر کی شکل کے ایک چمکدار پتھر کو متواتر ضرب سے نقصان پہونچایا گیا ہے — کئی دوسرے پتھر کے بنے ہوئے مجسموں کو بھی شکستہ حالت میں پایا۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ محمود غزنوی بھی پتھر پر تراشے ہوئے ان مجسموں کو اپنی ملکیت میں لینا چاہتا ہوگا۔ مگر شکر ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔" — اس بیان کی تصدیق سارناتھ میں راجہ مہیپال کے عہد میں بنائی گئی کچھ عمارتوں پر کندہ تحریر سے بھی ہوتی ہے۔ البیرونی اس شہر کے بارے میں مزید لکھتا ہے کہ سارناتھ کے قریب ہی گنگا ندی بہتی ہے۔ جہاں طلوعِ آفتاب کے منظر کا وقت قابلِ دید ہوتا ہے۔ بڑے بڑے قابل عالمانِ زبان و مذہب یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں اور سنسکرت زبان کو اتنی روانی سے بولتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ میں اس زبان کو جانتا ہوں مگر آسانی کے ساتھ سمجھ نہیں پاتا۔"

سارناتھ نہ صرف عہد رفتہ کا ایک ثقافتی اور مذہبی شہر ہے، بلکہ آج بھی اس کی اہمیت برقرار ہے — ہر سال ہزاروں کی تعداد میں دنیا کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے سیاح، زائرین اور شائقین اہلِ فنون و لطیفہ اس شہر کا دورہ کرتے ہیں اور ہزاروں سال پرانی تہذیب کے نقوش اپنے ذہنوں میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ ٭٭٭

سانچی

بدھ مذہب کا ایک اہم مرکز

قدیم ہندوستان کے کچھ اہم شہروں میں ایک نام سانچی کا بھی ہے۔ آج بھی یہ چھوٹا سا شہر مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال سے صرف چالیس کلو میٹر کے فاصلہ پر شمال مشرق کی جانب واقع ہے۔ جہاں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا ایک طویل سلسلہ دور تک پھیلا ہوا ہے۔ انھیں پہاڑیوں کے دامن میں تقریباً ڈھائی ہزار سال پرانے تعمیر کردہ استوپ اور مینار گذشتہ دور کے فنِ تعمیر، فنونِ لطیفہ اور بدھ مذہب کی کہانی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ یہ عمارتیں نہ صرف آرٹ اور آرکیٹکچر کا بہترین نمونہ ہیں، بلکہ اُن کے ذریعہ سے گوتم بدھ کے احکامات، فلسفۂ انسانیت، اور علم تشدد کی داستان کو بھی مرتب کیا جا سکتا ہے۔ بدھ ازم کی تاریخ میں سانچی کو زمانۂ قدیم سے مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ کیوں کہ گوتم بدھ کے ایک سچے پیروکار، سمراٹ اشوک نے تیسری صدی قبل مسیح میں سانچی کو آباد کیا۔ یہاں گوتم بدھ کی یاد میں استوپ، خانقاہیں، مینار اور پاٹھ شالائیں تعمیر کروائیں۔ اور دنیا بھر کے تمام بدھ مذہبی پیشواؤں کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ لوگ اس جگہ پر آئیں اور بدھ مذہب کے فروغ و اشاعت میں حصہ لیں۔

سانچی کو مختلف ادوار میں الگ الگ ناموں سے جانا جاتا رہا ہے۔ ایک روایت کے مطابق جب مہاراجہ اشوک نے اس جگہ کو آباد کیا تو یہاں ایک چھوٹی سی بستی تھی، جہاں پتھر تراشنے والے رہا کرتے تھے۔ اس وقت اس جگہ کو "کاکاینہ" کہا جاتا تھا۔ اشوک نے اس کو

"کاکانوتا" کا نام دیا۔ مگر پہلی صدی عیسوی میں کشان راجاؤں کے زمانے میں اس جگہ کو "بوتا سری پاروتا" کے نام سے جانا گیا۔ یہ متواتر تیسری صدی قبل مسیح سے گیارہویں صدی عیسوی تک راجاؤں اور فنکاروں کی توجہ کا مرکز رہا۔ جنھوں نے اپنی نمایاں تخلیق اور تعمیر کے ذریعہ یہاں پتھروں کو تراش کر اس قدر خوبصورت کاریگری کا ثبوت دیا ہے، جو آج بھی اپنی مثال آپ ہے۔ تقریباً ڈھیر ہزار سال کے عرصہ میں موریہ، تنگ، کشان، گپتا اور راجپوت راجاؤں نے سانچی میں استوپ، دھرم شالائیں، مندر اور دوسری تعمیرات کروائیں۔ بعض بدھ مذہب کے معتقد افراد نے گوتم بدھ کی مختلف مدراؤں میں مورتیاں بھی بنوائیں اور اُن کو استوپ، خانقاہوں اور مندروں کی زینت بنایا۔ کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ اشوک، سانچی کو بدھ مذہب کا ایک ایسا منفرد مرکز بنانا چاہتا تھا جو تمام دنیا میں جانا جا سکے۔ چنانچہ وہاں کچھ استوپوں کی تعمیر سے پہلے ایک لکڑی کا ڈھانچہ تیار کروایا اور اس پر باریک فنکاری اور مرصع نگاری کے بعد دوسرے سنگ تراشوں اور معماروں کو یہ حکم دیا کہ پتھر کی تعمیر کے باوجود عمارتوں پر کی گئی کاریگری اتنی ہی باریک اور اتنی ہی دیدہ زیب ہونی چاہیئے جو لکڑی پر تھی۔ اس کام کے لئے اس نے معماروں کے علاوہ سونے اور چاندی کا کام کرنے والے کاریگروں کو بھی کام میں لگایا۔ اس قدر احتیاط کے بعد جو عمارات بن کر تیار ہوئیں۔ وہ واقعی فنِ تعمیر کی شاندار مثالیں ہیں۔ جن میں گوتم بدھ کے احکامات کا اظہار ہے۔ جہاں نروان کا فلسفہ دکھایا گیا ہے۔ وہاں پر جاتک کہانیوں کے ذریعہ گوتم بدھ کے مذہب کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں آتے ہی سماجی، سیاسی اور مذہبی، نقطۂ نظر سے زبردست تبدیلیاں نمودار ہونے لگیں۔ وہ شہر جنھیں مرکزیت حاصل تھی۔ اب بے توجہی کا شکار ہونے لگے اور وہ جگہیں جو ویران پڑی تھیں وہاں آبادی اور شہر بننے لگے۔ سانچی بھی اس بے توجہی کا شکار ہو کر ۱۱ویں صدی عیسویں سے غیر آباد ہو گیا اور تمام عمارات ایک ڈھیر تلے دفن ہو کر رہ گئیں۔ دورِ سلطنت اور دورِ مغلیہ میں کہیں بھی کسی بھی حوالے میں سانچی کا ذکر نہیں آتا ہے۔ لیکن انگریز تاریخ دانوں کا ہندوستان میں یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے بدھ کے اس اہم مرکز کو تلاش کیا اور ۱۸۱۸ء میں پہلی بار جنرل ٹیلر نے اس جگہ کو تلاش

کیا۔ پھر کیپٹن جونسن نے ۱۸۲۲ء اور جنرل اے۔ کننگھم نے ۱۸۵۱ء میں زبردست کھدائی کے ذریعہ سانچی میں دفن آثارِ قدیمہ کو بے نقاب کیا۔ اس طرح ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۹ء کے دوران وہ تمام پرانی عمارات کا پتہ لگا کر سامنے لایا گیا جو صدیوں سے زمین کے ڈھیر میں دفن تھیں۔ تبھی سے سانچی میں محکمہ آثارِ قدیمہ کے ذریعہ سیاحوں، زائرین اور عالموں کے لئے دعوتِ نظارہ دی گئی۔ وہاں ایک میوزیم کا بھی قیام کیا گیا۔ جس میں مختلف عہد کے مجسموں، میناز، مورتیوں اور گوتم بدھ کی بعض اہم مورتیوں کو رکھا گیا۔

سانچی کی پرانی تعمیرات کو بنیادی طور پر تین خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جن میں سب سے زیادہ اہم اور قابلِ توجہ وہاں کے استوپ ہیں۔ پرانی کتابوں اور دوسری تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں پر مہاراجہ اشوک اور اس کے بیٹے مھندرا نے کل آٹھ استوپ تعمیر کروائے تھے، جن میں سے اب صرف تین باقی بچے ہیں۔ ان میں استوپ نمبر ا سب سے زیادہ شاندار اور پتھر کی تعمیر کردہ سب سے مکمل عمارت ہندوستان میں سب سے زیادہ پرانی ہے۔ یہ ۳۷ میٹر کے رقبہ میں موجود ہے، جس کی اونچائی ۱۷ میٹر ہے۔ یہ استوپ چاروں طرف سے ایک ریلنگ کے ذریعہ گھری ہوئی ہے۔ جہاں چار بڑے صدر دروازے ہیں۔ ہر دروازے کی دیواروں اور کھمبوں پر باریک کاریگری کے ذریعہ اس کو سجایا گیا ہے۔ استوپ کے درمیان میں ایک گول گنبد ہے، جو سرمئی رنگ کے پتھر سے بنا ہوا ہے۔ اس استوپ کے سب سے قابلِ توجہ اس کے دروازے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عہدِ موریہ کے فنِ تعمیر کی مثال اس سے زیادہ بہتر اور کہیں نہیں ملتی ہے۔ اس پتھر کی عمارت کی ذرا ذرا سی جگہ گوتم بدھ کی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ ابتدائی دور میں گوتم بدھ کو صرف تمثیلی انداز میں پیش کیا جاتا رہا ہے۔ بدھ کی کوئی تصویر یا مورتی نہیں بنائی جاتی تھی۔ اسی طرح یہاں بھی گوتم بدھ کے فرامین اور احکامات کے ذریعہ بدھ کو پیش کیا گیا ہے۔ جہاں کہیں کنول کا پھول بنایا جاتا، گویا وہ گوتم بدھ کی پیدائش کا اظہار ہوتا۔ درخت کے ذریعہ بدھ کے نروان کو ظاہر کیا گیا ہے اور پہیوں کی تصویر کے ذریعہ یہ سمجھا جاتا کہ گوتم بدھ کا پہلا خطبہ ہے جس کی تحریک سے بدھ مذہب آگے بڑھا۔ پیروں کے نشان اور تخت کا مقصد گوتم بدھ کو تمثیلی طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح کنول، پیڑ، پہیہ اور پیر کے نشان کے ذریعہ

گوتم بدھ کے وجود اور ان کی تعلیمات کو پیش کیا جانا ہوتا تھا۔ انھیں تمام چیزوں کو بھی سانچی کے استوپ نمبر ایک میں فن سنگ تراشی کے بہترین نمونے کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کے دروازے پر جاتک کہانیوں کی بھی نمائندگی ہے، جن کے ذریعہ سے بدھ مذہب کی تمام تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن گپتا دور میں پانچویں اور چھٹی صدی کے دوران گوتم بدھ کے مجسمہ کو بنائے جانے کا رجحان عام ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس عہد میں بدھ کے چار قد آدم مجسموں کو تعمیر کر کے ہر صدر دروازے پر لگا دیا گیا۔ اس استوپ کے بارے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے، کہ اس کے گنبد کے نیچے مہاتما بدھ کے باقیات اور کلش بھی مدفون ہیں۔ اس کے علاوہ دروازوں، دیواروں اور کھمبوں پر گوتم بدھ کی زندگی کے مختلف مناظر کو بھی دکھلایا گیا ہے۔ ان کا بچپن، شادی، ازدواجی زندگی اور بعد میں دھیان، گیان اور نروان کی منزلوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔

استوپ نمبر ۲ سانچی کی مغربی ڈھلان پر پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے جو دوسری صدی قبل مسیح کے اواخر میں تعمیر کروایا گیا ہوگا۔ جہاں اب صرف ایک گنبد اور چہار دیواری ہے۔ یہ استوپ بدھ کے بعض راھبوں کی باقیات کا امین ہے۔ اسی استوپ کی دیوار پر پالی رسم الخط میں لکھی ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ بدھ مذہب کے دس اساتذہ اس جگہ پر خانقاہ میں قیام کرتے تھے۔ اُن کے انتقال کے بعد گنبد تلے انھیں کی باقیات کو یہاں محفوظ کر دیا گیا۔

استوپ نمبر ۳ بھی یہیں پر تقریباً ۴۵ میٹر کے فاصلہ پر شمال مشرق میں بنا ہوا ہے۔ اس کی تعمیر کی تاریخ بھی دوسری صدی قبل مسیح بتائی جاتی ہے۔ نیچے سے اوپر تک سلسلہ وار سیڑھیاں اس کی زینت ہے جہاں بالائی سطح پر ایک چھتری بنی ہوئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بدھ پیشوا اسی چھتری کے نیچے بیٹھ کر مراقبہ اور دھیان کی کیفیت میں رہتے تھے۔ یہاں کندہ ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ دو بدھ پیشوا ساری پتا سا اور مہا موگا لانا ساکی ارتھیاں اس کے نیچے دفن ہیں۔

ان تین استوپوں کے علاوہ باقی کے منہدم آثار سانچی میں ادھر اُدھر پھیلے ہوئے ہیں۔ سانچی میں تاریخی اعتبار سے یہاں کے کچھ یادگار مینار بھی قابل ذکر ہیں جو انھیں بدھ راہبوں کی یاد میں تعمیر کروائے گئے تھے۔ جن میں مینار نمبر دس "اشوک کے پیلر" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جس کا چمکدار پتھر اور آئینہ کی طرح چمکتی ہوئی پالش اس کے حُسن کو بڑھاتی ہے۔ اس پر

رکھی ہوئی تحریر کے ذریعہ مہاراجہ اشوک کا بدھ مذہب سے گہرا لگاؤ اور عقیدت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے اوپر ایک شیر کا سر (لوائن کیپٹل) بھی بنا ہوا تھا جو اب وہیں پر میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔

اس عہد کی بنی ہوئی سانچی میں کچھ خانقاہیں (MONASTERIES) بھی ہیں جو پہاڑ کی چوٹیوں پر تعمیر ہیں۔ حوالوں میں درج ہے کہ صدیوں تک یہ جگہ بدھ مذہب کے ماننے والوں کی آماجگاہ رہی ہے۔ جہاں بدھ راہب، پیشوا اور اُن کے شاگرد مذہب کے حصول کے لئے آتے تھے اور انھیں خانقاہوں میں ٹھہرتے تھے۔ ہر خانقاہ میں ایک کشادہ آنگن ہوتا تھا اور اطراف میں چھوٹے چھوٹے کمرے۔ ان میں سے خانقاہ نمبر ۱۸ اب تک کی دریافت کے مطابق سب سے بہترین فن تعمیر کا نمونہ ہے۔

سمراٹ اشوک کے بعد چند صدیاں گزرتے ہی بدھ مذہب کے ساتھ ساتھ ہندو مذاہب کے پیروکاروں نے بھی سانچی میں کچھ مندروں کی تعمیر بھی کروائی جس کا سلسلہ موریہ سے لیکر ۱۲ویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔ اس مدت میں کئی مندروں کی تعمیر ہوئی اور بدھ و ہندو مذاہب مشترکہ طور پر پروان چڑھتے رہے۔ ایسے ہی بعض مندروں کی تعمیرات آج بھی یہاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

چونکہ سانچی میں تقریباً ڈھائی ہزار سال کے آثارِ قدیمہ پائے جاتے ہیں۔ اس لئے اُن کو مزید نمایاں کرنے کے لئے وہاں آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا کی طرف سے ۱۹۱۹ء میں ایک میوزیم بھی بنایا گیا جہاں بدھ سے لیکر راجپوت عہد تک کے نوادرات محفوظ ہیں۔ آرٹ اور فنونِ لطیفہ کے نقطۂ نظر سے بھی سانچی کی یہ پرانی عمارتیں اس دور کی تہذیبی اور معاشی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ ساتھ ہی ہزاروں سال پرانے فن تعمیر میں کاریگروں اور فنکاروں کی چابکدستی اور باریک کاریگری کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اسٹوپ کے صدر دروازے پر عورتوں کے جسم کی بناوٹ، اُن کی زلفوں کی آرائش، اور فیشن نیز ملبوسات کی پیش کش قدیم ہندوستان کے لوگوں کے احساسِ لطیف کو ظاہر کرتی ہے۔ انکی زندگی کے مختلف گوشوں کو بے نقاب کرتی ہے۔ اسطرح سانچی کو آرٹ، آرکیٹکچر اور بدھ ازم کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو مجموعی طور پر ہر اعتبار سے یہ ایک قابلِ ذکر مرکز ہے۔ اس کی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر ابھی حال ہی میں سانچی کو عالمی وراثت کی عمارتوں کی فہرست میں شامل کر لیا گیا ہے۔

دہلی کے آثارِ قدیمہ

ھندوستان کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اور معاشرتی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو اس کا سلسلہ ہزاروں سال پرانی روایات سے جا ملتا ہے، جن میں ہڑپا، موہنجوداڑو، پاٹلی پتر، نالندہ اور ایسے ہی بعض پرانے شہر ہیں جن کی تہذیب اور تاریخ ہزاروں سال پرانی ہے۔ لیکن زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ یہ مذکورہ شہر بھی اپنی شان و شوکت کھو چکے ہیں۔ اب یہاں صرف ہزاروں سال پرانی تہذیب کے آثار تو مل جاتے ہیں لیکن موجودہ دور میں ان کی اب کوئی نمایاں حیثیت باقی نہیں رہی ہے۔ دلی ہندوستان کا ایک ایسا شہر ہے جہاں ہزاروں سال پرانی تہذیب کے آثار نمایاں ہیں۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین اور مورخین اس کی ہزاروں سال پرانی تہذیب کو تلاش کر رہے ہیں اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں دلی کو زمانۂ قدیم (Ancient age) سے سیاسی اور ثقافتی حیثیت حاصل رہی ہے۔ پرانے قلعہ اور شاہدرہ کے پاس کھدائی (Excavation) کے بعد جو آثار ظاہر ہوئے ہیں، اُن سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دلی شہر کا تہذیبی سلسلہ ہزار سال قبل مسیح سے جا ملتا ہے۔ مہابھارت کی ایک روایت کی رُو سے کوروں اور پانڈوں کی جنگ کے بعد یہ علاقہ جسے اب پرانہ قلعہ کہتے ہیں، پانڈووں کے حصہ میں آیا تھا۔ جسے اندرپرست کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد صدیوں تک دلی کی تاریخ کا کوئی معتبر سراغ نہیں ملتا ہے۔ قطب مینار کے پاس بنی ہوئی مسجد "قوۃ الاسلام" کے صحن میں نصب

لوہے کی ایک لاٹ پر جو کتبہ لکھا ہوا ہے۔ اس سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ راجہ اننگ پال نے ۱۰۵۳ء میں دلی کو بسایا تھا، جسے اس زمانے میں دلی کے بجائے دہلو کہا جاتا تھا۔ آج بھی اس دور کے چند آثار قدیمہ دہلی میں موجود ہیں جو تغلق آباد سے تقریباً ۷ کلومیٹر کے فاصلہ پر مشرق اور جنوب کی جانب اننگ تالاب اور سورج کنڈ کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں ۱۱۹۲ء میں مسلمانوں کی حکومت کے بعد دلی کی اہمیت میں قابل ذکر اضافہ ہوا ہے۔ سوائے چند مسلمان بادشاہوں کے بیشتر نے دہلی کو اپنا پایہ تخت بنا کر اسے سیاسی مرکزیت بخشی۔ پہلی بار جب مسلمان بادشاہوں نے ۱۲ویں صدی کے اواخر میں دہلی پر قبضہ کیا تو اس وقت یہاں کا راجہ پرتھوی راج چوہان دہلی پر قابض تھا۔ شہاب الدین محمد غوری یا ابن سام نے پرتھوی راج کو شکست دیکر دہلی کو حاصل کر لیا اور قلعہ رائے پتھوڑا اور قطب مینار کے آس پاس علاقہ کو اپنی آماجگاہ بنایا، پھر فوراً ہی قطب الدین بادشاہ نے ہندوستان میں مملوک یا (SLAVE) خاندان کی بنیاد ڈالی۔ قطب الدین ایبک سے لیکر آخری مسلمان بادشاہ بہادر شاہ ظفر تک یعنی ۱۱۹۳ء سے ۱۸۵۷ء تک تقریباً (۷۰۰) سال کے عرصہ میں مسلمان بادشاہوں نے دہلی پر حکومت کیا اور سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور تعمیری ہر لحاظ سے دہلی شہر کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی کوشش کی۔ ان سات سو سال کے عرصہ میں ان گنت عمارتیں، مقبرے، مینار، دروازے، تالاب، مسجدیں، قلعہ، باغات، راستہ اور مدرسہ بنائے گئے ہیں۔ جن میں سے ہر عمارت اپنے اپنے دور کی فن معماری اور فنکاری کی انفرادی خوبیوں کے ساتھ جانی پہچانی جاتی رہیں۔ ان میں سے بہت سی عمارتیں، قلعہ، مقبرے اور مسجدیں وغیرہ حالات کی ستم ظریفی کی وجہ سے نیست و نابود ہو گئیں۔ اس کے باوجود ہزاروں کی تعداد میں آج بھی بہت سارے آثار قدیمہ موجود ہیں، جن سے اس دور اور زمانے کی تہذیب اور فن معماری کی خصوصیات کا پتہ چلتا ہے۔ مختلف اور منفرد دور کے بادشاہوں، وزیروں اور امیرزادوں نے اپنے اپنے شوق پورے

گئے۔ عمارتیں اور محل بنوائے۔ اُن کی دیواروں اور چھتوں پر نقش ونگاری اور دست کاری کے فن ظاہر کئے جن میں سے موٹے طور پر یہ عمارتیں دہلی کی بتدریج تاریخ پر روشنی ڈال سکتی ہیں۔

قطب الدّین ایبک نے قصرِ سفید نامی ایک محل تعمیر کروایا اور قطب مینار کی تعمیر کا کام شروع ہوا۔ شمس الدین التمش نے قطب مینار مکمل کروایا اور مسجد قوۃ الاسلام کی تعمیر مکمل کی۔ غیاث الدین بلبنؔ نے غیاث پور، نامی شہر بنوایا۔ معزالدین کیقباد نے کیلو کھڑی شہر آباد کیا۔ جلال الدّین خلجی نے کشکِ لعل کی تعمیر کروائی۔ علاؤالدین خلجی نے کشکِ سیری اور ایک نیا شہر بنوایا۔ غیاث الدّین تغلق نے تغلق آباد، اور محمد تغلق نے شاہ پور آباد کیا۔ فروز شاہ تغلق نے فروز آباد جسے اب فروز شاہ کوٹلہ کہا جاتا ہے، تعمیر کروایا۔ مبارک شاہ نے مبارک آباد کی بنیاد ڈالی۔ ہمایوں نے دین پناہ کے نام سے موجودہ پرانے قلعے کو موسوم کیا۔ شیر شاہ نے شیر منڈل، کئی دروازے، مساجد، اور شیر شاہ روڈ بنوایا اور آخر میں نمایاں طور پر شاہجہاں نے لال قلعہ، جامع مسجد اور شاہجہاں آباد نامی شہر آباد کیا۔ اور اس طرح غلام، تغلق، خلجی، سید، لودھی، سور اور مغل دورِ حکومت میں انگنت تعمیراتی کام ہوئے۔ جن کی بنا پر آج بھی دہلی کو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں ادبی، ثقافتی، تہذیبی اور تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد سے نہ صرف دہلی بلکہ پورے ہندوستان کی باگ ڈور انگریز حکمرانوں کے ہاتھ آگئی۔..... انہوں نے اپنے گذشتہ بادشاہوں کی طرح ۱۹۱۱ء میں دہلی ہی کو دارالسلطنت بنایا۔ انگریزوں نے بھی اپنے طرز کی عمارتیں دفاتر اور رہائش گاہیں بنوانا شروع کیں۔ لیکن ہزاروں کی تعداد میں پھیلی ہوئی پرانی عمارتیں اور رائے سینا پہاڑی پر موجود صدر جمہوریۂ ہند کی عمارت بنوائی۔ مقبرے، مسجدیں اور قلعہ کی دیکھ بھال کا مسئلہ بھی درپیش ہوا جس کی وجہ سے ۱۸۶۱ء میں محکمۂ آثارِ قدیمہ یعنی (ARCHAEOLOGICAL SURVEY OF INDIA) کا وجود ہوا جس کو یہ ذمہ داری دی گئی کہ نہ صرف دہلی میں بلکہ پورے ہندوستان کی تمام پرانی عمارتوں

کی دیکھ بھال کی جائے۔ ان کی تعمیراتی اور تاریخی پہلوؤں پر غور کیا جائے۔ اُن پر لکھی ہوئی تحریروں پر ریسرچ کی جائے اور وہ آثار جو مدفون ہیں، اُن کی تلاش کی جائے۔ چنانچہ ماہرین آثارِ قدیمہ نے تفتیش کے ذریعہ بہت کچھ کام کیا اور ایسی ایسی مفید اور کار آمد کتابیں لکھیں جن سے آج بھی ہمیں آثارِ قدیمہ کے بارے میں خاطر خواہ معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔ ہر زبان اور ہر مذہب کے لوگوں نے کتابیں لکھیں، جن میں انیسویں[19] صدی کی بعض کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔ مثال کے طور پر "سیر المنازل از سنگین بیگ" شیام پرشاد منشی کی ایک کتاب اور "واقعات دار الحکومت دہلی" از منشی بشیر احمد "آثار الصنادید" از سر سید احمد خان۔ ان مذکورہ کتابوں کو پڑھنے سے بعض ایسی عمارات کا بھی علم ہوتا ہے جو اب موجود نہیں ہیں لیکن کسی زمانے میں اُن کا بھی وجود تھا۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں باقاعدہ حکومت کی طرف سے ایک ایکٹ نافذ کیا گیا کہ وہ تمام عمارتیں یا اشیاء جو کم از کم سو سال پرانی ہیں، وہ سرکار کی میراث ہیں اور کوئی بھی ان کو اپنے ذاتی ملکیت کے طور پر استعمال نہیں کر سکتا۔ یا اگر کوئی انہیں نقصان پہونچانے کی کوشش کرے گا تو حکومت اس کو مناسب سزا بھی دے سکتی ہے۔ اس طرح تمام دہلی اور پورے ملک کے آثارِ قدیمہ کی حفاظت کی جانے لگی۔ مختلف اشیاء کی حفاظت اور ان کی ریسرچ کے لئے میوزیم اور سوسائٹیز بنائی گئیں۔ لاکھوں روپیہ عمارتوں کی دیکھ بھال اور اُن کی مرمت کے لئے خرچ کیا جانے لگا۔ آج بھی پورے دہلی میں تقریباً ۱۳۰۰ سو عمارتیں موجود ہیں جن میں ۲۶۳ آثارِ قدیمہ مرکزی محکمۂ آثارِ قدیمہ کے زیرِ نگرانی ہیں۔ کچھ دہلی ایڈمنسٹریشن کی دیکھ بھال کے تحت ہیں۔ کچھ وقف کی نگرانی میں ہیں اور باقی عمارتیں زمانے کی ستم ظریفی کا شکار ہیں۔ اگر دہلی کی تمام پرانی عمارتوں کی خصوصاً دیکھ بھال اور مرمت کی طرف توجہ کی جائے تو کروڑوں روپیہ درکار ہوگا۔ تاہم حکومتِ ہند آج بھی حتی الامکان کئی کروڑ روپیہ ان آثارِ قدیمہ کی دیکھ بھال پر خرچ کرتی ہے۔ جس شہر میں قطب مینار، ہمایوں کا مقبرہ، علائی دروازہ، فیروز شاہ کوٹلہ، تغلق کا مقبرہ، جامع مسجد اور لال قلعہ جیسی عظیم الشان عمارتیں موجود ہوں، بھلا اس شہر کی تاریخی

اہمیت کو کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے؟ مسجد "قوۃ الاسلام" Quwwat-ul-Islam
جو قطب مینار سے ملی ہوئی ہے جس کو بارہویں صدی کے اواخر میں قطب الدین ایبک اور پھر بعد میں شمس الدین بادشاہ نے بنوایا تھا۔ ایک طرف تو وہ مسلمانوں کی عبادت گاہ ہے تو ساتھ ہی ہندو مسلم فن معماری کا دلچسپ نمونہ بھی ہے۔ اس کی چھتیں، اس کے دروازے، اس کے دالان اور اس کی دیواروں پر بنی ہوئی جین مذہب کے دیوتاؤں کی مورتیاں ہندو مسلم فن معماری کا ملا جلا نمونہ ہیں۔ اس مسجد کو مسلمان بادشاہ کے اشارے پر ہزاروں ہندوؤں نے مل کر بنایا تھا۔ اسی طرح قطب مینار ہی کے پاس بنا ہوا علائی دروازہ جس کو علاؤ الدین خلجی نے بنوایا تھا۔ وہ پہلی عمارت ہے جس کو اسلامی طور طریقہ اور محراب کے مطابق دہلی کی ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی لاجواب عمارت ہے جس کو اسلامی طرز کی عمارتوں میں پہلی کڑی کہا جاتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو غلام خاندان سے لے کر مغلیہ دور تک ہر حکومت کی تعمیرات کی کچھ امتیازی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر آج بھی آثارِ قدیمہ اور پرانی عمارتوں کو پہچانا جا سکتا ہے۔ کہ وہ کس دَور اور کس دورِ حکومت کی ہیں۔ مثال کے طور پر ابتدائی غلام خاندان کے آثارِ قدیمہ میں اسلامی تعمیرات کا کوئی واضح نشان نظر نہیں آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے تنگ دروازے، نیچی اور سپاٹ چھتیں، سیدھے اور سپاٹ دروازے اور کھڑکیاں عام طور پر سرمئی پتھروں کی بنی ہوئی ہیں اور اُن پر اُبھرے ہوئے نقوش دفن خطاطی کے نمونے نظر آتے ہیں۔ خلجی دورِ حکومت کی عمارات نسبتاً زیادہ منقش اور بڑی نظر آتی ہیں۔ اُن کی چھتیں بھی بلند ہیں اور دروازے بھی محراب دار اور کشادہ ہیں اور محراب کی شکل بالکل گھوڑے کی نعل کی شکل کے ہوتے ہیں جس کی واضح مثال علائی دروازہ ہے۔ تغلق دور کی عمارات بلند، کشادہ، سرخ اور سرمئی پتھر کی ملی جلی ہوتی ہیں فنِ خطاطی کے نمونوں کا کافی استعمال ہوا ہے اور اسلامی فن کا باقاعدہ مظاہرہ کیا گیا ہے اور لودھی دَور کی عمارتیں نسبتاً زیادہ خوبصورت، رنگ برنگے پتھروں اور ٹائل سے بھری ہوئی ہیں۔ جیسے جمالی کمالی مسجد، اور مقبرہ اور پھر مغل دورِ حکومت میں

تو فنِ معماری میں نمایاں اور زبردست تبدیلی اور ترقی نظر آتی ہے، جس کی جیتی جاگتی مثالیں دلی کے ہمایوں کے مقبرے، عبدالرحیم خانِ خانہ کا مقبرہ، صفدر جنگ کا مقبرہ، لال قلعہ، جامع مسجد اور دوسری بعض عمارتوں میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ مغلیہ دور میں پتھر کے ساتھ سنگِ مرمر کا بھی خوب استعمال ہوا ہے۔ محراب خمیدہ تراشیدہ ہیں۔ دیواروں اور چھتوں پر بیل بوٹوں اور پھل پھولوں کی مینا کاری اور مرصع کاری ہے۔ سونے چاندی کا استعمال بھی نظر آتا ہے۔ چار باغ طریقہ پر باغات بھی نظر آتے ہیں اور دیواروں پر فنِ خطاطی کے فارسی اور عربی نمونے بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

دہلی کے آثارِ قدیمہ آج بھی گذشتہ ہزاروں سال پرانی تاریخ اور تہذیب کا اظہار کر رہے ہیں جن میں ہر دور اور ہر زمانہ پوشیدہ ہے۔ خصوصاً اسلامی طرز کی عمارتیں اور اُن کی بتدریج ترقی اور تغیر کی مکمل اور جامع شکل بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

ریڈیو فیچر

کھجوراہو

۱۔ مندروں میں گھنٹوں کی آواز

۲۔ ستار یا بعض دوسری موسیقی

۳۔ پانی گرنے اور بہنے کی آواز

۴۔ بندیل کھنڈ کا لوک گیت

۵۔ میلے ٹھیلے کی آوازیں

موسیقی

ہندوستان کے اس وسیع و عریض کینوس پر کچھ علاقے ایسے بھی ہیں جنہیں جغرافیائی نقشہ میں زیادہ اہمیت نہیں مگر وہ اپنی تہذیب اور تاریخی پس منظر کی بنا پر پوری دنیا میں جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک چھوٹا سا مگر بین الاقوامی شہرت یافتہ شہر کھجوراہو ہے جو مدھیہ پردیش کے ضلع چھتر پور میں ایک ہزار سال پرانے تہذیبی نقوش کی نشاندہی کرتا ہوا آج بھی بے شمار شائقین کی دلچسپی کا مطمعٔ نظر بنا ہوا ہے... موسیقی ــــ

کھجوراہو سیر و سیاحت کا ایک ایسا مرکز ہے جہاں ہر سال ہزاروں کی تعداد میں زائرین اور سیاح دنیا کے کونے کونے سے آتے ہیں اور اپنی تشنہ خواہشات کو مندروں پر بنی ہوئی مورتیوں کے دیدار سے پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔

یہ شہر سخت چٹیل میدانوں اور کھردری زمین پر بسا ہوا ہے جس کے اطراف مہوبہ، ستنا، پنّا، اور جھانسی جیسے شہر آباد ہیں۔ دلّی سے لگ بھگ چار سو کلومیٹر کی دوری کو ہوائی جہاز

اور زمین کے راستہ سے طے کیا جا سکتا ہے مگر ریل گاڑی کی پٹریاں ابھی تک کھجوراہو کی مقدس زمین کو چھو نہیں پائی ہیں۔

یہ وہ قدیم ہندوستان کی تہذیب ہے جس نے ہر عہد میں سطح زمین پر کچھ ایسی انفرادی شناخت کے انمٹ نقش ثبت کر دیے ہیں جس پر زمانہ بڑے شوق سے نظریں جمائے تکتا رہتا ہے اور قدرت نئی زندگی کے پیکر تراشتی ہوئی دبے قدموں سے ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔ انسان چلے جاتے ہیں، قومیں فنا ہو جاتی ہیں، حکومتیں مٹ جاتی ہیں، لیکن باقی رہ جاتی ہیں پتھر اور گارے سے بنائی ہوئی وہ عمارتیں جو ان کی تہذیب، اُن کے معاشرے، اور ان کے صادق جذبوں کا پتہ دیتی ہیں۔

باقی رہ جاتے ہیں وہ مندر اور عبادت گاہیں، جن کی پاکیزگی اور عقیدت انسان کو اپنے آگے سجدہ ریز ہونے پر آمادہ کرتی رہتی ہیں۔ باقی رہ جاتی ہیں وہ یادیں جن کا سفر تاریخ کے اوراق میں سینہ بہ سینہ محفوظ ہوتا ہوا ماضی، حال اور مستقبل کے وسیع حلقہ میں پھیلتا جاتا ہے۔ اور باقی رہ جاتی ہے وہ سوہندی مٹی جس کی مہک اس مادر وطن کی عظمت کا یقین دلاتی رہتی ہے۔ مندروں کا ایک ایسا ہی تاریخی سلسلہ کھجوراہو میں آج بھی ایک ہزار سال پرانی داستان سنا رہا ہے۔

(مندروں میں گھنٹیاں بجنے کی آوازیں)

ابھی دسویں صدی عیسوی کا آغاز ہی ہوا تھا مگر جب پرتیہارہ Parathara حکمرانوں کا پورے وسط ہندوستان میں طوطی بول رہا تھا۔۔ پورا مدھیہ پردیش بُدھ، ہندو اور جینی مذاہب کی سرگرمی میں اپنی تہذیب کے نقوش مرتب کر رہا تھا۔ شُنگ، کشان، اور گپتا راجاؤں کے بنائے ہوئے مندر، تالاب، اور قلعہ تعمیر ہو چکے تھے۔ دیوگڑھ، مہوبہ، ودیشا، اور جھانسی میں عمارتوں کا ایک طویل سلسلہ پھیلتا جا رہا تھا۔

مگر وقت نے کروٹ لی اور پرتیہارہ حکومت کا سورج ڈوبنے لگا۔ اسی پس منظر میں کھجوراہو کی سرزمین پر چندیلا حکومت کا نیا سورج طلوع ہو گیا۔ جس کی باگ ڈور ایک جواں سال اور نوعمر راجہ یشو ورمن نے سنبھالی، اور ۹۱۷ء سے کھجوراہو کی

کی سنگلاخ اور بنجر زمین پر چندیلا حکومت کی جڑیں اس طرح پیوست ہوگئیں جو جلد ہی ایک ایسا تن آور درخت بن گیا جس کی چھاؤں میں پورا ہندوستان عافیت محسوس کرنے لگا۔
(موسیقی)

راجہ یشوورمن نے نہ صرف مخالف حکومتوں کے حملوں کا مقابلہ کیا بلکہ اپنی حکومت کو اس قدر زیادہ مضبوط کرلیا کہ تھوڑی ہی مدت میں کھجوراہو کو سیاسی، تہذیبی، اور مذہبی مرکز کے طور پر جانا جانے لگا۔ اس نے یہاں تالاب، قلعہ، محل اور مندر بنوائے اور ایک چھوٹے سے گاؤں کے بجائے اب کھجوراہو میلوں دور تک پھیلا ہوا ایک وسیع و عریض علاقہ میں تبدیل ہوگیا۔

تقریباً تیس سال کی مدت میں اس چندیل راجہ نے کھجوراہو کو نہ صرف ایک سیاسی مرکزیت بخشی بلکہ ایک ایسے آرٹ اور فنِ تعمیر کا مظاہرہ کیا جس سے اُس دور کے بنائے گئے مندروں کے تقدس کو ایک نیا آہنگ میسّر ہوا، اُن پر تراشیدہ مورتیوں کی دل کشی کو ایک نیا آکار عطا ہوا۔ اور فنِ تعمیر کو ایک نئی شکل اور نئے مزاج سے روشناس کرایا گیا۔

کھجوراہو کی ترویج و ترقی میں راجہ یشودرمن کا عہد اس اعتبار سے بھی قابلِ تعریف ہے کہ اس نے مندروں کے تعمیری ڈھانچہ کو ایک انفرادی شکل عطا کی اور تمام مندروں کی بنیاد اونچے اور کشادہ چبوترے پر رکھی۔

مندروں کی دیواروں پر نہایت ہی تناسب سے دیوی دیوتاؤں کی شبیہوں کے علاوہ عام انسانی زندگی کے شب و روز کی سچّی تصویر کشی کی، اور مورتیوں کی تراش خراش کے جوہر کا بھرپور مظاہرہ کیا کہ دیکھنے والا آج بھی ششدر رہ جاتا ہے۔

کرنوں سے تراشا ہوا اک نور کا پیکر
شرمایا ہوا خواب کی چوکھٹ پہ کھڑا ہے
(ستار کی موسیقی)

یشوورمن کی عظمت اور مندروں کی تعمیر میں اس کی خصوصی دلچسپی کا اندازہ اس تحریر سے بھی لگایا جاسکتا ہے جو اس کے بیٹے راجہ ڈھینگا نے اپنے عہد حکومت میں لکشمن

(Temple) مندر کی چوکھٹ پر کندہ کروائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ :—

راجہ یشو ورمن دیوا نے اپنے عہد میں کھجوراہو کی دھرتی پر شاندار وشنو مندر کے علاوہ بہت سے دوسرے مندروں اور تالابوں کی تعمیر کروائی، یہ مندر اپنے دور کے تمام مندروں سے زیادہ مزین، آراستہ اور بلند ہونے کے ساتھ ساتھ پورے بھارت میں اس نگری کو اوّلیت کا درجہ عطا کرتے ہیں۔

اس طرح یہ عہد ساز راجہ تیس سال سے بھی زیادہ عرصہ تک شاندار مظاہرہ کرنے کے بعد سنہ ۹۵۰ء میں کھجوراہو کے ماتھے پر چمکتا ہوا جھومر سجا کر رخصت ہوگیا جس کی چکا چوند کر دینے والی روشنی سے ساری کائنات جگمگا اٹھی اور چندیلا حکومت کی باگ ڈور اُس کے بیٹے راجہ ڈھینگا کے ہاتھ میں آگئی۔ (موسیقی)

اس نے بھی کھجوراہو کو مزید پر رونق بنایا اور سنہ ۹۵۰ سے سنہ ۱۰۰۸ء تک کے عرصہ میں کئی نمایاں مندروں کی تعمیر کی۔ جن میں وشوا ناتھ اور پارسوا ناتھ مندر آج بھی اپنی پرشکوہ عظمت کے امین ہیں — اونچے چبوترے پر بنے ہوئے مندروں کی دیواروں پر خوبصورت اور دلکش مورتیوں کا ایک طویل سلسلہ ناظرین کو عقیدت کے جذبے سے سرشار کرتا ہے اور ساتھ ہی اپنے عہد کے معاشرے کے مختلف طبقوں کی عکاسی بھی کرتا ہے۔

آج سے ایک ہزار سال پہلے کے نظام حکومت کی نمائندگی کرتی ہیں وہ مورتیاں جہاں انسان اس وقت بھی مختلف طبقوں میں بٹا ہوا تھا، جہاں طاقتور اور کمزور کا فرق دولت کے حصول سے کیا جاتا تھا۔ جہاں آقا اور غلام کے حقوق یکساں نہ تھے، اور جہاں عورتیں بہر حال مردوں کے تعیش پرستی کا شکار تھیں۔

کھجوراہو میں بنے ہوئے ان مندروں کی محض تاریخی یا مذہبی اہمیت ہی نہیں ہے بلکہ یہ اپنے عہد کا وہ منظر نامہ بھی پیش کرتے ہیں جس میں اس دور کا انسان زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ رشتوں سے بالاتر ہو کر جنس کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا۔ اور مذہبی رہنماؤں کا کیا ردّ عمل ہوتا تھا — مندر کی دیواروں پر تراشی ہوئی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی وہ تصویر کشی کی گئی ہے جو اس زمانے کی آئینہ دار ہیں۔ (موسیقی)

یکے بعد دیگرے اس دھرتی پر کئی اور چندیل حکمراں آئے اور مندروں کی تعمیر میں اضافہ کرتے رہے۔ نتیجہ کے طور پر جگدمبی مندر، چتر گپتا، مہادیوا، اور چتر بھج جیسے معرکتہ الآرا ہ مندروں کی تعمیر سے کھجوراہو کی سرزمین انعام تقدس پاتی رہی۔

کہا جاتا ہے کہ ڈھائی سو سال کے عرصہ میں چندیل راجاؤں نے ۸۵ مندروں کی تعمیر اِس علاقہ میں کی جن میں سے اب صرف ۲۵ مندروں کو دیکھا جاسکتا ہے اور باقی کے منہدم نشانات کا دبی ہوئی زمین میں سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ اس کے باوجود اِس مقام کو جو شہرت اور ابدیت حاصل ہوئی ہے اس کی سب سے اہم وجہ یہاں کے انفرادی شناخت رکھنے والے مندر ہیں ــــ (موسیقی)

کھجوراہو کی تاریخ بہت قدیم ہے، کہا جاتا ہے کہ عہد کشان ہی سے یہ علاقہ ایک چھوٹے سے گاؤں کی شکل میں آباد تھا۔ اس کے ایک کنارے پر کھجورا یا نوراتال ہے اور دوسرے کنارے پر مزدور اور غریب آبادی رہا کرتی تھی۔ کھجر نپا، کھرجورا، واہکا اور کھجوراہا جیسے ناموں سے گزرتا ہوا اب کھجوراہو کہلاتا ہے مگر جو اہمیت اس کو راجاؤں نے دسویں صدی میں دی ہے اس سے پہلے کسی اور کی اس پر توجہ نہ ہوئی تھی۔

گیارہویں صدی عیسوی کے اوائل ہی سے اس کو شمالی اور وسطِ ہندوستان کی ایک اہم راجدھانی تسلیم کیا جانے لگا، اور تبھی سے یہ ایک زیارت گاہ بھی ہے اور ہزاروں سیّاحوں کی دلچسپی کا ایک اہم مرکز بھی۔ مشہور سیّاح اور مؤرخ ابوریحان البیرونی نے بھی کھجوراہو کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

اس عہد کی تعمیر کئے ہوئے یہ مندر اپنی شکل اور نوعیّت کے حساب سے بے مثال ہیں۔ یہ مذہبی بھی ہیں اور تہذیبی بھی۔ ان کو دیکھنے سے دسویں صدی کے ان فنکاروں اور مزدوروں کی تخلیقی ہنرمندی کا پتہ چلتا ہے۔ جنھوں نے عقیدت، احترام اور پوری لگن کے ساتھ ایسی دیدہ زیب عمارتوں کی تعمیر کی ہے ــــ اُن چندیل راجاؤں کے احساسِ جمال کا اندازہ ہوتا ہے جن کی خواہش پر ان مندروں کو عالمِ وجود میں لایا گیا۔

(گھنٹوں کی آواز)

بارہویں صدی کے اختتام تک ان راجاؤں کی طاقت کمزور پڑنے لگی۔ اس حکومت کا آخری چشم چراغ ودّیا دھارا دیبیک اُس آخری لَو کی مانند یاد کیا جاتا ہے جس نے بجھنے سے پہلے ایک بار پھر کھجوراہو کی سرزمین کو مندروں کی نعمت سے اور بھی مالا مال کردیا۔ چندیلا حکومت تو دھیرے دھیرے ختم ہوگئی مگر اس شہر کے دامن میں مندروں کا ایک ایسا خزانہ بھر گئی جس کے سبب سے یہ ہمیشہ اور ہر دور میں ہر خاص و عام کی توجہّ کا مرکز بنا رہا۔ (ستار کی افسوس والی موسیقی)

چندیلا حکومت کا وجود، اور کھجوراہو کی سرزمین پر مندروں کی تعمیر کی بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ دلّی اور قنوّج کے راجہ پرتھوی راج چوہان کے درباری شاعر چند بردائی نے اپنی رزمیہ تصنیف میں ایک واقعہ بیان کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ پرتیہارہ دور حکومت کے آخری زمانے میں بنارس کے ایک پجاری کی بیٹی ہیمو تی تھی۔ عین جوانی کے عالم میں صرف سولہ برس کی عمر میں یہ عورت بیوہ ہوگئی۔

ایک رات پورن ماشی کا چاند اپنی منوّر کرنوں کے ساتھ زمین پر چاندنی بکھیر رہا تھا۔ ہیم وتی مدہوشی اور بے خوابی کے عالم میں گنگا کے کنارے چلی گئی۔ چاندنی کی دُھلی ہوئی شفاف روشنی میں گنگا کے صاف اور ٹھنڈے پانی میں وہ نہانے لگی۔ دریا کی موجوں میں تیرتی ہوئی ہیم وتی کے جسم پر چندر یعنی چاند کی نظر پڑ گئی اور یہ دیوتا اُس جوان اور حسین عورت کے حسن کی تاب نہ لاکر خود گنگا کے کنارے اتر آیا۔ چاند کی کرنیں ہیم وتی کے جسم میں سرایت ہونے لگیں۔ اور قدرت کے ہاتھوں ایک نئی زندگی کی تخلیق ہونے لگی۔

(موسیقی) (پانی بہنے کی آواز)

ہیم وتی ایک بیوہ تھی مگر اب وہ ایک ماں کا پیکر لینے والی تھی۔ اُسے بدنامی کا خوف ہوا۔ مگر چندرما نے اس کے قریب آکر کہا کہ وہ عنقریب ایک ایسے بچّے کو جنم دے گی جس پر چاند کا وردان ہوگا وہ ایک شکتی شالی راجہ بنے گا اور کھجوراہو کے مقام پر چندیلا حکومت کی بنیاد ڈالے گا۔ جب تمہاری سنتان ۸۵ مندر بنوائے گی تب تمہارے پاپ

ڈھل جائیں گے اور تمہارے گناہ کا کفارہ بھی ادا ہو جائے گا۔ یہ پیشن گوئی سچ ہوئی اور ہیم وتی نے اپنے بچے کا نام چندر ورمن یعنی چاند کا بیٹا رکھا۔

یہی بیٹا لیشوورمن کے نام سے بھی جانا جاتا ہے جس نے کھجوراہو کی سنگلاخ زمین کو مندروں کی پاکیزگی سے سرسبز و شاداب کر دیا۔ تاریخ اور مذہبی کتابوں میں ایسے بہت سارے واقعات ملتے ہیں جنھیں بظاہر انسانی عقل تسلیم کرنا نہیں چاہتی مگر ایسی ہی بہت ساری داستانوں کو روایت کا ایک حصہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔ ہیم وتی اور چاند دیوتا کا قصہ کہاں تک صحیح ہے اس سے قطع نظر یہ حقیقت ہے کہ ان راجاؤں نے متواتر اپنی فہم و ادراک سے کھجوراہو کو بین الاقوامی شہرت عطا کی۔

ـــــ موسیقی ـــــ

۱۳۳۵ء میں مشہور سیاح ابن بطوطہ نے بھی کھجوراہو کا دورہ کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ شہر چھوٹا ہے مگر بہت سے تالاب یہاں کی آب و ہوا کو ٹھنڈک بخشتے ہیں، یہاں مندروں کا ایک طویل سلسلہ کئی میل تک پھیلا ہوا ہے۔ اُن پر جڑی ہوئی پتھروں کی مورتیاں قابلِ تعریف ہیں۔ بھورے اور زرد رنگ کے پتھروں سے بنے ہوئے یہ مندر فن تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں ـــــ یہاں کے بازاروں اور میلوں ٹھیلوں میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ نہایت شیریں اور نرم ہے۔

(میلے ٹھیلے کی آواز)

یہی وہ علاقہ ہے جہاں بندیل کھنڈ کی انفرادی تہذیب بھی ۱۴ویں صدی کی ابتدار میں نمودار ہوتی ہے۔ اس کی بولی اور لب و لہجہ میں مختلف جگہوں کی زبان کی مٹھاس رچی بسی ہے۔ جھرنوں کا ترنم اور کھیتوں کی سرسراہٹ ہے۔ پہاڑوں کی گونج اور میدانوں کی روانی ہے ـــــ مندروں کے اطراف گائے جانے والے اس علاقے کے گیت آواز اور مورتیوں کا ایک ایسا سنگم پیش کرتے ہیں جیسے پتھر گیت گا رہے ہوں اور خود دیوتا انھیں سُن رہے ہوں۔

ـــــ بندیل کھنڈ کا لوک گیت ـــــ

کھجوراہو کو بنیادی طور پر جو اہمیت اور شہرت حاصل ہوئی ہے اس کا سبب وہاں کے تاریخی اہمیت کے حامل مندر ہیں جو بھگوان شیو، وشنو، اور جین فرقہ کے ماننے والوں نے یکے بعد دیگرے تعمیر کئے ہیں ان کی تعمیر میں مکمل اور متناسب سنگ تراشی کا بہترین مظاہرہ کیا گیا ہے۔ ان مندروں کی اہم خصوصیت ان کی دیواروں پر بنی ہوئی وہ مورتیاں ہیں جن کو آسانی کے ساتھ پانچ حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلی خصوصیت وہ مجسّمے ہیں جو مختلف دیوی دیوتاؤں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان سے نہ صرف ہندو عقائد پر روشنی پڑتی ہے بلکہ پورے مذہب کی سلسلہ وار تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

دوسری قسم یکشی اور یکشنی کی وہ مورتیاں ہیں جو انسانی شکل میں ہونے کے باوجود مافوق الفطرت عناصر کی عکاسی ہیں۔ ان کے ہاتھ، سر، اور جسم کے بعض حصّے انسانوں کی شکل سے مختلف ہیں۔

تیسری اور اہم قسم اُن حسین عورتوں اور دوشیزاؤں کی مورتیاں ہیں جن کی شکل و صورت کے علاوہ اُن کے لباس، زیورات اور آسائش کے وہ سامان ہیں جو عورتوں کے حسن کو نکھارنے میں کام آتے ہیں۔ عورتوں کی یہ مورتیاں مختلف انداز اور رقص کے متعدد موڈ کے اظہار کی بھی مظہر ہیں۔ کنول کے پھول، آئینہ، جام و مینا اور دوسرے سامان زیبائش کے ساتھ ان کا حسن زندگی کی نئی تفہیم پیدا کرتا ہے۔ (موسیقی)

چوتھا اور سب سے منفرد انداز وہ نمایاں مجسّمے ہیں جو عام انسانی زندگی کے شب و روز کا اظہار ہیں جن میں جنس کے عنصر کو خصوصی طور پر ابھارا گیا ہے۔ جن میں انسانی جذبے اور مستی کی مختلف کیفیات کو پتھروں پر تراشا گیا ہے۔

پانچویں قسم وہ ہے جن میں جانوروں کے ذریعہ طاقت اور غیر انسانی فطرت کے حقائق کا انکشاف ہے۔ ہاتھی، شیر، نندی، ویال اور بعض دوسرے جانوروں کی شبیہیں بھی بنائی گئی ہیں جن کی ہندو دیومالا میں ہمیشہ سے اہمیت رہی ہے۔

کھجوراہو کے مندروں کا ایک طویل سلسلہ مغرب، مشرق اور جنوب کی سمتوں میں پھیلا ہوا ہے جن میں مغربی مندر اپنی خوبصورتی اور فن تعمیر کے تمام اسلوب کے لحاظ سے سب سے نمایاں اور اہم ہیں۔

موسیقی

کھجوراہو کے مندروں کی سب سے انفرادی اور نمایاں وہ مورتیاں ہیں جن میں EROTIC ART یعنی جنسی مناظر کی تصویر کشی ملتی ہے — انھیں دیکھ کر یہ احساس بھی اجاگر ہوتا ہے کہ مندر جیسی مقدس جگہ پر جنسی مناظر کا کیا مطلب ہے۔

ہمارے مؤرخین اور آثار قدیمہ کے بعض ناقدین کا یہ خیال ہے کہ جس طرح ذہنی آسودگی ایشور تک رسائی کا ایک ذریعہ ہے اسی طرح مرد اور عورت کے باہمی رشتوں کی جسمانی لذّت اور آسودگی بھی انسان اور بھگوان کو جوڑنے والی ایک کڑی ہے۔

(خوشی کی موسیقی)

یوں بھی جنسی خواہش ہر دور، ہر طبقہ اور ہر مذہب میں ہمیشہ سے جانی اور برتی جاتی رہی ہے — اس عمل کا مذہبی رسوم سے بھی براہ راست تعلق ہے اور تقریباً ہر دھرم میں اس کی افادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ قدیم کتابوں میں بھی کام سوتر کے ذریعہ اس موضوع کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ ہر معاشرے کا ایک اہم عنصر رہا ہے پھر ایک سچی حقیقت کا اظہار کسی طور پر بھی بے جا نہیں کہا جا سکتا۔

جنسی ہم آہنگی محض لذت اور عیاشی کا ایک ذریعہ ہی نہیں یہ ایک ایسا مقدّس عمل ہے جس سے کائنات کی تخلیق ہوتی ہے یہ ایک ایسا بندھن ہے جو سماجی رشتوں کو اور بھی مضبوط کرتا ہے یہ معاشرتی نظام کو نئے فکر اور نئے عمل کی دعوت دیتا ہے۔ فرق صرف اس کو برتنے اور سمجھنے کا ہے۔

اس طرح کی بہت سی تاویلیں پیش کی جا سکتی ہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ پتھروں کو تراش کر انسانی جذبے کی مختلف کیفیات کا اظہار کھجوراہو

کے مندروں سے بہتر دنیا کے کسی بھی حصے میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ اور یہی آرٹ ان مندروں کو دنیا کے ہر دور کی عمارات میں ممتاز کرتا ہے۔

یہ وہ امتیازی خصوصیات ہیں جنھوں نے پتھروں میں جان ڈال دی ہے یہ کردار زندہ اور متحرک محسوس ہونے لگتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ پتھر کے مجسمہ نہیں بلکہ ایک ہزار سال پرانے انسان ہیں جو اپنے دور کی تمام سماجی حقیقتوں کے ساتھ کھجوراہو کے مندروں کے آنگن میں کھڑے اکیسویں صدی کا انتظار کر رہے ہیں۔

——— موسیقی ———

تاریخ کے وسیع و عریض کینوس پر کچھ جگہوں کے نام ہمیشہ انفرادی حیثیت کے حامل رہے ہیں ___ انہیں میں سے ایک نام 'چندیری' کا بھی ہے ___ یہ ایک چھوٹا سا شہر' مدھیہ پردیش کے ضلع گونہ میں ایک ہزار سال سے اونچے اونچے سرسبز و شاداب پہاڑوں کے درمیان واقع ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پرتیہارا (PAYATIHARA ـــ) دورِ حکومت میں راجپوت راجاؤں کی بھی 'چندیری' پر کافی توجہ رہی ___ انھوں نے دسویں صدی عیسوی میں کلیان رائے مندر کی بنیاد ڈالی۔ جو آج بھی موجود ہے۔ اور تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے ___ جین مذہب کے ماننے والے راجاؤں اور اُمراء نے بھی 'چندیری' کو اپنی توجہ کا خاص مرکز بنایا۔ اور گیارہویں و بارہویں صدی میں پتھروں کو کاٹ کر قلعہ' مندر اور شاہکار مورتیاں بنا کر انھیں مندروں کی زینت بنایا۔ تالاب' سرائے اور گئوشالائیں بنائیں اور مسلسل دو سو سال تک 'چندیری' جین اور ہندو مذہب کی مشترکہ تہذیب کا گہوارہ بنا رہا۔

جغرافیائی اعتبار سے بھی 'چندیری' کو خصوصیت حاصل ہے۔ یہ ہندوستان کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف اونچے پہاڑ قلعہ کی دیواروں جیسا کام کرتے ہیں ___ اس کے دامن میں بیتوا ندی اس کی آب پاشی کرتی ہے ___ ہرے بھرے مہوے' شیشم' ساگوان اور بیڑی بنانے والے پتوں کے پیڑ اس کی اقتصادی صورتِ حال کے امین ہیں ___ اور

شاید اسی وجہ سے ہندوستان میں مسلمان حکمرانوں نے بھی فوراً چندیری کو اپنا مطمع نظر بنایا۔ غیاث الدّین بلبن نے، جو کہ اس وقت محض ایک نائب کی حیثیت رکھتا تھا، ۱۲۵۱ء میں چندیری پر حملہ کر کے اس کو سلطنت دورِ حکومت کا ایک حصّہ بنا لیا۔ اور ایک پتھر کی مسجد تعمیر کروائی۔ جس کے دروازے کی محراب پر اسلامی کلمہ اور تاریخ وسال کندہ کروایا۔ ۱۳۱۱ء میں دہلی سے گجرات کی مہم کے دوران، علاؤ الدّین خلجی نے بھی یہاں کئی روز قیام کیا۔ اور تین مسجدیں، ایک باؤلی اور ایک مہمان خانے کی تعمیر کروائی۔ ان تمام باتوں کی تصدیق عمارتوں پر کندہ تاریخ سے کی جا سکتی ہے۔ ماضی کی تاریخ میں چندیری کو یوں بھی اہمیت حاصل رہی ہے کہ اس مقام پر ملک کافور، خواجہ حاجی اور محمد بن تغلق جیسے حکمرانوں اور وزرا نے دیوگری اور تلنگانہ جیسے مضبوط اور اہم علاقوں کو فتح کرنے کے لئے اپنی فوجوں کی تزئین و ترتیب کا کام کیا۔ مشہور مورخ اور سیاح ابنِ بطوطہ نے بھی چندیری میں ۱۳۴۲ء میں اپنے دورانِ سفر یہاں قیام کیا۔ وہ لکھتا ہے کہ چندیری ایک بڑا اور جاہ وحشمت کا شہر ہے۔ کیونکہ یہاں امیر الامراء اعظم ملک رہتے ہیں۔ یہاں کے بازار وسیع اور مرصّع ہیں۔ اعظم ملک کو سوائے جمعہ کے دوسرے دنوں میں آسانی کے ساتھ دیکھا نہیں جا سکتا۔ وہ بہت سی خوبیوں کے حامل ہیں۔ امیر الامراء نے چندیری کو ہندوستان کا ایک نمایاں اور منفرد شہر بنا دیا ہے۔ لوگ مطمئن اور برسرِ روزگار نظر آتے ہیں۔ اس کا سنہری دور وہ کہلاتا ہے جب چودھویں صدی عیسوی میں دلاور خان غوری نے مالوہ حکومت کی بنیاد ڈالی اور چندیری کو اجین، بھوپال اور دوسرے علاقوں کے ساتھ نمایاں اہمیت بخشی۔ جامع مسجد کی تعمیر کروائی۔ مسافر خانے، کنویں اور تالاب بنوائے۔ کشک محل، شہزادوں کا روضہ، مدرسہ، مقبرے، قلعہ اور مینارے بنوائے اور اس سے بھی بڑھ کر مانڈو بادشاہوں نے شہر کی فصیلیں، دروازے اور منظم قبرستان بنوائے، جن میں مقبروں اور دروازوں پر لکھے ہوئے کتبے اور تحریریں اُس دور کی فنِ معماری اور فنِ خطاطی کی خوبصورت تصویر پیش کرتے ہیں۔

مغل حکومت کے ابتدائی دور ہی میں ظہیر الدّین محمد بابر بادشاہ نے چندیری شہر کا دورہ کیا۔ وہ اپنی خود نوشت سوانح حیات تزکِ بابری میں اس شہر کے بارے میں لکھتا ہے:-

"کھانوا کی جنگ سے واپسی کے دوران میں ۱۹ جنوری ۱۵۲۸ء کو چندیری میں داخل ہوا ــــ یہ شہر آب و ہوا اور قدرتی مناظر کے نقطۂ نظر سے نہایت عمدہ اور قابلِ تعریف ہے۔ یہاں کا پانی تیز، ہن اور ہاضم ہے۔ یہاں اونچے اونچے پتھریلے پہاڑوں کو کاٹ کر محل، قلعہ، اور تالاب بنائے گئے ہیں۔ اس شہر کے راستے صاف اور مزین ہیں۔ تمام مکان پتھر کے اور نقش نگاری کے ساتھ بنے ہوئے ہیں ــــ اس کے قریب بہتی ہوئی بیتوا ندی ہے۔ یہ شہر اور بھی کارآمد اور رہنے کے قابل ہے" یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ بابر نے آگرہ شہر کے لئے تعریف کا ایک جملہ بھی نہیں کہا۔ جب کہ چندیری کے لئے اس نے اپنی پسند کا اظہار تفصیلی طور پر کیا۔

شہنشاہ اکبر کے دور میں بھی چندیری کو تاریخی اور ثقافتی اہمیت حاصل رہی ہے۔ دورِ اکبری کا مشہور مؤرخ اور وزیر ابوالفضل 'چندیری' کی بابت لکھتا ہے ــــ "دورِ اکبری کا یہ ایک اہم شہر ہے۔ یہاں ۶۱ محل ہیں جن میں شرفاء، امرا، اور فوجی دستہ قیام کرتے ہیں۔ ۹۰ ہاتھی، ۵۹۷۰ سوار ۶۶۰۸۵ پیادہ فوجی دستے یہاں قیام کرتے ہیں جن پر کئی کروڑ دام ہر سال خرچ ہوتے ہیں۔" ابوالفضل پھر لکھتا ہے کہ اس شہر میں ۱۴ ہزار پتھر کے بنے ہوئے مکانات ہیں۔ ۳۸۴ بازار ہیں ۳۶۰ مسافر خانے ہیں ــــ اور ۱۲ ہزار مسجدیں ہیں ــــ ابوالفضل کا یہ بیان ممکن ہے کسی حد تک مبالغہ آمیز ہو۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ دورِ اکبری میں مانڈو حکومت کے زیرِ نگرانی 'چندیری' کو انفرادی اہمیت اور فروغ دیا گیا۔

آج بھی یہ ایک ہزار سال پُرانا شہر قدرت اور زمانے کی ستم ظریفیوں کے باوجود آباد ہے۔ اس کی عمارتیں، اُن پر لکھی ہوئی تحریریں ماضی کی تاریخ کو دہرا رہی ہیں ــــ اس شہر کو اس اعتبار سے بھی فوقیت حاصل رہی ہے کہ یہاں کی بنائی ہوئی ساڑیاں اپنی دستکاری میں دور دراز تک مشہور ہیں۔ ❋ ❋ ❋

مدراس، بمبئی اور کلکتہ کا تاریخی پس منظر

سولھویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کی تاریخ میں مغل حکومت کا نام سنہری حروف میں لکھا جا رہا تھا۔ بابر، ہمایوں، اکبر بادشاہ یہاں کی سرزمین پر آرٹ، ثقافت، فنونِ لطیفہ اور معاشی ترقی کی طرف پوری طرح کوشاں تھے۔ اس ملک کی سرحدیں مضبوط اور فوجی انتظامات پوری طرح مستحکم بنائے جا رہے تھے۔ ملک کی سالمیت اور ترقی کے لئے آپسی بھائی چارہ اور مذہبی میل ملاپ کی طرف دھیان دیا جا رہا تھا۔ ادھر مغربی ممالک میں سر فرانس ڈریک کے عالمی سفر کی وجہ سے انگلستان بھی جغرافیہ کے نقشہ میں ۱۵۸۸ء کے دوران دنیا کی سب سے بڑی بحری طاقت کا اعلان کر چکا تھا اور انگلستان کے سرمایہ دار طبقہ نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے مشرق کی طرف رُخ کیا۔ اس سلسلہ میں ایک شخص "تھومس اسٹیفنس" کا نام سب سے پہلے آتا ہے، جس نے ہندوستان کا دورہ کیا اور یہاں سے اپنے ملک انگلستان میں جو خط اس نے لکھے، اس میں ہندوستان کی دولت کا خصوصی طور پر ذکر کیا۔ یہی سے مغرب کے فرنگیوں کے ذہن میں ہندوستان آنے اور یہاں سے تجارت قائم کرنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ جن میں سے ایک برطانوی تاجر ہندوستان آکر اکبر بادشاہ کے مغل دربار میں ملازم ہو گیا۔ اسی دوران پرتگالیوں کے ساتھ مغل حکومت اور ہندوستان کے باہمی تجارتی تعلقات بحال ہو رہے تھے۔ ۱۶۰۰ء کے زمانے میں تقریباً ایک سو برطانوی تاجر ہندوستان آئے اور "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے نام سے اپنی تجارت کا مرکز قائم کر دیا۔ پھر ۱۶۰۸ء میں جہانگیر

مغل شہنشاہ کے عہد حکومت میں "کیپٹن ہاکنس" نے بادشاہ سے اجازت لے کر گجرات کے شہر "سورت" میں باقاعدہ ایک کارخانے کی بنیاد ڈالی۔ کچھ ہی عرصہ بعد ۱۶۱۵ء میں برطانیہ کے بادشاہ جیمس اوّل نے جہانگیر کے دربار میں سر تھومس رو کو ہندوستانی سفیر کی حیثیت سے روانہ کیا۔ لگ بھگ چار سال کے عرصہ میں تھومس رو ہندوستانی مغل دربار میں کافی مقبول ہوگیا اور اس طرح احمد آباد، بروچ اور آگرہ میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے مرکز قائم ہوگئے۔ فرنگیوں کو ہندوستان سے تجارت میں زبردست فائدے کے پیش نظر دوسرے برطانوی تاجروں کی توجہ بھی اس ملک کی طرف ہونے لگی۔ ابھی ایک سو سال کا عرصہ بھی نہیں گذرا تھا کہ برٹش کمپنی نے مشترکہ طور پر یونائیٹڈ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ہندوستان میں یہاں کی زیادہ تر تجارت کو اپنے قبضہ میں کرلیا۔ اس ملک کے خام مال کو وہ اپنی فیکٹری میں تیار کرنے لگے اور اس تیار شدہ سامان کو ہندوستان میں کئی گُنا زیادہ قیمت پر فروخت کرنے لگے۔ ۱۷۰۰ء میں برطانوی سامراج ہندوستان پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ اور پورے ملک میں خانہ جنگی، مغلیہ حکومت کا زوال اور افراتفری کا ماحول برپا تھا، لیکن برطانوی تاجر جب ہندوستان میں اپنی تجارت کی کمپنیاں قائم کر رہے تھے۔ تو انہوں نے سمندری کنارے اور پانی کے جہاز کی گزرگاہ کا خاص خیال رکھا، جس کے نتیجے میں مدراس، بمبئی اور کلکتہ جیسے شہر عالم وجود میں آئے اور جلد ہی پورے ہندوستان کے مایہ ناز شہر کہلانے لگے جو آج بھی اپنی انفرادیت اور اہمیت کی بنا پر جانے جاتے ہیں۔

مدراس:۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک انگریز تاجر "فرانس ڈے" نے ۱۶۳۹ء میں مچھیروں کے ایک چھوٹے سے گاؤں کو کرایہ کے طور پر اس وقت جنوب کی حکومت وجے نگر کے حاکم سے لے لیا تھا۔ چونکہ یہ گاؤں سمندر کے کنارے پر تھا، اس لئے جہازرانی اور بندرگاہ کا ایک مناسب مرکز بنایا جانے لگا۔ کچھ عرصہ بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہاں پر سینٹ جارج کے نام سے ایک قلعہ بنا دیا۔ جس میں تجارتی سامان رکھا جاتا تھا اور برطانوی تاجروں کی قیام گاہ کا بھی ایک محفوظ ٹھکانہ بن گیا۔ اور دھیرے دھیرے اس قلعہ میں ان لوگوں نے دفاع اور جنگ کے اسلحہ بھی جمع کرلئے۔ جن میں کثیر تعداد میں بندوقیں، توپیں اور دوسرے

ہتھیار اکٹھا ہو گئے۔ اب یہ قلعہ انگریزوں کے لئے دفاع کا ایک مضبوط ٹھکانہ بن گیا اور چھوٹا سا یہ گاؤں شہر میں تبدیل ہونے لگا۔ ابھی سترھویں صدی کا اختتام بھی نہ ہوا تھا کہ جنوب کی وجے نگر حکومت کمزور پڑنے لگی اور دکن کے سلطان کا قبضہ ہونے لگا۔ پورے جنوبی ہند میں افراتفری کا عالم برپا ہونے لگا۔ لوٹ مار اور قتل وغارت گری کے خوف سے رعایا انگریزوں کے بسائے ہوئے اس علاقہ میں پناہ گزیں ہونے لگی۔ لوگ آباد ہوتے گئے، اور شہر بستا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس جگہ پر مچھلی پکڑنے والے رہا کرتے تھے جو اس گاؤں کو "مادی راسواہ" اپنی علاقائی بولی میں کہتے تھے۔ انگریزوں نے اس نام کو بگاڑ کر 'مدراس' کر دیا اور تبھی سے یہ جگہ مدراس کے نام سے آج تک جانی جاتی ہے۔ سمندر کے کنارے آباد ہونے کی وجہ سے یہ تجارت کو فروغ دینے میں کافی کارگر ثابت ہوا۔ اور سفر کی مناسبت سے بھی انگلستان اور ہندوستان کے درمیان یہ جگہ بحری اڈہ اور بندرگاہ کی وجہ سے کافی مفید ثابت ہوئی۔ انگریزوں کے بسائے ہوئے اس شہر مدراس کو آج بھی تجارت اور ترقی کے نقطۂ نظر سے ایک اہم مقام حاصل ہے۔

بمبئی:۔ اورنگ زیب کے ابتدائی عہد میں ہندوستان کی دفاع میں دراڑ پڑ رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ہندوستان پر انگریزوں کے ساتھ ساتھ پرتگالیوں کا عمل دخل ہوتا جا رہا تھا۔ خصوصاً گوا اور اس کے آس پاس کے علاقے میں پرتگالیوں کا قبضہ تھا۔ آج کے شہر بمبئی کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ یہ بھی ایک چھوٹا سا گاؤں سمندر کے کنارے پر تھا۔ جہاں مچھیرے رہا کرتے تھے اور پرتگالیوں کے قبضہ میں یہ جگہ تھی۔ جب انگلینڈ کے کنگ چارلس ثانی کی شادی پرتگال کے بادشاہ کی لڑکی سے ہوئی تو جہیز کے طور پر یہ جگہ چارلس بادشاہ کو عطا کی گئی۔ اس وقت یہ ایک چھوٹے سے شہر کے طور پر جانا جاتا تھا۔ بعد میں برطانوی بادشاہ نے اس جگہ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام کرایہ پر دے دیا۔ جس کا معاوضہ صرف دس پونڈ سال بھر میں ادا کرنا پڑتا تھا۔ کمپنی کے تاجروں نے اپنی تمام ترفیکٹریاں سورت سے بمبئی منتقل کر لیں اور ایک بڑے بندرگاہ کا قیام یہاں ہو گیا۔ چونکہ یہ بھی سمندر سے جڑا ہوا تھا، اس لئے جلد ہی برطانیہ اور ہندوستان دوسرے ممالک سے اس جگہ کو بطور تجارت

اور سفر کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس طرح جلد ہی بمبئی بھی ایک بڑے شہر میں تبدیل ہو گیا۔

کلکتہ :- کلکتہ شہر کے وجود میں آنے کا قصّہ بھی کافی دلچسپ ہے۔ ابو صالح کنبوہ نے "شاہ جہاں نامہ" میں لکھا ہے کہ صاحب قرانِ ثانی شہنشاہ شاہ جہاں کی ایک شاہزادی ایک بار مخملی پردوں میں چراغ کی لَو سے آگ لگ جانے سے بری طرح جل گئیں۔ جس سے اُن کا سارا جسم اس قدر جل گیا تھا کہ بیشتر حکیموں اور ویدوں نے علاج کرنے سے معذوری ظاہر کر دی۔ چنانچہ بادشاہ نے ایک برطانوی ڈاکٹر کو گجرات کے شہر سورت سے علاج کے لئے طلب کیا۔ شاید اس ڈاکٹر کا نام "ڈیوڈسن" تھا۔ ڈاکٹر نے پوری توجّہ سے شہزادی کا علاج کیا اور اچھا کر دیا۔ شاہ جہاں بادشاہ نے خوش ہو کر ڈاکٹر سے اس کا انعام پوچھا تو جواب میں اس انگریز ڈاکٹر نے عرض کی کہ انگلستان کے تاجروں کو بنگال میں تجارت کرنے اور کارخانے قائم کرنے کی اجازت دی جائے۔ بادشاہ نے فوراً اجازت دیدی اور تبھی سے سنہ ۱۶۴۲ء میں کلکتہ سے بالکل قریب "ہوگلی" میں انگریزوں کا تجارتی مرکز قائم ہو گیا۔ شاہ جہاں کے بعد، اورنگ زیب کی حکومت کے زمانے میں انگریز تاجروں کو دشواری پیش آئی۔ کیونکہ بنگال کے مُغل گورنر نے اُن کی درآمدات اور برآمدات پر بھاری ٹیکس لگانا شروع کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں اُن کی پوری تجارت ٹھپ ہو کر رہ گئی۔ اور منافعہ کی صورت نہ نکلنے پر تمام کارخانے بند کر دیئے اور "ہوگلی" بھی انگریز تاجروں نے چھوڑ دیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد اورنگ زیب بادشاہ کو یہ احساس ہوا کہ بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت سے مُغل حکومت کو بھی کافی فائدہ تھا۔ اس طرح مغل بادشاہ نے انگریزوں کو دوبارہ تجارت کرنے کی اجازت دیدی۔ چنانچہ برطانوی تاجر جب دوبارہ بنگال واپس آئے تو گنگا دریا کے کنارے کے تین گاؤں سنہ ۱۶۹۰ء میں خرید لئے۔ ان تین گاؤں کے نام تھے، سوتا لوتی، گوبندا پور، اور کالی کاتا۔ جب یہاں تجارت کا مرکز بن گیا تو دھیرے دھیرے ترقی ہوتے ہوتے یہ ایک بڑے شہر میں تبدیل ہو گیا۔ جس کا نام انگریزوں نے کلکتہ رکھ دیا۔

اب کلکتہ برطانوی سرکار اور لوگوں کا ایک اہم شہر بن گیا۔ جہاں انھوں نے مغربی فنِ تعمیر کے نقطۂ نظر سے عمارتیں، مینار، اور میموریل بنوائے۔ قلعہ اور خندقیں کھدوائیں۔ جن میں

برطانوی بادشاہ ولیم ثالث کے نام پر فورٹ ولیم قلعہ کی تعمیر کروائی۔ جہاں بعد میں ایک کالج کا بھی قیام ہوا جس کے تحت آسان اُردو زبان میں لارڈ ویلزلی اور گلکرسٹ کے زیرِ نگرانی اُردو کی بہترین کتابوں کو شائع کیا گیا تاکہ انگریز بھی اُردو زبان وادب سے واقفیت حاصل کریں۔ برطانوی تاجروں کو براہِ راست ہندوستان کی سیاست سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صرف کمپنی اور تجارت کے فروغ میں کوشاں رہتے۔ ۱۷۱۶ء میں اتفاق سے مغل بادشاہ "فرخ سیر" کو ایک مہلک بیماری سے انگریز ڈاکٹر "ہیملٹن" نے علاج کے ذریعہ شفا عطا کی۔ جس سے خوش ہو کر بادشاہ نے کلکتہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت پر سے تمام محصول معاف کردیا۔ اس سے تجارت کے ساتھ ساتھ کلکتہ اور بنگال کے علاقہ میں انگریزوں کو اپنی طاقت بھی جمانے کا موقع مل گیا۔ آخری مغل عہد میں جب دلّی کی حکومت کمزور پڑنے لگی تو بنگال میں کلکتہ ہی سے برطانوی سامراج نے اپنی سیاسی مداخلت کا اعلان کیا تھا۔

آج بھی کلکتہ شہر کو انفرادی طور پر خصوصیت حاصل ہے جس کو ہندوستان کا سب سے زیادہ آبادی والا شہر کہا جاتا ہے۔ کلکتہ تجارت، علم، آرٹ، فنونِ لطیفہ اور تہذیب کے طور پر بھی نمایاں شناخت کا حامل ہے۔ ٭٭٭

لکھنؤ

(شاہانِ اودھ کا ایک تہذیبی شہر)

لکھنؤ کو تاریخ کی روشنی میں تلاش کرنے کے بجائے زیادہ تر اس کے تہذیبی، معاشرتی اور روائتی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ حالانکہ اس کا تعلق تاریخ کے قدیم ہندوستان سے سلسلہ وار جڑا ہوا ہے۔ بعض حوالوں میں اس بات کے بھی سراغ ملتے ہیں کہ وادیٔ سندھ کی تقریباً پانچ ہزار سال پرانی تہذیب، ہڑپا اور موہنجوداڑو کے کچھ آثار قدیمہ لکھنؤ کی آس پاس کی جگہوں میں بھی کھدائی کے ذریعہ نمودار ہوئے ہیں۔ ٹیراکوٹا، یعنی پکی ہوئی مٹی کے برتن اور پی جی ڈبلو، یعنی روغنی اور چمکدار مٹی کا سامان بھی برآمد ہوا ہے۔ اس طرح کا سامان اُن تمام جگہوں پر بھی دستیاب ہوا ہے جو ہڑپا تہذیب کے مراکز قرار دیئے گئے ہیں۔ پرانے شاستروں کے ایک اور حوالے سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ تقریباً بارہ سو سال قبل مسیح لکھنؤ اور اس کے اطراف کے علاقہ کا نام ''کوشلیا'' تھا۔ جہاں اس نام کی ایک سورج ونشی قوم گومتی ندی کے کنارے آباد تھی۔ اُن کا خاص پیشہ کاشتکاری اور شکار تھا۔ پانچویں صدی عیسوی میں جب شمالی ہندوستان میں گپتا حکومت کا راج تھا اور پورا اتری بھارت سنہری دور کی علامت کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اس وقت بھی متھرا کے ایک پنڈت ''لکھن'' نے اپنے مصاحبین اور لواحقین کے ساتھ گومتی ندی کے

کنارے اس شہر لکھنؤ میں ڈیرہ لگایا۔ کچھ کا تو یہ بھی خیال ہے کہ موجودہ لکھنؤ میں لچھمن ٹیلہ اسی عہد کی یاد دلاتا ہے ہو سکتا ہے لفظ لکھن بدل کر لچھمن مشہور ہوگیا ہو۔ لیکن ان تمام باتوں کی ابھی تک کوئی قطعی تاریخی حیثیت تسلیم نہیں کی گئی ہے ___ عین ممکن ہے کہ لفظ لکھن سے لکھنؤ اس جگہ کا نام پڑ گیا ہو۔

لکھنؤ کی تاریخ کا قطعی سلسلہ تیسرے حکمران مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر (۱۶۰۵-۱۵۵۶ء) سے جا ملتا ہے۔ اکبر نے ۱۵۹۰ء میں، جب پورے بھارت کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا تھا تو صوبہ اودھ صوبہ دار کا مستقر لکھنؤ ہی کو قرار دیا تھا۔ اسی زمانے میں ایک بزرگ شیخ عبدالرحیم کو یہاں کی جاگیر عطا کی گئی اس بزرگ نے سب سے پہلے یہاں کے لکھن یا لچھمن ٹیلے پر قیام کیا تھا۔ اس زمانے میں شاہ مینا شاہ نے بھی اپنے مریدوں کے ساتھ اسی جگہ کو اپنا مسکن قرار دیا اور دھیرے دھیرے لکھنؤ کی آبادی بڑھتی گئی محلّے بنتے گئے اور شہر کا وجود ہوگیا ___ اکبر ہی کے عہد میں اودھ کے صوبہ دار نے اپنی پانچ بیویوں کے لیے پنچ محل بنوایا جو بعد میں نواب صفدر جنگ کے زمانے میں مچھلی بھون کے نام سے موسوم ہوا۔ شہزادہ سلیم نے مرزا منڈی باغ کی بنیاد رکھی۔ ۱۵۷۴ء میں اودھ کے صوبہ دار جواہر خاں کے نائب قاسم محمود بلگرامی نے محمود نگر اور شاہ گنج محلّہ بسائے۔ چوک اور نخاس کے درمیان اکبر بادشاہ کے نام پر اکبری دروازہ بنوایا۔ شیخ عبدالرحیم کے مقبرہ کو بھی ابدیت حاصل ہوئی اور نادان محل کے نام سے آج بھی جانا جاتا ہے۔ ان کا بنوایا ہوا قلعہ مچھلی بھون جو پنج محل کہلاتا تھا۔ چھبیس محرابوں پر مشتمل تھا اور ہر محراب پر دو دو مچھلیاں بنی ہوئی تھیں اسی مناسبت سے اس کو پہلے تو مچھلی بادن اور بعد میں مچھلی بھون کے نام سے مشہور کر دیا گیا ___ لچھمن ٹیلہ کا نام ہی یہ ثابت کرتا ہے کہ یہاں معزز اور مقتدر برہمن بھی آباد تھے جو چوک کے آس پاس کے علاقوں میں رہتے تھے۔ ان کے محلہ، مندر، عمارتیں ان کی تہذیب اور مذہبی رسومات کی مظہر ہیں۔ اکبر بادشاہ کی اجازت سے گھوڑے کے ایک فرانسیسی تاجر نے لکھنؤ میں قیام

کرنے کی اجازت حاصل کی اور چار عمارتیں اپنی رہائش کے لیے تعمیر کروائیں مگر شاہ
جہاں بادشاہ کے عہد میں اس فرانسیسی تاجر کے تمام رشتہ داروں کو کسی وجہ سے
ہندوستان سے باہر کر دیا گیا اور وہ تمام کی تمام عمارت اور اس کی جائداد حکومت
نے اپنے قبضہ میں لے لی۔ لیکن جب اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کا زمانہ آیا تو
وہیں کے ایک عالم ملاّ نظام الدّین کو وہ پورا علاقہ سکونت کے لیے دے دیا گیا
اور اس طرح ان کا خاندان اسی فرانسیسی تاجر کی عمارت میں سکونت پذیر ہو گیا۔ یہ
علاقہ فرنگی محل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اکبر بادشاہ کے عہد سے لے کر متواتر ہر
زمانے میں لکھنؤ کی آبادی اور محلہ بڑھتے رہے یہاں تک کہ اورنگ زیب کے
بعد بھی اس شہر کو آس پاس کے حلقوں میں جانا اور پہچانا جاتا رہا۔ لیکن اب تک
لکھنؤ کو نہ تو کوئی تہذیبی اور انفرادی اہمیت حاصل ہوئی تھی اور نہ ہی اس جگہ
پر بادشاہوں نے قیام کا ارادہ کیا۔ اس کی حیثیت تو صرف ایک چھوٹے سے قصبہ
کی سی تھی۔ لیکن مغل بادشاہ محمد شاہ (رنگیلا) کے زمانے میں اس نے ۱۷۳۲ء
میں برہان الملک امین الدین سعادت خاں کو دہلی سے لکھنؤ کی طرف وہاں کے
ساہوکاروں اور زمینداروں کی سرکوبی کے لیے ارسال کیا تاکہ وہاں کی رعایا
کو آرام مل سکے اور حالات سازگار ہو سکیں۔ اس طرح سعادت خاں کے اودھ
میں پہنچتے ہی ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جسے اودھ عہد کے نام سے بھی جانا
جاتا ہے مگر ابھی تک لکھنؤ کے بجائے فیض آباد ہی ان تمام نوابوں کا مسکن رہا اور
یہیں سے اودھ حکومت کی ابتدا ہوتی ہے ـــ جس کا بانی نواب سعادت خاں
کو کہا جاتا ہے۔ اودھ کا علاقہ کافی وسیع تھا۔ جو فیض آباد سے لے کر لکھنؤ، بارہ بنکی،
سیتاپور اور روہیل کھنڈ کے حلقہ میں پھیلا ہوا تھا۔ جس کی راجدھانی فیض آباد
تھی ـــ اودھ حکومت کا دورِ اقتدار ایک سو پچیس ۱۲۵ برس تک قائم رہا یعنی ۱۷۳۲ء
سے ۱۸۵۶ء تک گیارہ نواب حکمرانوں نے حکومت کی اور آخری اودھ کے
تاجدار نواب واجد علی شاہ کے ساتھ یہ دور ختم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے پہلے

تین حکمراں یعنی برہان الملک، صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کی دارالحکومت فیض آباد ہی میں رہی۔ لیکن چوتھے فرماں روا نواب آصف الدولہ نے ۱۷۷۵ء میں فیض آباد کی سکونت ترک کر کے لکھنؤ کو اپنی راجدھانی بنایا۔ انھیں کے ساتھ بہت بڑی آبادی لکھنؤ میں منتقل ہو گئی۔ آج بھی پرانے لکھنؤ میں زیادہ تر محلے انھیں کے بسائے ہوئے انھیں پرانے ناموں سے منسوب ہیں۔ البتہ اودھ کے ساتویں نواب نصیر الدین حیدر شاہ نے کشن گنج اور چاند گنج کے علاوہ حضرت گنج کی بنیاد ڈالی جو اس وقت بھی لکھنؤ کا ایک معروف بازار کہلاتا ہے۔ اس طرح وہ کام جو آصف الدولہ نے شروع کیا تھا۔ امجد علی شاہ کے زمانے میں مکمل ہوا۔ اودھ دورِ حکومت میں لکھنؤ کو زبردست ترقی اور عروج حاصل ہوا۔ تہذیب، شعر و شاعری، لباس، آداب اور لکھنوی رہن سہن کی انفرادی شناخت کے علاوہ فن تعمیر میں بھی ہند اسلامی نیز مغربی فن تعمیر کی خصوصیات ابھر کر سامنے آئیں۔ نواب آصف الدولہ کے عہد کی عمارتیں آج بھی اس شہر کی پہچان ہیں جن میں امام باڑہ، دولت خانہ، شیش محل، ریزی ڈنسی قابل ذکر ہیں۔ نواب غازی الدین حیدر نے ایک طرف تو مقبرہ سعادت حسن خاں، مبارک منزل، چھتر منزل اور شاہ نجف کی عمارتیں بنوائیں اور ساتھ ہی حیدر آباد (موجودہ نیو حیدر آباد) اور بادشاہ نگر کے محلے آباد کئے امجد علی شاہ نے حضرت گنج کو باقاعدہ فروغ دیا اور قابل ذکر عمارتوں سے مرتب کیا۔ گومتی پر لوہے کا پل اور آمین آباد بسایا۔ غازی الدین حیدر کے زمانے کا تعمیر کردہ محل چار باغ عین اسی جگہ پر تھا جہاں اب لکھنؤ کا ریلوے اسٹیشن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نواب کی خواہش کے مطابق اس جگہ پر ایک ہی طرح کے چار باغ لگوائے گئے تھے اسی مناسبت سے اس جگہ کا نام ہی چار باغ پڑ گیا۔

آخری تین اودھ کے نوابین، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ تھے۔ محمد علی شاہ کا تعمیر کردہ امام باڑہ، جو چھوٹا امام باڑہ کے نام سے موسوم ہے اور جہاں وہ خود مدفون ہیں یہ انتہائی خوبصورت اور فن تعمیر کا بہترین

کرنے کی اجازت حاصل کی اور چار عمارتیں اپنی رہائش کے لیے تعمیر کروائیں مگر شاہ
جہاں بادشاہ کے عہد میں اس فرانسیسی تاجر کے تمام رشتہ داروں کو کسی وجہ سے
ہندوستان سے باہر کر دیا گیا اور وہ تمام کی تمام عمارت اور اس کی جائداد حکومت
نے اپنے قبضہ میں لے لی۔ لیکن جب اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کا زمانہ آیا تو
وہیں کے ایک عالم ملاّ نظام الدین کو وہ پورا علاقہ سکونت کے لیے دے دیا گیا
اور اس طرح ان کا خاندان اسی فرانسیسی تاجر کی عمارت میں سکونت پذیر ہو گیا۔ یہ
علاقہ فرنگی محل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اکبر بادشاہ کے عہد سے لے کر متواتر ہر
زمانے میں لکھنؤ کی آبادی اور محلہ بڑھتے رہے یہاں تک کہ اورنگ زیب کے
بعد بھی اس شہر کو آس پاس کے حلقوں میں جانا اور پہچانا جاتا رہا۔ لیکن اب تک
لکھنؤ کو نہ تو کوئی تہذیبی اور انفرادی اہمیت حاصل ہوئی تھی اور نہ ہی اس جگہ
پر بادشاہوں نے قیام کا ارادہ کیا۔ اس کی حیثیت تو صرف ایک چھوٹے سے قصبہ
کی سی تھی۔ لیکن مغل بادشاہ محمد شاہ (رنگیلا) کے زمانے میں اس نے ۱۷۳۲ء
میں برہان الملک امین الدین سعادت خاں کو دہلی سے لکھنؤ کی طرف وہاں کے
ساہوکاروں اور زمینداروں کی سرکوبی کے لیے ارسال کیا تاکہ وہاں کی رعایا
کو آرام مل سکے اور حالات سازگار ہو سکیں۔ اس طرح سعادت خاں کے اودھ
میں پہنچتے ہی ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے جسے اودھ عہد کے نام سے بھی جانا
جاتا ہے مگر ابھی تک لکھنؤ کے بجائے فیض آباد ہی ان تمام نوابوں کا مسکن رہا اور
یہیں سے اودھ حکومت کی ابتدا ہوتی ہے — جس کا بانی نواب سعادت خاں
کو کہا جاتا ہے۔ اودھ کا علاقہ کافی وسیع تھا جو فیض آباد سے لے کر لکھنؤ بارہ بنکی
سیتاپور اور روہیل کھنڈ کے حلقہ میں پھیلا ہوا تھا۔ جس کی راجدھانی فیض آباد
تھی۔ اودھ حکومت کا دور اقتدار ایک سو پچیس ۱۲۵ برس تک قائم رہا یعنی ۱۷۳۲ء
سے ۱۸۵۶ء تک گیارہ نواب حکمرانوں نے حکومت کی اور آخری اودھ کے
تاجدار نواب واجد علی شاہ کے ساتھ یہ دور ختم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے پہلے

تین حکمراں یعنی برہان الملک، صفدر جنگ اور شجاع الدولہ کی دارالحکومت توفیض آباد ہی میں رہی۔ لیکن چوتھے فرماں روا نواب آصف الدولہ نے ۱۷۷۵ء میں فیض آباد کی سکونت ترک کرکے لکھنؤ کو اپنی راجدھانی بنایا۔ انھیں کے ساتھ بہت بڑی آبادی لکھنؤ میں منتقل ہو گئی۔ آج بھی پرانے لکھنؤ میں زیادہ تر محلے انھیں کے بسائے ہوئے انھیں پرانے ناموں سے منسوب ہیں۔ البتہ اودھ کے ساتویں نواب نصیر الدین حیدر شاہ نے گنج اور چاند گنج کے علاوہ حضرت گنج کی بنیاد ڈالی جو اس وقت بھی لکھنؤ کا ایک معروف بازار کہلاتا ہے۔ اس طرح وہ کام جو آصف الدولہ نے شروع کیا تھا۔ امجد علی شاہ کے زمانے میں مکمل ہوا۔ اودھ دورِ حکومت میں لکھنؤ کو زبردست ترقی اور عروج حاصل ہوا۔ تہذیب، شعروشاعری، لباس، آداب اور لکھنوی رہن سہن کی انفرادی شناخت کے علاوہ فن تعمیر میں بھی ہند اسلامی نیز مغربی فن تعمیر کی خصوصیات ابھر کر سامنے آئیں۔ نواب آصف الدولہ کے عہد کی عمارتیں آج بھی اس شہر کی پہچان ہیں جن میں امام باڑہ، دولت خانہ، شیش محل، ریزیڈنسی قابل ذکر ہیں۔ نواب غازی الدین حیدر نے ایک طرف تو مقبرہ سعادت حسن خاں، مبارک منزل، چھتر منزل اور شاہ نجف کی عمارتیں بنوائیں اور ساتھ ہی حیدر آباد (موجودہ نیو حیدر آباد) اور بادشاہ نگر کے محلّہ آباد کئے امجد علی شاہ نے حضرت گنج کو باقاعدہ فروغ دیا اور قابل ذکر عمارتوں سے مرصع کیا۔ گومتی پر لوہے کا پل اور آمین آباد بسایا۔ غازی الدین حیدر کے زمانے کا تعمیر کردہ محل چار باغ عین اسی جگہ پر تھا جہاں اب لکھنؤ کا ریلوے اسٹیشن ہے۔ کہا جاتا ہے کہ نواب کی خواہش کے مطابق اس جگہ پر ایک ہی طرح کے چار باغ لگوائے گئے تھے اسی مناسبت سے اس جگہ کا نام ہی چار باغ پڑ گیا۔

آخری تین اودھ کے نوابین، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ تھے۔ محمد علی شاہ کا تعمیر کردہ امام باڑہ، جو چھوٹا امام باڑہ کے نام سے موسوم ہے اور جہاں وہ خود مدفون ہیں یہ انتہائی خوبصورت اور فن تعمیر کا بہترین

نمونہ ہے۔ اسی کے قریب نواب کی خواہش سے ایک سات منزلہ عمارت کی تعمیر کا کام شروع ہوا تھا مگر اچانک نواب کے انتقال سے کام رک گیا مگر اس کے غیر مکمل کھنڈرات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ امجد علی شاہ کے زمانے میں خصوصی توجہ حضرت گنج کو فروغ دینے میں صرف ہوئی۔ آخری نواب واجد علی شاہ کی جیتی جاگتی مثال قیصر باغ کے علاقہ میں بنی ہوئی عمارتیں ہیں۔ وسط قیصر باغ میں آج بھی ایک سفید بارہ دری ہے جس کا نام بادشاہ نے "قصر عزار" رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ڈھیر سارے باغات بنائے گئے جن میں سے ہر باغ کا نام الگ الگ رکھا گیا جو آج بھی زیادہ تر انھیں ناموں سے جانے جاتے ہیں۔ شاہان اودھ سے متعلق مندرجہ بالا واقعات کا تاریخی پس منظر میں مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ آصف الدولہ کے بعد ان کے جانشینوں نے وسط لکھنؤ کے علاقہ کو ترقی دینے کی کافی کوشش کی۔ اور وہ لکھنؤ جو صرف پرانے علاقے یعنی چوک اور تخاس تک محدود تھا۔ اب وسیع ہوکر اپنے رقبے کے اعتبار سے کافی پھیل گیا تھا۔ ایک بیان کے مطابق لکھنؤ شہر جو نسٹھ دیہاتوں کی زمینوں پر آباد تھا جو اب اور بھی وسیع ہوکر ۹۶ مربع کیلو میٹر کے رقبہ میں پھیل چکا ہے۔

دور حاضر کے لکھنؤ سے قطع نظر، اودھ نوابین کی اگر سلسلہ وار فہرست تیار کی جائے تو گیارہ فرماں رواؤں کے نام اس طرح ہیں —— (۱) نواب سعادت خاں برہان الملک (۲) مرزا مقیم ابوالمنصور بہادر صفدر جنگ (۳) جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ بہادر (۴) مرزا امانی نواب آصف الدولہ بہادر (۵) یمین الدولہ نواب سعادت علی خاں (۶) نواب غازی الدین حیدر (۷) نصیر الدین حیدر شاہ (۸) فریدوں بخت رفیع الدین محمد مہدی عرف منا خاں (۹) محمد علی شاہ (۱۰) امجد علی شاہ (۱۱) واجد علی شاہ عرف جان عالم (تخلص اختر، پیا)

اودھ اور لکھنؤ پر شخصی حکمرانی تسلط کا جو سلسلہ ۱۷۳۲ء سے شروع ہوا تھا

وہ یہاں کے آخری شاہ، واجد علی کی معزولی کے ساتھ ختم ہو گیا۔ انگریزوں نے واجد علی شاہ کو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا جہاں انھوں نے میٹا برج میں جلاوطنی کے عالم میں لگ بھگ تیس سال گزارے اور ۱۸۸۷ء میں انتقال کیا۔

ہندوستان میں سامراج حکمرانوں کے غلبہ کے ساتھ ایک طرف تو اس ملک میں تاریخی اعتبار سے دورِ جدید کی ابتدا ہو رہی تھی تو دوسری طرف لکھنؤ میں اودھ حکمراں ایک ایسی تہذیب کی بنیادیں مضبوط کر رہے تھے جس میں نفاست تھی، نزاکت تھی، تکلف تھا، تصنع تھا اور ایک ایسا نوابی کلچر پروان چڑھ رہا تھا جو آگے چل کر پوری دنیا میں انفرادی طور پہ جانا جانے لگا۔ اس کلچر کو فروغ دینے میں زبان، لب و لہجہ کے علاوہ فنونِ لطیفہ کا بھی بہت بڑا حصّہ رہا ہے۔ جس میں رقص و موسیقی، مصوری و خطاطی، شاعری اور غوطہ زنی نمایاں طور پر ایک آرٹ کی صورت میں نمودار ہوا۔ اودھ حکمران ایرانی النسل تھے ان کی طبیعتوں میں نزاکتوں اور لطافتوں کے جوہر تھے ہندوستان کی سرزمین پر ان لوگوں نے ایرانی تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مزاج کو بھی اپنی تہذیب کا ایک حصّہ بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موسیقی، رقص، مصوری و خطاطی جیسے فنونِ لطیفہ ایرانی اور ہندوستانی فن کی آمیزش سے ایک نیا اور من پسند آرٹ سامنے آیا۔ کچھ نئی ایجادات بھی ہوئیں۔ خود نواب آصف الدولہ نے ہندا ایرانی موسیقی کے ملاپ سے ایک کتاب بھی لکھوائی تھی۔ جو فارسی زبان میں تھی۔ خود ہندوستانی موسیقی اتنی زیادہ مرسع اور مکمل تھی کہ اس پر مزید اضافہ کرنا زیادہ آسان نہ تھا۔ مگر موسیقی ہی کے حوالے سے مسلمانوں نے ہندوستان میں ایک جدید طرز کا اضافہ کیا جسے "قوالی" کہا جاتا ہے۔ قوالی کی روایت سے قطع نظر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہ صنف عراقی موسیقی کی نقل تھی مگر ہندوستان میں قوالی کو ایک نیا لب و لہجہ عطا کیا گیا جو صرف اس سرزمین کی دین ہے اور ہندوستانی موسیقی کا ہی ایک حصہ ہے۔

البتہ فرق یہ ہے کہ قوالی کو صوفیائے کرام کی سرپرستی کی بدولت فروغ حاصل ہوا تھا ان کے نزدیک قوالی کی طرز، غنا کی تعریف میں نہیں آتی تھی۔ اس لیے قوالی پر موسیقی کی حرمت کا اطلاق بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ قوالی کے اشعار کا موضوع ہمیشہ حمد و نعمت یا منقبت تک ہی محدود رہا تھا اس لیے اس صنف کو ان تمام لوگوں نے بھی سراہا جو موسیقی کو مذہبی اعتبار سے جائز نہ سمجھتے تھے۔ حالانکہ اب قوالی کی صنف میں بھی عشقیہ اور محبوب خارجی جیسے موضوعات شامل ہو گئے ہیں۔

لکھنؤ کے اودھ حکمران مزاج کے اعتبار سے ادب شاعری اور موسیقی کے دلدادہ تھے ان کی نظر میں مذہبی کٹرپن مناسب نہ تھا اس وجہ سے قوالی جیسی صنف جس میں پہلے صرف حمد و نعمت یا منقبت جیسے موضوعات کو پیش کیا جاتا تھا۔ اب لکھنؤ کے نوابوں کی سرپرستی میں عشقیہ موضوعات نے بھی جگہ لے لی۔ محبوب کے سراپا کا ذکر، چھیڑ چھاڑ اور سوال و جواب کی تکرار کے ساتھ قوالی گائی جانے لگی۔ اور ہندوستانی موسیقی کے عناصر ترکیبی کو بھی جگہ دی جانے لگی۔ سُر تال اور لَے کی دھنوں پر قوالی کا بھی لب و لہجہ بدل گیا اور وہ قوالی جو ابتدا میں مسلمان صوفیائے کرام کے زیر سایہ پروان چڑھی تھی اب اپنے دامن میں ہندوستانی موسیقی کو بھی سمیٹ چکی تھی۔ اس سلسلہ میں تمام نوابانِ اودھ نے شوق ظاہر کیا اور خاص کر واجد علی شاہ کے زمانے میں موسیقی اور رقص کو مجموعی طور پر فروغ حاصل ہوا۔ ان کو موسیقی سے فطری لگاؤ تھا وہ خود بھی بڑے فنکار تھے۔

مصوری و خطاطی کی طرف بھی شاہانِ اودھ نے خصوصی توجہ دی۔ اس زمانے میں یورپ کے بعض ماہر مصوروں کو دربار میں رسوخ حاصل تھا۔ جن میں یورپین مصور " زوفینی " کا نام بہت مشہور ہے یہ مصور نواب آصف الدولہ کے زمانے میں لکھنؤ آیا تھا اور مغربی طرز کی بہت ساری شاندار تصاویر بنائیں۔ غازی الدین حیدر کے دربار میں " ہوم " اور اس کے لڑکے کی تصاویر بھی قابل ذکر ہیں۔ نصیر الدین حیدر کے دربار میں ایک جرمن مصور ملازم تھا جس نے روغنی اور

آبی تصاویر کے ذریعہ اودھ فن مصوری کو مالا مال کیا۔ خود نواب واجد علی شاہ کے عہد میں بھی ولایتی اور جرمن مصور موجود تھے۔ اس کے باوجود اودھ فن مصوری کی اپنی امتیازی شان تھی جس میں "ٹھاکر داس" کا نام قابل ذکر ہے ٹھاکر داس کے فن مصوری کے نمونوں کے ذریعہ اودھ اسکول کو نمایاں اہمیت ملی۔ یہ غازی الدین حیدر کے دور میں لکھنؤ آیا تھا اور ہندوستانی روایات و مذہبی رسومات کو تمثیلی طور پر بڑے سلیقہ سے تصویروں کے ذریعہ پیش کیا۔ اودھ اسکول کی تصاویر کی یہ خوبی ہے کہ ان میں ہند ایرانی تہذیب کے پس منظر میں مرد اور عورتوں کی شبیہیں پیش کی ہیں اور کہیں کہیں پر رنگوں کے بجائے سونا، چاندی، سفیدہ اور دوسری دھاتوں کا بھی استعمال کیا ہے جس کی وجہ سے تصاویر میں زیادہ گہرا پن اور ابھرے ہوئے نقوش دیکھنے کو ملتے ہیں۔

انھیں میں سے بعض مصوّر فن خوش نویسی کے بھی ماہر تھے اور خط نسخ و نستعلیق میں جواب نہیں رکھتے تھے۔ اس دور کے بعض وصلی اور سامانِ آرائش پر بہترین خطاطی کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ واجد علی شاہ کے دربار میں تصویروں اور خطاطی کے بہترین نمونوں کا ذخیرہ تھا۔

اسی طرح اودھ دور کی ایک امتیازی شان یہ بھی رہی ہے کہ تفریح اور وقت گزاری کے لیے لکھنؤ کے امراء و نوابین دربار کے کنارے یا بڑی بڑی باؤلیوں کے پاس بیٹھ کر غوطہ زن کے کمالات سے بھی لطف لیتے تھے جو دھیرے دھیرے ایک فن کی صورت اختیار کر گیا۔ دوسرے فن کے ماہرین کی طرح غوطہ زنی کرنے والوں کو بھی انعامات اور القاب سے نوازا جاتا تھا ان میں سے ایک نام بہت مشہور ہے جن کو "میر مچھلی" کے لقب سے پکارا جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ یہ دریا میں کئی گھنٹوں تک غوطہ لگا سکتے تھے۔ اور چت، کروٹ، اوندھے اور بیٹھ کر پانی میں تیرنے کا کمال رکھتے تھے۔ جوگی آسن، سنگھاڑہ، گٹھری، سادھو آسن، کھڑی پیراکی اور نہ جانے اسی طرح کے اور نہ جانے کتنے ٹھاٹھ تھے جن میں لکھنؤ کے نوابی دور میں

بعض ماہرین اپنی شناوری اور تیراکی کا کمال دکھایا کرتے تھے۔

لکھنؤ کو بجا طور پر یہ فخر حاصل ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی تہذیبی، تعمیری اور فن کے نقطۂ عروج کی تاریخ جب مرتب کی جاتی ہے تو اس میں اس شہر کو نمایاں حیثیت دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہاں کی زندگی کے شب و روز کی وہ داستانیں ہیں جو ہر لحاظ سے قابل ذکر ہیں۔ ایک طرف لکھنؤ کو باغات اور اعلیٰ عمارتوں کا شہر کہا جاتا ہے تو دوسری طرف زبان، لب و لہجہ اور اطوار و آداب کی فہرست میں اس شہر کو انفرادی درجہ دیا جاتا ہے۔ درس و تدریس کے معاملہ میں بھی فرنگی محل اور ندوۃ العلماء کے ساتھ منشی نول کشور کی خدمات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ ندوۃ العلماء ایک ایسے ادارہ کی صورت میں سامنے آیا جس کا مقصد انگریزی اور مذہبی دونوں طرح کی تعلیم دینا تھا چنانچہ ۱۸۹۲ء میں اس کا نقشہ کانپور میں تیار ہوا اور پانچ سال کے وقفہ میں اس کی بنیاد پڑ گئی۔ ندوۃ العلماء شروع میں ایک چھوٹے سے مدرسہ کی صورت میں مولوی گنج کے قریب ایک محلہ میں سید محمد علی مونگیری کی قیادت میں شروع ہوا۔ بعد میں علامہ شبلی کے زیر سایہ موجودہ عمارت میں منتقل ہو گیا۔

مشاعرے، شعر و شاعری اور داستان گوئی میں بھی لکھنؤ کی سرزمین نے اعلیٰ درجہ کے فنکار پیدا کیے ہیں۔ میر اور سودا جیسے عظیم شاعر بھی کھینچ کر لکھنؤ آ گئے اور اسی کی خاک کا پیوند ہے۔ ناسخ اور آتش جیسے شاعروں نے زبان کو نئی توانائی فراہم کی۔ مرزا محمد ہادی رسوا اور عبدالحلیم شرر جیسے ناول نویسوں نے اپنے فن کو معراج بخشی۔ امراؤ جان ادا جیسا کردار بھی اسی سرزمین کا مرہون منت ہے۔ رتن ناتھ سرشار کا داستانوی کردار "خوجی" بھی لکھنوی تہذیب کا پروردہ ہے۔ شعراء اور اہل قلم کی سرپرستی میں نواب واجد علی شاہ کا رتبہ تمام شاہان اودھ سے بڑھا ہوا ہے۔ یہ اگرچہ دوسرے بہت سے مشاغل میں بھی گرفتار تھے اور سیاسی طور پر نہایت غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار تھے لیکن فنونِ لطیفہ پر جان چھڑکنے

والا ادب اور شاعری کے لیے سب کچھ لٹا دینے والا اس سے بڑھ کر اور کوئی نہ تھا۔
ہندوستان کی تاریخ میں لکھنؤ اس اعتبار سے منفرد اور ممتاز درجہ رکھتا ہے کہ یہاں دوستی اور ادب نوازی کی خاندانی روایات کو ہمیشہ قائم رکھا گیا۔ اور لکھنؤ والوں کے فیض سے نہ صرف اردو ادب نے بلکہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب نے ہمیشہ چراغ روشن کیے ہیں۔

تنجور کی تاریخی اہمیت

ہندوستان کسی ایک تہذیب یا کلچر کا نام نہیں۔ یہ تو وہ ملک ہے جس میں انگنت تہذیبوں کے نشان ملتے ہیں، بہت سارے مذاہب کی پہچان ملتی ہے۔ ڈھیر ساری زبانوں کی آوازیں سُنائی دیتی ہیں اور گوناگوں موسموں کی بدلتی ہوئی بہار کی ہوائیں اس ملک کی شناخت ہیں۔ شہروں کی تاریخی اہمیت کی جب بھی بات چلتی ہے تو ایک نمایاں نام اس ملک کے جغرافیائی نقشہ پر اُبھرتا ہے اور جسے تنجور کہا جاتا ہے۔ تنجور، صوبۂ تامل ناڈو میں مدراس سے تقریباً ڈھائی سو کلومیٹر کے فاصلہ پر مندروں کی دیدہ زیب تعمیر، اور فنِ لطیفہ کی تعمیراتی، آرٹسٹک اور فنِ ہنرمندری کی نمایاں وسعتوں کے پیشِ نظر گذشتہ ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ سے جانا جاتا ہے۔ اس شہر کے قیام اور وجود میں آنے کا سلسلہ تو بعض مؤرخین کے نزدیک چوتھی صدی قبل مسیح تک جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جس زمانے میں شمالی ہندوستان کے اندر گوتم بدھ اور بھگوان مہاویر جین، زندگی کو ایک نیا فلسفۂ عدم تشدّد اور دھرم و کرم کا سبق دے رہے تھے اس وقت بھی دکن میں تنجور کے اندر ہندو اور برہمن نظریۂ حیات کا پرچار کیا جا رہا تھا۔ مندروں اور ہندو دیوی دیوتاؤں کے مجسموں کی تعمیر ہو رہی تھی۔ فنِ موسیقی اور رقص کو مندروں کا ایک لازوال حصّہ سمجھا جاتا تھا۔ وید مقدّس کی تعلیمات کے پیشِ نظر

تنجور کو سیاسی، سماجی، اور معاشی زندگی کا امین سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ابھی ایک ہی صدی گزری تھی کہ وہاں کے راجاؤں کی طاقت کمزور پڑ گئی اور آندھرا و کرناٹک میں عروج کے ساتھ ساتھ تنجور کی ترقیاں تھم سی گئیں اور یہ جگہ محض ایک گمنام بستی کی شکل میں یاد کی جانے لگی۔

لیکن ۱۰ ویں صدی عیسوی میں یہ جگہ پھر تاریخ کے پس منظر سے اُبھر کر آرٹ، آرکیٹکچر اور فنونِ لطیفہ کے کینوس پر نمایاں ہو گئی جس کا سہرہ چولا حکمرانوں کے سر جاتا ہے۔ ۱۰ ویں صدی سے پہلے تنجور میں پلّوا اور پانڈواؤں کی حکمرانی تھی۔ مگر چولا راجاؤں نے اس شہر کو تعمیراتی نقطۂ نظر سے منظرِ عام پر لانے کی پوری کوشش کی جس میں Temple Building یا مندروں کی تعمیر کی طرف خاص توجہ دی گئی۔ سخت پتھروں کے ذریعہ مندر اور مجسّم بنائے گئے جو فن کے لحاظ سے گولائی لئے ہوئے ہیں اور جتنے بھی لکڑی اور اینٹ وگارے کی تعمیرات تھیں اُنکی جگہ پتھر کا استعمال کیا گیا۔ جن میں شیو اور وشنو دیوتاؤں کو مرکزی طور پر پیش کیا گیا ہے۔

فنونِ لطیفہ کے نقطۂ نظر سے تنجور کا دوسرا پہلو یہاں کے بنے ہوئے فنِ مصوری کے نمونے ہیں۔ جن کو نہ صرف دکنی ہندوستان میں بلکہ پورے ملک میں ایک انفرادی اسکول کے طور پر جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ ۱۸ ویں صدی میں جب ملک کے شمال اور وسط ہندوستان میں مغل حکمرانوں کی تہذیب کی نمائندگی ہو رہی تھی اس وقت بھی تنجور اپنی روایات اور تہذیب کی الگ سے نشاندہی کر رہا تھا۔ تنجور کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہاں ادب اور تامل شاعری پر بھی کافی توجہ دی گئی۔ اس کی ایک وجہ یہاں کے دانشوروں نیز عوام کا مذہب سے پُر خلوص لگاؤ تھا۔ مندروں کی چہار دیواری میں رقص اور موسیقی کے ساتھ ساتھ بھگوان کی یاد میں گائے جانے والے وہ گیت بھی قابلِ ذکر ہیں جن کا ذکر تامل ادب میں بار بار ہوتا ہے۔ بھرت نٹیّم رقص کے ساتھ گائے جانے والے اشعار اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہیں۔ مجموعی طور پر تنجور کی تاریخی اہمیت تین باتوں

سے ہے۔ یعنی (۱) یہاں کے تاریخی اہمیت کے مندر (۲) یہاں کی فنِ مصوری اور (۳) ادب و شاعری۔

تقریباً ۱۶ کلو میٹر کے رقبہ میں پھیلا ہوا تنجور شہر ہے جسکا مغربی حصّہ بیشتر مندروں سے آراستہ ہے۔ ان میں برہدیشورا مندر کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ اسکو راجہ راجیشورہ مندر بھی کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ چولا حکومت کے پہلے راجہ نے اس کو ۹۸۵ء سے ۱۰۱۴ء عیسوی کے عرصہ میں تعمیر کروایا تھا اور راجہ کے نام پر ہی اس مندر کو موسوم کیا گیا۔ یہ تقریباً ایک کلومیٹر کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے اور مندروں کے فنِ تعمیر کی سب سے پہلی اور اہم کڑی تصوّر کیا جاتا ہے۔ کچھ محققین کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ صوبۂ تامل ناڈو میں مندروں کے عروج کی داستان ہی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اس برہدیشورا مندر کی تعمیر، اس کے مجسّمہ، اور اسکی دیواروں پر بنائی گئی تصاویر اسکو تاریخی اہمیت کے قابل بناتی ہیں۔ مندر کے احاطے میں داخل ہوتے ہی سامنے چبوترے پر رکھی ہوئی دھات کی بنی ہوئی ایک نندی دیوی کی شبیہ ہے جہاں سے گزر کر منڈپ میں پوجا کے لئے قدم رکھا جاتا ہے۔ وہاں پر بھی دھات کے بنے ہوئے کئی مجسّمہ ہیں جن کی کاریگری قابلِ دید ہے۔ اس مندر کی تعمیری خصوصیت یہ ہے کہ عمارت کی تعمیر ایک چوڑے سے چبوترے پر شروع ہوتی ہے اور متواتر بلندی کی طرف پتلی ہوتی چلی جاتی ہے۔ دیوار و در کا ایک اک حصّہ حسین اور خوبصورت مجسّموں کے ذریعہ آراستہ کیا گیا ہے۔ ایک جھلک میں دیکھنے سے ایسا لگتا ہے جیسے یہ صرف مندر ہی نہیں بلکہ دیوی دیوتاؤں اور ان کے پجاریوں کا ایک جمِ غفیر لگا ہوا ہے۔ بھورے سخت پتھر یعنی Granite Stone کی یہ عمارت ۲۴۱ میٹر لمبی اور ۱۲۲ میٹر چوڑی ہے ساتھ ہی ۶۰ میٹر بلند ہے۔ مندروں میں عام طور پر گنبد نہیں ہوتے ہیں لیکن تنجور کے اس برہدیشورا مندر میں اندر کی طرف گنبد کی سی شکل بھی بنائی گئی ہے جو مندروں کی تعمیرات میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔ یہاں دُرگا، لکشمی، سرسوتی، ویر بھدّرا، ناتیا، آردھ ناری، اور آلینگنا جیسے دیوتاؤں اور

دیویوں کے مجسّمہ آج بھی موجود ہیں۔ فنِ تعمیر اور مجسّمہ سازی کے علاوہ اس مندر کی وہ تصاویر بھی قابلِ ذکر ہیں جن سے اسکی اندرونی دیواریں آراستہ ہیں۔ اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آرکیٹکچر کے فن میں اس کو نقطۂ عروج کا حامل سمجھنا چاہیئے جسکا سہرہ چولا حکمرانوں کے سر ہے۔

عالمی سطح پر جب تمام دنیا کی تاریخی اہمیت کی عمارتوں کی فہرست تیار کی جا رہی تھی تب ہندوستان کی طرف ۱۴ اہم عمارتوں میں تنجور کی اس عمارت کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ اس طرح تنجور کے اس مندر کو نہ صرف قومی اہمیت کا سرمایہ سمجھنا چاہیئے بلکہ عالمی وراثت کی عمارت کا درجہ بھی دیا گیا ہے۔

تنجور کی تاریخی اہمیت اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ فنِ مصوّری میں اسکو ایک انفرادی اسکول کی اہمیت دی گئی ہے۔ چولا کے بعد ۱۸ ویں صدی عیسوی میں سرفوجی (Sarfoji) راجاؤں نے آرٹ اور فنِ مصوّری کو فروغ دینے میں عوام کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ اِس فن کی طرف توجہ دیں۔ ایک طرف مغل اور راجستھان فنِ مصوّری کا دور دورہ تھا ایسے حالات میں تنجور کی تصاویر کو مقبولیت ملنا آسان نہ تھا۔ پھر بھی اس اسکول نے الگ سے اپنی پہچان بنائی جسکو تنجور اسکول آف پینٹنگ کے نام سے جانا گیا۔ اسکی خصوصیت یہ تھی کہ کینوس پر برش کے ذریعہ فیگر کو بنانے کے بعد ان کو قیمتی جواہرات اور نگینوں سے سجایا جانے لگا۔ اور انسانی نقوش کو نسبتاً زیادہ نمایاں اور گولائی کے ساتھ پیش کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن، رادھا وغیرہ کی جتنی بھی تصاویر تنجور میں بنائی گئی ہیں ان میں گولائی نمایاں ہے اور نگینے جڑے ہوئے ہیں۔

بھگوت پران اور دوسری مذہبی کتابوں کے ترجمے اور بسا اوقات منظوم ترجمے بھی ۱۸ ویں صدی میں اس تنجور میں تامل زبان میں کئے گئے ہیں جنکو آج بھی اہم دستاویز کا درجہ دیا جاتا ہے۔

مجموعی طور پر تنجور ایک ایسا شہر ہے جسکو تاریخی، تہذیبی، اور آرٹ و آرکیٹکچر کے نقطۂ نظر سے دنیا کے نقشہ میں نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

ہندوستان
غیر ملکی سیّاحوں کی نظر میں

ہندوستان کی کہانی سیّاحوں کی زبانی

ہندوستان ہمیشہ سے غیر ملکی لوگوں کی نظر میں ایک پُر اسرار، بے پناہ دولت مند، اور علم و دانش کی سرزمین رہا ہے۔ تاریخ کے نامعلوم زمانے سے ہی یہ ملک سیّاحوں، زائرین، فاتحین، تاجروں، اور اسی طرح کے بہت سے لوگوں کی کشش کا مرکز و محور رہا ہے۔ ان میں سے کچھ تو دولت کی تلاش میں اور کچھ علم و زبان کے خزانے کی کھوج میں یہاں آتے رہے۔ یہ محض ایک اتفاق ہے کہ تاریخ کی کتابوں میں اُن جابر اور جلاد بادشاہوں کے مفصل حالات تو مل جائیں گے جنھوں نے ہندوستان کی سرزمین کو لوٹا، کھسوٹا اور ظلم و غارت گری کا بازار گرم کیا لیکن ان عظیم المرتبت اور انسان دوست ہستیوں کی شخصیت کی تفصیل بیان کرنے میں لاپرواہی سے کام لیا جنھوں نے نوعِ انسان کو علم و دانش کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ ایک مؤرخ سکندر اور نادر شاہ سے ضرور واقف ہوگا مگر میگستھنیز اور ابن بطوطہ کے بارے میں تفصیلات فراہم کرنے سے گریز کرے گا۔ یہ بے اعتنائی شاید اس وجہ سے ہو کہ بادشاہوں اور فاتحین کے دربار میں ایسے بہت سے لوگوں کی قطار بندھی رہتی ہے جو اپنے آقا کو خوش کرنے کے لئے ان کی تمام حرکات کو خوش کرنے کے لئے آمادہ رہتی ہے مگر وہ ہستیاں جو بادشاہِ وقت کی طرح سربلند ہو کر تو چلنا نہیں جانتی مگر راہِ نیاز کے ذریعہ وہ علم، ادب، مذہب، تہذیب اور تاریخ کی ایک ایسی داستان مرتب کر جاتے ہیں جو نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے شناخت کے جوہر دکھا جاتے ہیں۔ ہندوستان کی سرزمین پر بہت سے ایسے سیاح آئے جن کا سراغ نہیں ملتا مگر اس کے باوجود اچھی خاصی تعداد

میں ایسے غیر ملکی سیاحوں کی فہرست بھی مرتب کی جاسکتی ہے جنھوں نے اپنے نقطۂ نظر سے اس ملک کو دیکھا۔ یہاں کے شہروں، دیہاتوں، رسم ورواج، مذہب اور عقائد، زبان وفن اور دوسرے تمام سماجی پہلوؤں کا جائزہ لیا اور اُن تمام احساسات کو اپنے انداز میں قلم بند کر دیا اور اس طرح ہماری کہانی سیّاحوں کی زبانی سنائی جاتی رہی۔

ہندوستان میں غیر ملکی سیّاحوں کا اگر ذکر کیا جائے تو فوری طور پر جن معتبر اور معرکتہ الآرا ناموں کی نشاندہی کی جاتی ہے اُن میں میگستھینز، فاہیان، ہیون سانگ، البیرونی، ابن بطوطہ، برنیر، میکس مولر، ولیم جانس، یا ایسے بعض دوسرے دانشوروں اور زائرین کے نام ضرور لئے جاتے ہیں۔ یہ تمام سیاح مختلف ادوار میں مختلف اطراف سے، مختلف رجحانات کی نمائندگی کرتے ہوئے ہندوستا آئے اور اپنے سفرناموں اور تاریخی نسخوں کے ذریعہ ہندوستان کی چشم دید تاریخ مرتب کر گئے ـــــ ان میں سے میگستھینز کو اس اعتبار سے اہم سیّاح کہا جاسکتا ہے کہ اُس نے سب سے پہلے یونان سے آنے والے سفیروں میں سے پہلی بار یہاں کے بارے میں سب کچھ لکھا اور مغربی دنیا کو ہندوستان اور یہاں کی عوام کے رسم ورواج سے روشناس کرایا۔ میگستھینز وہ پہلا شخص تھا جو تیسری صدی قبل مسیح میں یونان کے بادشاہ، سیلوکس کا سفیر بن کر ہندوستان میں موریہ حکمراں کے دربار میں پہونچا۔ اِس کی اہمیت محض یہ نہیں کہ یہ پہلا سفیر تھا جو اس ملک میں آیا بلکہ اس کی اہمیت اُس بات سے ہے کہ اس نے اس ملک کے بارے میں ایک مفصل کتاب لکھی جس میں یہاں کے ۱۱۸ قبیلوں کے رسم ورواج اور اور ان کے رہن سہن کے بارے میں تفصیل فراہم کی ــــ اُس نے اس وقت کے ہندوستان کے طول وعرض کی پوری پیمائش بھی لکھی ہے۔ اُس نے موریہ راجاؤں کی راجدھانی پاٹلی پتر کے بارے میں تفصیل فراہم کی اور بتایا کہ اس شہر کے اطراف لکڑی کی جو لمبی چوڑی فصیل تھی اُس میں ۵۷۰ برج بنے ہوئے تھے اور بعد میں آثار قدیمہ کے محققین نے کھدائی کے ذریعہ ان تمام بیانات کی شہادت بھی دی ہے۔ میگستھینز نے ہندوستان کے متعلق اور بھی بہت کچھ لکھا ہے، مثلاً یہاں کی زرخیزی، یہاں کے دریا، جنگلی جانور، پروں والے

بچھو، سانپ، مختلف نسلیں، قبیلے، ہاتھی، گھوڑے، سونا کریدنے والی چیونٹیاں، یہاں تک کہ یہاں کے مذاہب اور مختلف فلسفیوں کا ذکر بھی اس کتاب میں ملتا ہے۔ میگستھینز کو بجا طور پر ہندوستان میں آنے والا وہ پہلا سیاح کہا جا سکتا ہے جس نے تیسری صدی قبل مسیح یعنی آج سے لگ بھگ ڈھائی ہزار سال پہلے کے ہندوستان کے سیاسی، سماجی، معاشرتی اور مذہبی حالات کو ایک کتاب کی صورت میں پیش کر کے نہ صرف یونان کو بلکہ پورے مغرب کو اس ملک سے متعارف کرایا۔

دوسرا اہم سیاح فاہیان کو کہا جا سکتا ہے۔ جس نے ۵ ویں صدی عیسوی کے وسط میں چین سے ہندوستان کا دورہ کیا۔ یہ اُن معتبر اور عظیم انسانوں میں سے ایک ہے جو بدھ مذہب کا ماننے والا تھا۔ اور گوتم بدھ کی جائے پیدائش میں ایک زائر کی حیثیت سے ہندوستان آیا تھا۔ اس نے بہار، بنگال، پنجاب، یو۔پی اور لنکا جیسی جگہوں کا دورہ کر کے وہاں کے لوگوں، ان کے رسم و رواج، ان کی مہمان نوازی، انسان دوستی اور آپسی رواداری کو تفصیل کے ساتھ اپنے سفرنامے میں لکھا ہے۔ چونکہ وہ خود بدھ مذہب کا ماننے والا تھا اس لئے اس کا مطمحٔ نظر زیادہ تر بدھ مذہب کی تلاش اور گوتم بدھ کے فرامین ہی رہا۔ فاہیان وہ پہلا چینی سیاح ہے جو ہندوستان کی ۵ ویں صدی کی ایک ایسی تاریخ مرتب کر گیا ہے جس میں آج سے ڈیڑھ ہزار سال پرانے ہندوستان کے تہذیبی نقوش کو دیکھا جا سکتا ہے ——— اور اُس دور کے انسانوں کی سماجی زندگی کے شب و روز کا مطالعہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح ایک اور چینی سیّاح ہیون سانگ ہے جس نے ۶۳۰ء میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ اس کے بارے میں بھی یہ کہا جاتا ہے کہ یہ بدھ مذہب سے متاثر ہو کر چین سے اس ملک میں آیا تھا۔ ۷ ویں صدی عیسوی میں ہندوستان پر گپتا راجاؤں کا طوطی بول رہا تھا اور پورا شمالی ہندوستان دورِ زرّیں سے گزر رہا تھا۔ عین اُسی زمانے میں ہیون سانگ، کشمیر، تکشلا ہوتا ہوا متھرا پہونچا۔ پھر اس نے وارانسی، کپل وستو، پاٹلی پتر، ویشالی، نالندہ اور بہار کے بعض دوسرے علاقوں کا بھی دورہ کیا اور جہاں جہاں آسے گوتم بدھ کی

خانقاہوں کا علم ہوا وہاں جاکر اُس نے اُن کی زیارت بھی کی ـــــ ہیونگ سانگ اپنے سفرنامے میں ہندوستان کے لوگوں، اُن کے مزاج، اُن کی زبان وادب اور رسم ورواج کا ذکر بڑے دلچسپ اور تفصیلی انداز میں کرتا ہے۔ ایک جگہ پر اُس نے لکھا ہے کہ:

"بھارت میں ایک مقام ویشالی ہے، جہاں کی آب و ہوا نہایت اچھی ہے زمین بہت زرخیز ہے اور پھل پھول بہت افراط سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں کے آم اور کیلے بہت مزیدار اور میٹھے ہیں۔ لوگ ایماندار اور نیک ہیں۔۔ مہمان نوازی میں ان کا جواب نہیں اور کسی غیر ملکی کی وہ لوگ بہت عزت کرتے ہیں اور عقیدت سے پیر چومتے ہیں۔ زیادہ تر لوگوں کو مذہب سے لگاؤ ہے وہ علم کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ خدا کی ہستی پر یقین لانے والے، اور منکر دونوں طرح کے لوگ موجود ہیں مگر سب مل جل کر رہتے ہیں۔ میں نے اپنے قیام کے دوران کسی کو بھی لڑتے نہیں دیکھا۔"

ہیون سانگ نے ویشالی کے علاوہ کشمیر، متھرا، اور بنارس کی قدرتی خوبصورتی کے بارے میں بھی لکھا ہے اور اس دور کی بعض اہم شخصیتوں، کتابوں، اور عمارتوں کے بارے میں بھی تحریر کیا ہے ـــــ تقریباً ۱۵ سال ہندوستان میں قیام کے بعد جب ہیون سانگ واپس چین پہونچا تو اس نے اپنے ملک کے لوگوں کو بھی ہندوستان کے پر رونق شہروں سے روشناس کرایا ـــــ دسویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں کی توجہ بھی اس ملک کی طرف ہونے لگی تھی۔ اور عین اسی زمانے میں محمود غزنوی نے بھی ہندوستان پر کئی حملے کئے جس کے نتیجہ میں بہت سے مسلمان صوفی، بزرگ، عالم اور دانشور بھی ہندوستان چلے آئے جن میں سے بعض واپس چلے گئے اور بہت سے اسی سرزمین پر آباد ہو گئے۔ اُسی زمانے میں ایک اہم سیاح ابوریحان البیرونی بھی ہندوستان آیا تھا جس کو اس ملک کی زبان، یہاں کے ادب، اور رسم و رواج سے خصوصی لگاؤ تھا۔ البیرونی نے باقاعدہ یہاں کے لوگوں کے ساتھ گھل مل کر سنسکرت زبان سیکھی اور ہندوستانی ادب، تاریخ اور دوسرے فنون کا مطالعہ کیا ـــــ خود اس نے بھی ہندوستان پر کئی

کتابیں لکھیں، جن میں "کتاب الہند" اس کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ اس کتاب میں اُس نے ہندوستانی سماج، مذہب، سائنسی علوم، فلسفہ، معاشرتی نظام، کیمیا، جغرافیہ، علم الاصنام، تہوار، جیوتش اور بہت سے دوسرے موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ـــــ یہ "کتاب الہند" ۱۸۰ ابواب پر مشتمل ہے ـــــ البیرونی کی یہ تصنیف اپنے عہد کا ایک ایسا منظر نامہ ہے جس میں دسویں اور گیارہویں صدی کے ابتدائی دور کے ہندوستان کی مفصّل تصویر دیکھی جاسکتی ہے ـــــ اس کے تقریباً چارسو سال بعد بھی چودھویں صدی عیسوی کے وسط میں مراقش کا ایک اور سیّاح عبداللہ محمد ابنِ بطوطہ ہندوستان آتا ہے اُس وقت دہلی کے تخت پر سلطان محمد بن تغلق فائز تھا۔ ابن بطوطہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے شمالی افریقہ، ایران، ہندوستان یہاں تک کہ چین کا سفر اکیلے اور پیدل طے کیا تھا۔ اُس نے بھی پورے ہندوستان کے شہروں کا دورہ کیا یہاں کے لوگوں، امیروں اور بادشاہوں کے بارے میں تفصیل سے اپنے سفر نامے میں لکھا ہے ـــــ اپنے سفر نامے میں ایک جگہ پر ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ،

> "ہندوستان میں ڈاک کا بڑا اچھا انتظام ہے۔ ویسے تو دہلی سے ملتان کی مسافت پچاس دن کی ہے مگر ڈاک کے ذریعہ کوئی خبر صرف پانچ دن میں پہونچ جاتی ہے۔ ڈاک دو طرح کی ہوتی ہے ایک گھوڑے کے ذریعہ جانے والی اور دوسری پیدل آدمی کے ذریعہ۔ مگر تھوڑی تھوڑی مسافت کے بعد یہ بدلتے رہتے ہیں جس سے ڈاک تیزی سے اور آرام سے پہونچتی رہتی ہے"۔

ابن بطوطہ نے ہندوستان کی زبانوں، یہاں کے مذاہب، عمارتوں اور رسم و رواج کے بارے میں بھی بڑے اچھے انداز میں لکھا ہے۔

پھر جب مغل حکمرانوں کی ہندوستان میں حکومت تھی تو جہانگیر ہی کے زمانے سے مغربی ممالک کے سیّاح اور ادیب و فنکار ہندوستان آنے جانے لگے تھے جن میں فرانسوا برنیر، ولیم جونس، میکس مولر کے نام قابلِ ذکر ہیں، جنھوں نے شاہجہاں،

اورنگ زیب، محمد شاہ اور دوسرے مغل بادشاہوں کے عہد میں دلّی و ہندوستان کے دوسرے علاقوں کا دورہ کیا، اور اپنی تصانیف کے ذریعہ مغربی ممالک میں بھی یہاں کی زبان، شاعروں، ادب، آرٹ اور کلچر کو متعارف کرایا ـــــ اور اس طرح ہندوستان کی ہزاروں سال پرانی تاریخ کے ابواب سیّاحوں کی زبانی پوری دنیا میں روشن ہوتے رہے۔

میگیستھنیز
ایک یونانی سیاح

اس موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے مجھے ۱۹۸۶ء کا وہ واقعہ یاد آرہا ہے، جب میں دسمبر کی ایک سرد ترین شام میں مغربی جرمنی کے مشہور شہر فرانک فرٹ کے ایک ریسٹوران میں بیٹھا ہوا ایک جرمنی جوان سے محو گفتگو تھا۔ اس نوجوان کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں ہندوستانی ہوں تو اسے ہمارے ملک کے بارے میں کچھ جاننے اور معلومات حاصل کرنے کا اشتیاق ہوا۔ اس نے مجھ سے سوال کیا ہیں قدیم ہندوستان کے بارے میں کچھ بتائیے؟ ـــــ میں نے اس کی متجسّس نگاہوں میں ایک عجیب سی تلاش دیکھی اور جی تو چاہا کہ میں فوراً اس کو اپنے ہندوستان کی پرانی روایات، یہاں کی تہذیب، مہمان نوازی اور انسان دوستی کے بارے میں تفصیل سے بتانا شروع کردوں لیکن نہ جانے کیوں میرے منھ سے برجستہ نکل گیا کہ اگر تم قدیم ہندوستان کی کہانی سننا ہی چاہتے ہو تو ایک ہندوستانی سے کیا پوچھتے ہو؟ پوچھو اُن عظیم سیاحوں سے جنھوں نے ہندوستان کا دورہ کیا ہے۔ ان کی نظر میں ہندوستان کی کیسی تصویر بسی ہے؟ ـــــ پھر میں نے کہا کہ اگر تمہیں ہندوستان میں سب سے پہلے آنے والے غیر ملکی سیاح میگیستھنیز کی کتاب "انڈیکا" مل جائے تو دیکھو۔ تمہیں اندازہ ہوگا کہ اس دَور کا ہندوستان، یعنی آج سے لگ بھگ ڈھائی ہزار سال پہلے کا کہ ہمارا ملک کیا تھا؟! ـــــ لیکن اس کا اصرار یہی تھا کہ میں اسے کچھ بتاؤں ـــــ پھر میں نے کہا ٹھیک ہے، میگیستھنیز نے جو کچھ ہندوستان

کے بارے میں لکھا ہے وہی میں بھی تم کو بتانا چاہوں گا۔

یورپ کی سرد شام مگر ریستوران کے گرم ماحول میں، میں نے تلخ کافی کی چسکیوں کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا ــــــ ہندوستان ہمیشہ سے غیر ملکیوں کی نظر میں ایک پُراسرار، بے پناہ دولتمند، اور علم و دانش کی سرزمین رہا ہے ــــــ تاریخ کے نامعلوم زمانے (Pre Historic) سے ہی یہ ملک سیاحوں، زائرین، فاتحین، تاجروں اور اس طرح کے دوسرے لوگوں کی کشش کا مرکز و محور رہا ہے ــــــ ان میں کچھ تو دولت کی تلاش میں اور کچھ علم و زبان کے خزانے کی کھوج میں یہاں آتے رہے ــــ اسی طرح ہندوستان کی سرزمین پر بہت سے ایسے بھی غیر ملکی سیاح آئے جنھوں نے اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اس ملک کو دیکھا۔ یہاں کے شہروں، دیہاتوں، رسم و رواج، مذہب اور عقائد، زبان و فن، سماجی، سیاسی، تہذیبی اور اقتصادی صورت حال کا جائزہ لیا اور ان تمام احساسات کو اپنے اپنے انداز سے تحریر کردیا ــــ اور اس طرح صدیوں سے ہماری کہانی سیاحوں کی زبانی سنائی جاتی رہی ــــ اسی طرح کا ایک سیاح میگیستھنیز بھی تھا۔ اس کو اس اعتبار سے سب سے اہم سیاح کہا جا سکتا ہے کہ یہ پہلا غیر ملکی سیاح تھا، جس نے پہلی بار ہندوستان کے بارے میں کتابی شکل میں تفصیل سے کچھ لکھا ہے ــــ اور اسی میگیستھنیز کی وجہ سے تیسری صدی قبل مسیح میں یعنی آج سے تقریباً ڈھائی ہزار سال پہلے مغربی ممالک کے لوگوں نے ہندوستان کے بارے میں تفصیل سے کچھ جانا اور سمجھا ــــ میگیستھنیز یونان کے بادشاہ سیلوکس (Seleucus) کا سفیر بن کر ہندوستان کے چندر گپت موریہ کے دربار میں آیا تھا۔ اور پانچ سال تک متواتر اس ملک میں قیام کرنے کے بعد اس نے اپنے ہر طرح کے تاثرات ایک کتابی شکل میں جمع کردیئے جس کا نام (Indica) ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کے ذریعہ سے ہمیں اس عہد کے ہندوستان اور خاص کر چندر گپت کی حکومت کی معلومات فراہم ہوتی ہیں ہمیں اس سیاح کی کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی حالات کیسے تھے، اس لحاظ سے میگیستھنیز کے سفرنامے (Indica) کو پہلا تاریخی نسخہ کہا جا سکتا ہے۔ جس کے ذریعہ سے ہمیں مگدھ کی راجدھانی پاٹلی پتر کے خصوصی طور پر حالات کا علم ہوتا ہے ــــ میگیستھنیز نے پاٹلی پتر یعنی موجودہ پٹنہ شہر کے بارے میں تفصیل سے یہ لکھا ہے کہ یہ شہر

گنگا ندی کے کنارے واقع ہے۔ جو چالیس کلو میٹر کے رقبہ میں بسا ہوا ہے — اس کے چاروں طرف گہری کھائی کے ساتھ کافی اونچی ایک دیوار بنی ہوئی ہے جو فصیل کے طور پر شہر کی دشمنوں سے حفاظت کرتی ہے۔ اس فصیل میں ۵۷۰ برج ہیں۔ اور ۶۴ دروازے ہیں — شہر کے تمام مکانات یہاں تک کہ خود مہاراجہ چندر گپت موریہ کا محل بھی چوبی یعنی لکڑی کا بنا ہوا ہے — اور ان تمام باتوں کی تصدیق اس وقت پوری طرح ہو گئی جب محکمۂ آثارِ قدیمہ کے محققین نے کھدائی کے ذریعہ ان کے اثرات زمین سے نکال لئے۔ میگیستھنیز ہندوستان کے صوبہ مگدھ کے بارے میں انتظامی امور سے متعلق مزید لکھتا ہے کہ اس وقت کے ہندوستان میں تیس وزرا کی کمیٹی یا پارلیمنٹ ہوا کرتی تھی۔ جس میں سے ہر شعبہ یا منسٹری کے لئے پانچ وزراء پر مشتمل ایک کاؤنسل ہوا کرتی تھی، جن میں انڈسٹری یعنی صنعتی امور کا محکمہ، بیرونی ممالک کے لوگوں کی دیکھ بھال کا محکمہ، تجارت اور خزانہ کا محکمہ، ٹیکس اور چنگی کا محکمہ، پیدائش، اموات اور شادی بیاہ کا حساب کتاب رکھنے کا محکمہ، بازار میں بکنے والی اشیاء کی جانچ پڑتال کا محکمہ اور پوری حکومت میں صفائی، دیکھ بھال، تعلیم، ہسپتال و مذہبی امور سے متعلق محکمے قائم تھے۔ یہاں تک کہ پورا پاٹلی پتر شہر چار حلقوں میں منقسم تھا جن میں سے ہر حلقہ ایک میئر (Mayor) کی زیرِ نگرانی رہتا تھا۔

اس غیر ملکی سیاح یعنی میگیستھنیز نے موریہ عہد کے ہندوستان کی سماجی زندگی کی بھی تصویر کشی کی ہے — وہ لکھتا ہے کہ اس زمانے میں لوگ اپنے اپنے پیشہ کے اعتبار سے مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے تھے، جن میں سے کسان، گدڑیے، صنعت کار، دست کار، سوداگر، سپاہی اور سرکاری عہدہ داروں کو نمایاں طور پر جانا جاتا تھا — اور عام طور پر پڑھے لکھے اور دانشور لوگ برہمن ہی ہوا کرتے تھے — جن کو حکومت کے اونچے اور اہم عہدوں سے نوازا جاتا تھا — حکومت میں سب سے زیادہ تعداد میں پایا جانے والا طبقہ کسانوں کا ہوا کرتا تھا — میگیستھنیز، اس دور کے معاشرہ کی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی لکھتا ہے کہ وہ لوگ سچے، ایماندار، اور زبان کے پکے ہوتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ گھروں اور دوکانوں میں تالے اور کنجی کی ضرورت نہیں پڑتی تھی — وہ سادہ زندگی کے باشندے

تھے اور بے فکر اور نڈر ہو کر زندگی بسر کرتے تھے ___ اس کے باوجود اقتصادی طور پر لوگ دو دو طبقوں میں بٹے ہوئے تھے۔ امیر اور غریب۔ جن میں سے امراء بڑے، عالی شان اور آرام دہ مکانات میں رہا کرتے تھے۔ اور غریبوں کے گھر نسبتاً چھوٹے اور کم آرام دہ ہوا کرتے تھے ___ اس کے باوجود پوری حکومت میں صرف راجہ کا حکم چلتا تھا اور ہر طرح کے احکامات بادشاہ وقت کی اجازت کے بعد ہی جاری کئے جاتے تھے ___ اگرچہ وزراء کی کابینہ موجود تھی مگر بادشاہ کی پوری ذمہ داری رہتی تھی کہ اس کی حکومت میں عوام کی بہبودی کا خیال رکھا جاتا ہے یا نہیں؟ ___ وہ خود معائنہ کرتا تھا کہ اس کے ملک میں کتنی نہریں، تالاب اور سڑکیں بنوائی گئیں؟ سایہ دار درخت، دھرم شالائیں اور آرام کی دوسری سہولتیں مسافروں کے لئے مہیا کی گئیں؟ نہ صرف یہ بلکہ دفاع کے لئے بھی اس کا فوجی نظام چار حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ پیادہ سپاہی، سوار، ہاتھی اور رتھ کی سواریاں، اور یہ پورا کا پورا فوجی دستہ ۶ لاکھ چالیس ہزار افراد اور سواریوں پر مشتمل تھا ___

میگیستھنیز نے ہندوستان کے متعلق اور بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں کی زرخیز زمین، جنگلی جانور، پروں والے بچھو، سانپ، مختلف نسلیں اور قبیلے، گھوڑے، گائے اور سونا کریدنے والی چونٹیاں وغیرہ وغیرہ ___ اس سیاح نے یہاں کے مشہور فلسفیوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ جادو ٹونے کے بارے میں بھی بتلایا اور یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ ہندوستان کی دست کاری کے نمونوں کا تو جواب ہی نہیں ___ ہمیں اس میگیستھنیز نامی یونانی سیاح کا شکر گذار ہونا چاہیئے کہ اس نے قدیم ہندوستان کے چندر گپت موریہ کے عہد سلطنت کا اس قدر وسیع مطالعہ کر کے پوری دنیا کے سامنے ہمارے ملک کی سچی اور واضح تصویر پیش کی ہے۔

بچوں کے لیے!

فاہیان

چینی سیاح

فاہیان بدھ مذہب کا ماننے والا ایک مذہبی پیشوا تھا۔ یہ چین کا رہنے والا تھا ـــــ آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے یہ مشہور آدمی ایک سیاح۔ یعنی Traveller کی حیثیت سے چین سے ہندوستان آیا تھا۔ یہ عجیب وغریب قسم کا آدمی تھا۔ ابھی اس کی عمر صرف ۲۵ سال کی تھی کہ اس نے گوتم بدھ کے بارے میں، بدھ مذہب کے بارے میں تفصیل سے جاننے کے لئے چین سے ہندوستان کا ہزاروں میل کا سفر اکیلے اور پیدل طے کیا ـــــ راستہ میں رُکتا رکاتا اور ہر جگہ کے بارے میں، وہاں کے لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا ہوا ہندوستان پہونچا۔ یہاں اس نے پنجاب، اترپردیش، مہاراشٹر، بہار، بنگال اور کئی دوسری جگہوں کا دورہ کیا ـــــ مگر چونکہ وہ ایک مذہبی آدمی تھا اور اس کا لگاؤ صرف بدھ مذہب سے تھا۔ اس لئے اس نے بنارس کے قریب سارناتھ گیا۔ پٹنہ، اور بہار کے بعض دوسرے علاقوں کا دردورہ کیا۔ جیساکہ آپ لوگ جانتے ہوں گے کہ گوتم بدھ آج سے ڈھائی ہزار سال پہلے گیا کے پاس پیدا ہوئے تھے۔ وہ ایک راجہ کے بیٹے تھے، مگر انھوں نے اپنا سارا راج پاٹھ چھوڑ کر انسان کی بھلائی اور بدھ مذہب کے لئے اپنی ساری زندگی بہت سادہ طریقہ سے گزاردی۔ فاہیان بدھ مذہب کو مانتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ ہندوستان میں گوتم بدھ کے بارے میں تفصیلی سے جانے۔ اس طرح فاہیان ۳۹۹ء سے لے کر ۴۱۴ء تک یعنی ۱۵ سال متواتر ہندوستان میں رہا ـــــ پھر جب یہ

واپس چین جانے لگا تو اب کی بار اس نے کلکتہ کے قریب ہوگلی ندی میں ایک پانی کے جہاز کے اُوپر بیٹھ کر سمندری سفر کے ذریعہ چین واپس جانا پسند کیا اور اس طرح فاہیان جب ہندوستان سے چین واپس گیا تو اور بھی پکّا بدھ مذہب کو ماننے والا بن گیا۔۔۔ فاہیان بھی بہت پڑھا لکھا اور ایک مالدار آدمی کا بیٹا تھا۔ اور "پنگ یانگ" شہر کا رہنے والا تھا۔۔۔ اس کے بارے میں ایک بڑا ہی دلچسپ قصّہ یہ ہے کہ فاہیان کے پیدا ہونے سے پہلے اس کے تین بھائی اور بھی پیدا ہوئے تھے۔ مگر سب کی سب بچپن ہی میں مر جاتے تھے۔ جب فاہیان پیدا ہوا تو ابھی ایک سال کا تھا کہ یہ بھی بُری طرح بیمار پڑ گیا۔ اس کے والد پھر پریشان ہو گئے۔ کہ کہیں یہ بھی مر نہ جائے۔ مگر اس کے والد نے یہ کیا کہ جلدی سے فاہیان کو وہیں بدھ مذہب کے ماننے والوں کی ایک انجمن میں اپنے بچّہ کو بھیج دیا۔ اور وہیں شہر سے دُور بدھ مٹھ میں دوسرے مذہبی راہبوں کے ساتھ یہ بھی رہنے لگا۔۔۔ ان لوگوں نے آہستہ آہستہ فاہیان کو بدھ مذہب کے بارے میں بتایا کہ کبھی کسی کی بھی جان نہ لینی چاہیئے۔ چاہے وہ ایک چھوٹی سی مکھی ہی کیوں نہ ہو۔ اور شراب بھی نہ پینا چاہیئے۔ نہ گوشت کھانا چاہیئے، نہ چوری کرنا چاہیئے۔ اور جو آدمی کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کرتا ہے وہ بھی بہت برا ہے۔ جھوٹ بولنا بھی گناہ ہے۔ اور ہمیشہ انسان کو بہت سادہ اور معمولی طریقہ سے زندگی گزارنا چاہیئے۔۔۔
جب فاہیان نے یہ باتیں سنیں تو اس کو بہت اچھی لگیں اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بدھ مذہب کو مانے گا اور تمام اچھی باتوں کو مانے گا۔ اور تمام اچھی باتوں کو کرے گا۔ جب فاہیان اچھا ہو گیا تو اس کے والد آئے اور اپنے بیٹے سے کہا کہ اب تم ٹھیک ہو گئے ہو۔ اس لئے یہاں سے چلو۔ عیش و عشرت سے ہمارے ساتھ چل کر رہو۔ مگر فاہیان نے اپنے والد کی ایک نہ سنی اور وہیں اپنے دوسرے بدھ مت ساتھیوں کے ساتھ جھونپڑی میں رہنے لگا۔ اس کا اصل نام Kung تھا۔ مگر جب یہ بڑا ہو گیا۔ تو لوگ اس کی ذہانت، سمجھداری اور شرافت کی وجہ سے فاہیان کہنے لگے۔ چینی زبان میں فاہیان کے معنی بھی سچ بولنے والے کے ہیں۔۔۔ ابھی اس کی عمر صرف ۱۰ سال کی ہوئی تھی، کہ اس کے والد کا بھی انتقال ہو گیا اور فاہیان کو پتہ چل گیا کہ ہر انسان کو بہرحال مرنا ہے اور دنیا سے دل لگانا بالکل بیکار ہے۔

یہ ہمیشہ سچ بولتا تھا، کبھی کسی سے نہیں ڈرتا تھا' اور نہ ہی کبھی کسی کو اس نے جان سے مارا۔ یہ تو بس ایک پکّا پجاری اور شریف انسان تھا۔۔۔۔ ایک دن کیا ہوا کہ گرمیوں کی ایک دوپہر میں یہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ گیروے رنگ کے کپڑے پہنے اپنے مٹھ کے آنگن میں بیٹھا ہوا دھان کاٹ رہا تھا۔ اور چاول کو ایک بڑے سے برتن میں رکھ رہا تھا کہ اچانک کچھ ڈاکو گھس آئے۔ انھوں نے سب کو خوب ڈرایا دھمکایا اور جلدی جلدی چاول چرانے لگے۔ فاہیان کے سب ساتھی بھاگ گئے مگر یہ وہیں پر ڈاکوؤں کے سامنے کھڑا رہا۔ وہ ڈاکو اس کے پاس آکر اس کے چاول بھی لینے لگے۔ تب فاہیان نے بڑی شرافت سے ڈاکوؤں کو سمجھایا کہ بھائی تم لوگ بھوکے ہو تو جتنا جی چاہے کھالو مگر اس طرح اگر زور زبردستی اور چوری سے چاول چھینو گے تو نتیجہ یہی ہوگا کہ ایک دن یہ سارے چاول جب پھر ختم ہوجائیں گے تو تم لوگ پھر چوری کروگے! اور چوری کرنے سے گناہ ہوتا ہے اور تم کو اللہ میاں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ یہ بات سُن کر تمام ڈاکو چُپ چاپ کھڑے ہو گئے اور بغیر کچھ لئے ہوئے معافی مانگ کر چلے گئے۔

فاہیان ۵ ویں صدی عیسوی کے ان معتبر اور عظیم انسانوں میں سے ایک ہے' جو ایک چینی سیاح کی حیثیت سے ہندوستان میں آیا۔ اس نے پورے ملک کا دورہ کیا ' اور بدھ مذہب کی تمام اچھی باتوں اور روایات کو خود بھی اپنایا اور نہ صرف چین بلکہ پوری دنیا میں اپنے سفرنامے کے ذریعہ تبلیغ کیا۔ اپنے سفرنامے میں فاہیان نے تفصیلی طور پر تحریر کیا ہے۔ کہ کس طرح وہ ایک یوجنا " یعنی ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف آگے بڑھتا تھا۔ کس طرح اس نے گوتم بدھ کی ہڈیاں' ان کے دانت اور ان کی کھوپڑی کی کھوج کی۔ وہ ہندوستان کی تہذیب' یہاں کی مہمان نوازی اور انسان دوستی سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ اس نے اپنی سوانح حیات میں لکھا ہے کہ بسا اوقات وہ کئی کئی سو مذہبی رہنماؤں یعنی MONK کے ساتھ تبلیغی سفر کو جب ہندوستان میں نکلتا تھا تو ان سب کے ہاتھ میں کشکول یعنی پیالے ہوتے تھے۔ لوگ عقیدت سے ان میں پھول اور پھل ڈالتے تھے۔ جو ان کے لئے غذا کا کام کرتے تھے۔ چونکہ فاہیان خود بھی بدھ مذہب کا رہنما تھا' اس لئے اس نے ہندوستان کے تمام بدھ مذہب زیارت گاہیں اور استوپس کا سفر کیا۔ جہاں سے بھی جو کچھ اسے بدھ مذہب کے بارے میں معلوم

ہوا۔ اس نے اسے اپنے سفرنامے میں تحریر کر لیا ـــــ فاہیان ۸۰ سال تک زندہ رہا۔ جس میں سے بیشتر حصّہ اس نے مذہب کی تبلیغ اور بدھ دھرم کی اشاعت میں صرف کیا۔ ایک روایت کے مطابق کہا جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ بدھ مذہب کے ماننے والے لوگ ہیں ـــــ یہ بات کہاں تک صحیح ہے، اس کی تحقیق ابھی ہو رہی ہے، مگر اتنا ضرور سچ ہے کہ چین میں جہاں تک بھی بدھ مذہب پھیلا ہے، اس کا سہرہ فاہیان کے سر ہے ـــ ہمیں فاہیان جیسی شخصیتوں کے ذریعہ یہ سبق حاصل کرنا چاہیئے کہ ایمانداری، سچائی، سادگی اور عدم تشدد یعنی (Non Violence) کے ذریعہ ہی انسان بڑا اور عظیم کہلاتا ہے۔

ہیون سانگ

ہندوستان کی ہزاروں سال پرانی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہاں کی تہذیب، یہاں کی انسان دوستی، مذہبی رسم و رواج، رسومات اور ادب و ثقافت نے ہمیشہ پوری دنیا کے دانشوروں اور سیاحوں کو متاثر کیا ہے۔ ایسا ہی ایک سیاح "ہیون سانگ" بھی تھا۔ جو ملکِ چین کا رہنے والا تھا۔ چین کا ایک اور سیاح فاہیان بھی اس سے پہلے گپتا دورِ حکومت میں ہندوستان آچکا تھا۔ جس کے ذریعے سے اس ملک کی زندگی کے مختلف حالات چین کے لوگوں میں جانے جا چکے تھے۔ ہیون سانگ سنہ ۶۰۳ء میں صوبہ ہونان میں شن لیئو کے مقام پر پیدا ہوا تھا۔ اور اس کا انتقال بھی اسی کے وطن میں سنہ ۶۶۴ء میں ہوا۔ چین میں بدھ مذہب کا کافی اثر تھا جس کی وجہ سے تیرہ برس کی عمر میں ہی ہیون سانگ کو بدھ بھکشو بنا دیا گیا تھا۔ وہ کسی بدھ مذہب کے اچھے گرو کی تلاش میں اِدھر اُدھر کافی گھوما، مگر مجبور ہو کر اسے ہندوستان کا رُخ محض اسی وجہ سے کرنا پڑا، تاکہ اسے ملک میں بدھ مذہب اور اس کے بارے میں تفصیل سے جاننے کا موقع ملے۔ چنانچہ وہ گیان پراپت کرتے گوتم بدھ کی سرزمین، ہندوستان کی طرف سنہ ۶۳۰ء میں چل پڑا۔ اس وقت اس کی عمر چھبیس سال کی تھی۔ وہ اس ملک میں مغربی ہند یعنی کشمیر کی طرف سے داخل ہوا اور جہاں کہیں بھی وہ گیا، اس نے تمام حالات تفصیل کے ساتھ اپنے سفرنامے میں درج کئے۔ چونکہ اس کا اصل مقصد بدھ مذہب اور اس کے قوانین کے

بارے میں معلومات حاصل کرنا تھا۔ اس وجہ سے "ہیون سانگ" نے زیادہ تر اس پہلو کو پیش نظر رکھا۔ اس نے بدھ راہبوں، خانقاہوں اور اس کے فرامین کو تلاش کیا۔ اس غیر ملکی سیاح کو کچھ ایسے قلمی نسخے بھی ملے۔ جو ہندوستان کی تاریخی زندگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ نسخے گپتا برہمی رسم الخط میں لکھے ہوئے ہیں۔ ہیون سانگ کا ہندوستان میں سفر کشمیر سے شروع ہو کر ٹکسلا ہوتے ہوئے متھرا کی طرف آگے بڑھتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کو پوری دنیا کے کینوس پر پہچانا جانے لگا تھا۔ اس وقت یہاں راجہ ہرش وردھن راج کر رہا تھا۔ یہ وہ راجہ ہے جس نے پورے ہندوستان کو خصوصاً شمالی ہند کے علاقہ کو تہذیبی، سیاسی، معاشی اور آرٹ و فنونِ لطیفہ کے اعتبار سے کافی اونچائی پر پہونچا دیا تھا۔ خود "ہیون سانگ" کا بیان ہے کہ ہرش وردھن کے دور میں اس نے ادب اور آرٹ کی ترقی کے لئے خود راجہ کو دلچسپی لیتے ہوئے دیکھا۔ جب یہ سیاح اپنے دورانِ سفر وارانسی پہونچتا ہے تو وہاں سارناتھ کے پاس بدھ راہبوں اور اس مذہب کے پیروکاروں کا ایک جم غفیر دیکھتا ہے اور مہاتما بدھ کی عقیدت میں لوگوں کو دیکھ کر اس کا سر بھی احترام میں جھک جاتا ہے۔ پھر وہ بہار کے ان شہروں کا دورہ بھی کرتا ہے، جہاں گوتم بدھ کے آثار پائے جاتے تھے۔ وہ کپل وستو، کشی نگر، پاٹلی پتر، ویشالی، مہا بودھی کی بھی یاترا کرتا ہے۔ نالندہ میں قیام کے دوران "ہیون سانگ" نے وہاں کی قدیم درس گاہ میں چھ مہینہ تعلیم بھی حاصل کی جس میں ہندو مذہب کی روایات اور اس کی رسم و رواج کو بھی جاننے کا موقع ملا۔ اسی جگہ پر اس نے سنسکرت اور دوسری زبانوں کا سبق بھی سیکھا۔ اس کا بیان تھا کہ پڑھا لکھا اور عالم طبقہ تو سنسکرت بولتا ہے، مگر عوام میں "پراکرت" زبان زیادہ مقبول ہے۔ بہار کے بعض دوسرے علاقوں کے علاوہ راجگیر ہوتا ہوا وہ نیپال میں بھی گیا۔

بہار کے ایک چھوٹے سے علاقے ویشالی کے بارے میں وہ اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ اس جگہ کی زمین بڑی زرخیز ہے اور پھل و سبزیاں افراط سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس کو اس جگہ کے آم اور کیلے بہت زیادہ پسند آئے۔ وہ ایک اور پھل کے بارے

میں لکھتا ہے کہ ویشالی میں ایک پھل درختوں پر کثرت سے گرمی کے موسم میں پایا جاتا ہے۔ جس کا چھلکا اُوپر سے سرخ اور کانٹے دار ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر گول ہوتا ہے۔ اس کو چھلنے پر اس کا گودا نہایت میٹھا اور لذیذ ہوتا ہے۔ غالباً اس کا اشارہ لیچی پھل کی طرف ہوگا۔ وہ مزید ویشالی کے لوگوں کے بارے میں لکھتا ہے کہ وہاں کے لوگ عام طور پر نیک اور ایماندار ہوتے ہیں۔ اپنے مہمان کی خاطر خوب کرتے ہیں۔ انھیں مذہب سے لگاؤ اور عقیدت ہے۔ لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو خدا کے منکر ہیں۔ ایسے لوگوں کو عزت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ وہ مزید یہ بھی لکھتا ہے کہ ویشالی شہر کے اندر اور باہر اس قدر متبرک مقامات ہیں کہ اُن کی گنتی کرنا مشکل ہے۔ اس سیاح کو ویشالی اور نالندہ میں شیل بھدر اور بدھ بھدر جیسے عالموں سے بھی استفادہ حاصل کرنے کا موقعہ ملا۔ جس سے اس کا ہندوستان آنے کا مقصد پورا ہوگیا۔

ہیون سانگ اپنے سفرنامے میں ہندوستان میں رائج مختلف عقیدوں اور رسومات کے بارے میں بھی لکھتا ہے کہ یہاں کے لوگ مزاج کے اعتبار سے نرم اور خوش آمد پسند ہیں، جس کی وجہ سے کسی بھی طاقتور چیز کے آگے وہ سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اس کو مہاراجہ ہرش وردھن کے دربار میں مہمان ہونے کا بھی فخر حاصل ہوا۔ دورانِ قیام اس نے دیکھا کہ راجہ ایک زبردست، بہادر، اور بڑے سے بڑا فیصلہ کرنے کی پوری قدرت رکھنے والا تھا۔ وہ ایماندار اور وفادار لوگوں کے لئے بے حد مہربان مگر ساتھ ہی بے ایمان اور غدار لوگوں کے لئے انتہائی خطرناک تھا۔ وہ راجہ کی نظر میں قابلِ عزت تھا۔ کیونکہ چین سے ہندوستان تک کا سفر جس محنت، جفاکشی اور جُرأت کے ساتھ کیا تھا۔ اس سے اس کی قدر راجہ کی نظر میں بہت تھی۔ جب ہیون سانگ اپنے وطن واپس جانا چاہتا تھا تو راجہ کی فرمائش پر اس نے مزید ایک سال اور اس کے ساتھ قیام کیا۔ اسطرح جب یہ چینی سیاح تقریباً پندرہ سال ہندوستان میں قیام کے بعد ۶۴۵ء میں چین واپس جانے لگا تو بدھ راہبوں اور راجہ ہرش وردھن کی طرف سے اس کو زبردست انعامات واکرامات سے نوازا گیا۔ بہت سی کتابیں، تحفہ، مورتیاں، اور

سونا اس کے ساتھ کیا گیا۔ ہیون سانگ نے واپسی کے لئے بھی وہی راستہ اختیار کیا جس سے وہ ہندوستان آیا تھا کہا جاتا ہے کہ واپس ہوتے وقت دریائے سندھ پار کرتے وقت اس کی کشتی اُلٹ گئی تھی۔ جس سے اس کا بہت سارا سامان ضائع ہو گیا۔ جب یہ خبر راجہ اور اس کے دوسرے جاننے والوں کو ملی تو دوبارہ اس کو بہت سے انعام سے نوازا گیا۔ لیکن پھر بھی کچھ اچھے قلمی نسخہ ہمیشہ کے لئے ضائع ہو گئے۔ جس کا اس کو مرتے وقت تک افسوس رہا۔

ہیون سانگ کو جو کچھ ہندوستان سے حاصل ہوا، اس نے چین پہونچ کر ۶۶۵۲ میں ایک پگوڈا یعنی مندر بنوا کر وہ تمام چیزیں پہونچا دیں۔ ہیون سانگ قدیم ہندوستان کے زمانے کا ایک ایسا غیر ملکی سیاح ہے، جس نے ہندوستان کی زندگی کو اپنے سفرنامے کے ذریعہ دنیا میں پھیلانے کی کامیاب کوشش کی ــــ اسی سیاح کے ذریعہ چین میں بدھ مذہب کو فروغ ملا۔ ٭٭٭

الخوارزمی

علم اور ثقافت کی سطح پر دنیا کی مختلف تہذیبوں کا ایک دوسرے سے متاثر ہونا، مطالعہ کے لئے ایک دلچسپ موضوع فراہم کرتا ہے۔ کیوں کہ ہر طرح کے خیالات اور تصورات ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہتے ہیں اور ہر جگہ مختلف زمین اور ملکوں کے درمیان اشتراک اور ردِّ عمل کی گنجائش نکلتی رہتی ہے۔ ہندوستان کا شمار بھی تاریخ کے قدیم دور سے ان ممالک میں کیا جاتا رہا ہے۔ جہاں تہذیب انسانی نے پہلے پہل اپنے قدم جمائے تھے اور جہاں فکر و حکمت کو خاطر خواہ فروغ ہوا تھا۔ یونان، مصر، روم، ایران کی پہاڑیاں ایران میں اور سمیریہ عراق میں یا اسی طرح کے بعض دوسرے ممالک بھی اس ضمن میں آتے ہیں۔ جہاں کی تہذیب اور فن ہندوستان کے ساتھ پروان چڑھتا رہا۔

الخوارزمی ایک ایسا غیر ملکی سیاح اور مورخ ہوا ہے جس نے آٹھویں صدی تک کے ہندوستان کو دنیا کے سامنے روشناس کرایا۔ اسی زمانے میں ہندوستان بھی تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے موریہ کشان، شنگ اور گپتا دور کی تہذیبی قدروں سے گزرتا ہوا ابھرے دور کی نشاندہی کر رہا تھا۔ یہاں حکمت، فلسفہ، تاریخ، فن نجوم اور فن اقلیدس کے اعلیٰ ماہرین نئے نئے گوشوں کا انکشاف کر رہے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ مذہبی اعتبار سے بھی ہندو، جین اور بدھ مذہب کی اعلیٰ تعلیم اور فلسفہ عدم تشدد کے پیغامات بھی پوری دنیا میں پھیل رہے تھے۔

ایسے ہی دور میں الخوارزمی نے آج سے تقریباً بارہ سو برس پہلے وسط ایشیا کے ایک شہر "خیوا" میں آنکھ کھولی۔ ان کا پورا نام ابوعبداللہ محمد بن موسیٰ تھا۔ چونکہ یہ ۷۸۳ء میں موجودہ ملک روس کے ازبکستان کے علاقہ خوارزم میں پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے علاقہ کی مناسبت سے ان کو بھی الخوارزمی کہا جانے لگا۔ الخوارزمی کی پیدائش سے صرف ستر سال پہلے ازبکستان پر اُمیہ خلفاء کا قبضہ تھا۔ اسلام کے آنے سے پہلے وسط ایشیا میں بدھ مذہب کا بہت پرچار تھا، جس کی بناء پر اس علاقہ کا زیادہ تر حصہ بدھ مذہب کا پیرو کار تھا۔ چونکہ بدھ مذہب کی ابتداء ہندوستان میں ہوئی تھی۔ اس لئے الخوارزمی کو بھی اس ملک کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کا شوق ہوا۔ یہ دنیا کے ان اوّل ترین دانشوروں میں سے ایک تھا، جس نے حکمت و فلسفہ، نیز ہندوستان کی تاریخ کو عربی زبان میں اس قدر سلیقہ سے ترتیب دیا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا ہوتا تو شاید اس ملک کی تاریخ یورپ اور دنیا کے دوسرے ممالک میں اتنی آسانی اور اس قدر جلدی سے ہرگز نہ پہونچی ہوتی۔

الخوارزمی کے بعد اسی علاقہ کے دو اور غیر معمولی شخصیت کے حامل سیاح تھے جنھیں آج بھی دنیا، ابن سینا اور البیرونی کے نام سے جانتی ہے۔ ان دونوں سیاحوں نے بھی الخوارزمی کی لکھی ہوئی کتابوں سے بہت کچھ استفادہ حاصل کیا جو ہندوستان کی تہذیبی اور تعلیمی زندگی پر لکھی گئیں تھیں۔

الخوارزمی کی پیدائش کے وقت بغداد میں عباسی خلیفہ المنصور کی حکومت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ المنصور کے بعد جب المامون بغداد میں خلیفہ ہوئے تو ۸۱۳ء میں یہ خوارزم پہنچے تو ان کی ملاقات الخوارزمی سے ہوئی۔ اس نوجوان کی قابلیت اور ذہانت کو دیکھ کر خلیفہ اپنے ساتھ خوارزمی کو بھی بغداد لے آئے۔ خلیفہ مامون کا یہ کارنامہ ہے کہ اس نے دنیا کے مختلف زبانوں کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کروایا۔ جس میں الخوارزمی نے ہندوستان کی سائنس اور طبیعات کے موضوعات پر لکھی گئی کتابوں کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی ذمہ داری لی اور خلیفہ کی طرف سے الخوارزمی کو بغداد کی مشہور یونیورسٹی

"بیت الحکمت" کا انچارج مقرر کیا گیا۔

بغداد میں قیام کے دوران الخوارزمی کو ہندوستانی علوم اور یہاں کی تہذیبی تاریخی اور سماجی زندگی کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ خود خوارزمی کا بیان ہے کہ اگر وہ ہندوستان کے کسی شہر یا علاقہ میں پیدا ہوا ہوتا تو گوتم بدھ کی تمام زیارت گاہوں خانقاہوں اور اُن کے لکھے ہوئے تمام احکامات کو بنفس نفیس دیکھتا اور مطالعہ کرتا۔

الخوارزمی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ہندوستانی علم شمار، حساب، الجبرا، جیوتش، علم مثلث، جغرافیہ اور تاریخ جیسے موضوعات پر جو بھی کتابیں دیکھیں، ان کو عربی زبان میں منتقل کیا۔ علم ہندسہ اور طریقہ شمار کے بارے میں ہندوستان کی جن کتابوں کا الخوارزمی نے ترجمہ کیا، وہ اب عربی زبان میں موجود نہیں ہیں۔ لیکن بارہویں صدی عیسوی میں لاطینی زبان میں ان کتابوں کا جو ترجمہ ہوا تھا، وہ اب بھی دستیاب ہیں۔ ان میں سے الخوارزمی کی ایک کتاب کا لاطینی ترجمہ بہت مشہور ہوا جو "ہندوستان کے متعلق الخوارزمی کی کتاب" کے نام سے آج بھی جانی جاتی ہے۔ اس نے علم ریاضیات، اور جیوتش کے فن کو پوری دنیا میں متعارف کرایا۔ خود خوارزمی کا کہنا تھا کہ اگر ان موضوعات، پر ہندوستانی کتابیں نہ لکھی گئی ہوتیں تو نہ صرف عرب بلکہ پوری دنیا ان فنون سے ناواقف رہتی ــــ الخوارزمی نے جیوتش کے موضوع پر ہندوستانی کتاب کا عربی میں ترجمہ کرتے وقت ہندوستان کے بعض علاقوں، جگہوں، یہاں کے موسم اور یہاں کے لوگوں کی سماجی زندگی کی بھی تصویر کشی کی ہے۔ اس سیاح کا کہنا تھا کہ چھٹی صدی عیسوی میں جب کہ پورا وسط اور مغربی ایشیا جہالت اور ناواقفیت کے دور سے گزر رہا تھا اور وہ لوگ تہذیبی زندگی سے ناواقف تھے۔ اس وقت ہندوستان کے مشرقی علاقہ میں لوگ تعلیم یافتہ، تہذیب یافتہ اور منظم زندگی گزار رہے تھے۔ ان کے پاس جینے کا سلیقہ، اور زندگی گزارنے کا باقاعدہ شعور تھا۔ وہ مذہب کو بعض برائی سے نجات پانے کا ایک ذریعہ ہی نہیں بلکہ معاشرتی زندگی کا ایک سبب بھی سمجھتے تھے۔ ہندوستان میں فن جیوتش اس قدر مقبول تھا کہ بڑے بڑے راجہ اور امراء اپنے مستقبل میں پیش

آنے والے واقعات کا اندازہ اسی فن کی بنا پر کرتے تھے۔ الخوارزمی ایک ہندو ستا
کتاب کا ترجمہ کرتے وقت لکھتا ہے کہ مہاراجہ چندر گپت موریہ کو اپنی موت کی خبر
دو سال پہلے مل گئی تھی اور ایک جیوتش کی پیشن گوئی کے مطابق وہ ٹھیک اسی
تاریخ کو فوت ہوا۔ الخوارزمی اگرچہ خود کبھی بھی ہندوستان نہ آسکا مگر اس نے بڑی
ہی دلچسپی سے یہاں کے شب و روز اور یہاں کی عوامی زندگی کو سمجھنے اور سمجھانے میں اہم
رول ادا کیا۔ ایک طرح سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ الخوارزمی کی وجہ سے ہی عرب اور دوسرے
ممالک میں ہندوستانی علوم اور خاص کر جیومیٹری، الجبرا اور جیوتش کی معلومات
حاصل ہوئیں۔

الخوارزمی نے بعض ہندوستانی کتابوں کو پڑھ کر، اپنے نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ سے بھی کچھ
کتابیں لکھیں جس میں "علم الجبر والمقابلہ" الجبرا کے فن پر عربی زبان میں یہ پہلی کتاب ہے۔
اس کتاب کا ترجمہ لاطینی زبان میں ہو کر پورے یورپ میں مقبول ہو گیا۔ اس طرح لفظ
'الجبر' ہی سے انگریزی میں "الجبرا" مشہور ہو گیا۔

الخوارزمی دنیا کے ان چند سیاحوں میں سے ایک ہے جس نے سائنس کے فن کو فروغ
دینے میں خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ جیوتش کے موضوع پر لکھی ہوئی سنسکرت زبان
میں ایک کتاب جب اس کو ملی تو اس نے بذاتِ خود اس کو پڑھنے کی خلیفہ مامون سے
خواہش ظاہر کی۔ جب کہ وہ سنسکرت زبان سے بالکل ناواقف تھا۔ چنانچہ اس کی
خواہش کے مطابق ہندوستان سے چھ مدبّر سنسکرت کے عالموں کو بغداد آنے کی
دعوت دی گئی۔ الخوارزمی نے پانچ سال تک متواتر سنسکرت زبان و ادب کا مطالعہ
ان ہندوستانی عالموں کی شاگردی میں کیا اور تب دس سال کی لگاتار محنت سے علم
جیوتش پر ایک عربی زبان میں کتاب لکھی اور ہندوستانی ضابطوں کے مطابق بغداد میں
ایک "رصدگاہ" یعنی (OBSERVATORY) بھی تعمیر کروائی جو موسموں، وقت اور سیاروں
کی حرکت کا پتہ دیتی تھی۔ الخوارزمی کا ایک اور بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے سب
سے پہلے علم جغرافیہ کے موضوع پر "صورت الارض" نام کی کتاب لکھی۔ جس میں پوری دنیا

کے اہم مقامات کا ذکر، وہاں کے موسم، اس کی جائے وقوع اور مختلف ملکوں کے اڑتیس ۳۸ نقشے بھی تیار کئے۔ جس میں ہندوستان کا ذکر تفصیلی طور پر کیا۔ پوری دنیا میں ہندوستان کی جائے وقوع، یہاں کے مختلف موسموں اور خاص کر شمالی ہندوستان میں پیدا ہونے والی اشیاء کا بھی ذکر ہے۔ یہاں کی دالوں، چاول اور جانوروں کا بھی اس کتاب میں ذکر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ایک ایسے پہاڑ کا نقشہ بھی بنایا گیا ہے جو یقیناً آج کا ہمالیہ پہاڑ ہی رہا ہوگا۔ اس جغرافیہ کی کتاب میں الخوارزمی نے دریائے گنگا، جمنا اور سندھ کی ندی کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ کے حوالے سے ان دریاؤں کے کنارے بسنے والی قوموں اور حکومتوں کا بھی بیان ہے۔

ایک بیان کے مطابق کہا جاتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں محمود غزنوی اور بعض دوسرے صوفیوں اور سیاحوں نے ہندوستان میں داخل ہونے کے لئے الخوارزمی کی اس جغرافیہ کی کتاب کو مشعلِ راہ بنایا ہوگا۔ جس سے اُن کی منزلیں آسان ہو گئی ہونگی۔ الخوارزمی دنیا کے ان سیاحوں اور دانشوروں میں سے ایک ہے جس نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھے بغیر ہی یہاں کی زندگی کی بڑی صحیح عکاسی کی ہے، اور پوری دنیا کے سامنے آج سے ایک ہزار دو سو سال پہلے ہی ہندوستان کو دنیا کے کینوس پر نمایاں طور پر متعارف کرا دیا تھا۔ ⁂

البیرونی

(غیر ملکی سیاح)

ھندوستان میں غیر ملکی سیاحوں کی آمد کا سلسلہ تو حضرت عیسیٰ مسیح کی پیدائش سے پہلے ہی شروع ہوگیا تھا اور یونان وغیرہ سے عہدِ موریہ ہی میں غیر ملکی سیاح آنے لگے تھے۔ لیکن البیرونی ایک ایسا سیاح تھا جس نے دسویں صدی عیسوی میں ہندوستان کی سرزمین پر آکر یہاں کی نہ صرف تاریخی زندگی کو قلمبند کیا بلکہ زندگی کے مختلف شعبوں کا بیان کیا ہے جس سے بیرون ممالک میں ہندوستان کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی کی معلومات سامنے آئیں۔

البیرونی کا پورا نام، ابوریحان محمد ابن احمد تھا۔ اس کی پیدائش وسط ایشیا کے شہر خوارزم میں ۹۷۳ء میں ہوئی تھی۔ جو اب روس کے ایک صوبہ ازبکستان میں واقع ہے۔ اس کا لقب البیرونی پڑنے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ چونکہ اس کے والدین ایرانی نسل کے تھے اور بعد میں خوارزم میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ اس لئے بیرون ملک کا ہونے کی وجہ سے اس کو "بیرونی کہا جانے لگا۔ البیرونی دراصل ایک محنت کش اور پریشان حال انسان تھا اور زندگی گزارنے کے لئے کوئی صحیح سمت اختیار نہ کر پارہا تھا کہ اس دوران خوارزم پر سلطان محمود غزنوی نے حملہ کرکے اپنے قبضہ میں لے لیا۔ محمود غزنوی نے جب البیرونی کی ذہانت اور قابلیت [illegible]ہ لگا لیا تو اسے بھی اپنے

ہمراہ شہر غزنی لے آیا اور تبھی سے اس عالم انسان کی زندگی کا ایک نیا اور روشن باب کھل جاتا ہے۔ البیرونی خود ایک خود دار اور حقیقت پسند انسان تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس نے ہندوستان پر جو کتاب لکھی ہے اس میں صرف چند جگہوں پر ہی سلطان محمود غزنوی کا ذکر کیا ہے۔ اس لئے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ البیرونی کو سلطان کی بہت ساری حرکتیں پسند نہ تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سیاح کی ہندوستان آنے کی دلچسپی محمود غزنوی کے دربار ہی میں پیدا ہوئی۔ کیونکہ سلطان کے یہاں ہندوستان کی دولت، یہاں کے رسم و رواج، مذاہب اور سماجی زندگی کا اثر اکثر ہوا کرتا تھا۔ خود بہت سارے ہندوستانی قیدی، علماء اور کاریگروں سے اس کو ملنے کا موقع رہا۔ جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ دسویں صدی کے اواخر اور گیارہویں صدی کی ابتداء میں محمود غزنوی نے بھارت پر کئی حملے کئے اور یہاں کا ڈھیر سارا خزانہ وہ غزنی شہر لے گیا۔ البیرونی نے شروع میں تو غزنی ہی میں رہ کر ہندوستانی ادب اور ثقافت کو کتابوں کے ذریعہ جانا اور سمجھا۔ یہاں کی کتابوں کے عربی ترجمے پڑھے اور تب اس نے ہندوستان آنے کا ارادہ کیا۔ ۹۹۷ء میں پہلی بار اس نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا اور افغانستان، پاکستان ہوتا ہوا پنجاب کے راستے سے ملک کے مختلف حصوں کا دورہ کیا۔ اس نے اس ملک میں قیام کے دوران سنسکرت زبان کا مطالعہ کیا اور اچھی طرح واقفیت حاصل کی۔ البیرونی نہ صرف ایک عظیم ماہر لسانیات تھا بلکہ ایک بڑا مصنف بھی تھا۔ وہ عبرانی، شامی، عربی، فارسی اور سنسکرت کو بخوبی جانتا تھا۔ البتہ وہ یونانی زبان سے واقف نہ تھا لیکن دوسری زبانوں کی کتابوں کے ترجمے سے اس نے یونانی مفکرین، اور افلاطون وغیرہ کے نظریات کا مطالعہ کیا۔ اس نے اپنی زیادہ تر تصانیف عربی زبان میں لکھی ہیں۔ البیرونی نے اپنی موت سے کچھ عرصہ پہلے اپنے خط میں خود اپنی تصانیف کا ذکر کیا ہے جس کی تعداد ایک سو چودہ (۱۱۴) بتائی جاتی ہے، لیکن یہ تعداد بھی مکمل نہیں ہے۔ ایک اور بیان کے مطابق اس کی تصانیف اس سے بھی زیادہ ہیں جو کسی وجہ سے مکمل نہ ہو سکیں۔ البیرونی کی دو مشہور کتابیں آج بھی دیکھی جاسکتی

ہیں، جن کا دنیا کی ہر اہم زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام "الطہر البیقیہ" اور دوسری کا نام "کتاب الہند" ہے۔ البیرونی کی یہ کتاب "کتاب الہند" ہندوستانی سماج، مذہب اور سائنسی علوم پر اسّی ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں پہلا باب تمہیدی ہے۔ اس باب میں مصنف نے اُن دشواریوں کا ذکر کیا ہے۔ جو اُسے لسانی، نسلی، مذہبی تعصبات وغیرہ کی وجہ سے پیش آئیں۔ اصل کتاب میں ابواب کی تقسیم ان موضوعات پر کی گئی ہے۔ جیسے مذہب، فلسفہ، معاشرتی تنظیم، شہری اور سماجی قوانین، رسم ورواج، مذہبی قوانین، علم الاصنام، سائنسی ادب، نظامِ زندگی، اوزان، اُقلیدس، الکیمیا، جغرافیہ، احوالِ عالم، علم فلکیات، ادب، تہوار، اور جیوتش وغیرہ ـــــ البیرونی کی اس کتاب کے ذریعہ سے اس دور، یعنی دورِ وسطیٰ کے ہندوستان کی کھلی ہوئی تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ جس میں رائج ذات پات کے نظام کا اس قدر مفصل اور توضیحی ذکر کسی اور غیر ہندوستانی تاریخی ماخذ میں نہیں ملتا ہے۔ سائنسی علوم میں البیرونی نے علم جیوتش پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اس کی وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے اندر اس علم کا بے حد مقبول ہونا ہے اور دوسرا سبب خود مصنف کا اس موضوع سے نہایت دلچسپی کا باعث بنا۔ اس نے علم جیوتش کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، ایک وہ جس کا براہِ راست تعلق سائنس اور تجربے و مشاہدے کی بنا پر تھا اور دوسرا یہ کہ کچھ لوگوں کا اس فن پر اندھا عقیدہ۔ البیرونی نے تفصیل سے ان دونوں باتوں کو واضح کرنا چاہا ہے۔ اسی طرح مذہب کے معاملہ میں بھی وہ پڑھے لکھے اور جاہل ہندوستانیوں کے خیالات میں فرق پایا جاتا ہے۔ تعلیم یافتہ ہندوؤں کا نظریہ، خدا، توحید اور وحدۃ الوجود کے نظریہ پر قائم تھا۔ جبکہ تمام ہندوؤں کے نزدیک دیوی، دیوتاؤں اور ما فوق الفطرت عناصر کی بہت اہمیت تھی۔ وہ چونکہ خود ایک عالم اور پکا مسلمان تھا۔ اس لئے ہندوؤں کے مذہب اور اسلام کا موازنہ کرتے ہوئے دونوں کی مشترک خوبیوں کا اعتراف بھی کرتا ہے اور کہیں کہیں پر نظریات کے اختلاف کی وجہ سے اپنی ذاتی رائے کا اظہار بھی کیا ہے۔ تعلیم، علاقائی زبانوں اور رسم الخط پر بھی البیرونی کی تحریر میں معلوماتی

اشارے ملتے ہیں۔ اگرچہ اس زمانے میں عربی زبان کو بین الاقوامی حیثیت حاصل تھی پھر بھی وہ جگہ جگہ پر سنسکرت زبان کا مداح نظر آتا ہے۔ وہ ہندوستانی رسم الخط کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس ملک کی زبان سنسکرت کا سب سے پرانا رسم الخط "برہمی" ہے جبکہ خروشٹی کو بھی اس نے عربی زبان کے زیر اثر بتلایا ہے۔ کیوں کہ عربی کی طرح خروشٹی بھی دائیں سے بائیں لکھی جاتی ہے ـــــ اقتصادی دلچسپی کی معلومات کو اس نے اپنی کتاب میں بہت کم جگہ دی ہے۔ اس کے باوجود مشہور سومناتھ مندر کی معاشی اہمیت کی وجوہات، گئو کشی کی ممانعت ٹیکسوں کے اصول، جائداد کی تقسیم، عصمت فروشی وغیرہ جیسے منفرد موضوعات پر اس کی گہری دلچسپی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ "کتاب الہند" کا اہم اور معتبر حصہ سرزمین ہند کے جغرافیائی حالات پر مشتمل ہے۔ جس میں مصنف نے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے موسم، وہاں کے پہناوے، وہاں کے رہن سہن یہاں تک کہ علاقہ کی مناسبت سے وہاں کی بول چال کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ بھارت کے شمالی حصّہ میں رہنے والوں کا مزاج بھی وہاں کی آب وہوا کی طرح معتدل ہے۔ جبکہ ساحلی علاقوں پر رہنے والے لوگوں کی طبیعت سیدھی اور سادہ ہے۔ اس نے علاقوں اور صوبوں کی تقسیم کے ساتھ ساتھ وہاں کے رہنے والوں کے جسم، قدوقامت اور رنگ و نسل کا بھی تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ہندوستان کے لوگوں میں مذہب کا اثر اُن کی سماجی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی پر بہت زیادہ ہے جس کی وجہ سے مندروں میں اُن کے جذبات کا اظہار بھی ملتا ہے اور ان کی فنونِ لطیفہ میں زبردست دلچسپی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

ہندوستان کی مشہور رزمیہ تصنیف، مہابھارت کا ذکر کرتے ہوئے البیرونی نے جنگ کی وجوہات، اور افادیت پر زور دیا ہے اور جو نظریات پیش کئے ہیں۔ وہ بھی قابلِ توجہ ہیں۔ اس نے لکھا ہے کہ مہابھارت کو محض ایک شاعر کی خیالی تخلیق نہ سمجھنا چاہیئے۔ بلکہ اس عہد کی زندگی میں پیش آنے والے سماجی حالات اور لوگوں میں حق وباطل کے اختلافات کا پکا یقین ہونے کا بھی مظہر بھی ہے ـــــ البیرونی کی تحقیق کے مطابق مہابھارت کا واقعہ ایک حقیقت ہے جو شاید حضرت عیسیٰ مسیح سے

لگ بھگ پندرہ سو سال پہلے پیش آیا ہوگا۔ البیرونی ہندوستانی تمدن سے قطعاً ناواقف تھا لیکن اس نے اپنی ذرائع معلومات کی بنیاد پر غیر معمولی راست گوئی سے کام لیا۔ اور اس طرح اپنے ہم وطنوں کے سامنے ہندوستان کی ایک ایسی واضح تصویر پیش کی جس سے پوری دنیا میں اس ملک کی خوبصورت نمائندگی ہونے لگی۔

ہندوستان کے بارے میں البیرونی کی عالمانہ، محققانہ، دلچسپی کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس زمانے کے سماجی اور سیاسی حالات پر بھی نظر رکھی جائے۔ کیونکہ ایک طرف تو البیرونی جیسا عظیم دانشور ہندوستان میں رہنے والے ہندوؤں کی اصطلاح کو مذہبی نہیں بلکہ علاقائی معنوں میں استعمال کر رہا ہے۔ کیونکہ اس کا خیال یہ ہے کہ عام طور پر زیادہ تر علاقوں کے رہنے والے لوگوں کا رنگ نسبتاً کالا ہوتا ہے۔ اس لئے وہ فارسی یا ترکی معنوں میں ہندو کہلاتے تھے۔ اس کے نزدیک تمام ہندوستانی چاہے وہ جین یا بدھ یا کسی بھی مذہب اور عقیدہ کے ماننے والے ہوں وہ ہندو ہیں، اور اسی علاقہ کی مناسبت سے ملک کا نام ہندوستان کہلایا ـــــ جبکہ اسی زمانے کا ایک غیر ملکی بادشاہ اور حاکم محمود غزنوی ہندوستان پر مسلسل حملے کر کے مذہب کے پیش نظر اُن کو مذہبی نام ہندو دے رہا ہے ـــ حالانکہ محمود غزنوی کے زیر اثر البیرونی کو شہرت حاصل ہوئی، مگر جذباتی طور پر ہر جگہ یہ مصنف اور مورخ بادشاہ سے اختلاف کرتا ہے اور حقیقت بیانی سے کام لے کر تمام ہندوستانیوں کے لئے نیک اور ہمدردانہ جذبہ رکھتا ہے۔

البیرونی ایک اعتبار سے خوارزمی کے بعد وہ پہلا غیر ملکی مسلم سیاح ہے جس نے ہندوستان کے حالات کو اس قدر تفصیل اور سائنسی اصولوں پر مبنی پیش کیا ہے جس سے نہ صرف اس ملک کو غیر ممالک میں جانا گیا۔ بلکہ وسط ایشیاء اور اسلامی ممالک کے درمیان آپسی اشتراک، دوستی اور سلسلہ کی ایک اہم کڑی بھی بنا۔ ٭٭٭

ابنِ بطوطہ

ایک غیر مُلکی سیّاح

ہندوستان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے میں بعض اہم غیر ملکی سیاحوں کا بڑا اہم رول رہا ہے۔ انھیں میں سے ایک "ابنِ بطوطہ" بھی تھا۔ چودھویں صدی کا، نصف زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں اس اعتبار سے کافی مشہور ہوا کہ اس دور میں ہندوستان کی راجدھانی دہلی میں ایک ایسا بادشاہ تخت نشین تھا جو ذہین دردمند اور حکومت کے کاموں میں پوری طرح دلچسپی رکھنے کے باوجود کچھ سر پھرا اور سنکی بھی تھا۔ اس کا نام محمد بن تغلق تھا۔ ۱۳۲۵ء میں جب یہ بادشاہ تخت نشین ہوا تو اس کی بعض حرکتوں کی وجہ سے دربار کے امرا اور عہدہ دار اس کے ہم خیال نہ ہو سکے۔ عین اس افراتفری کے دور میں ہندوستان کی سرزمین پر ایک غیر ملکی سیاح ابنِ بطوطہ نمودار ہوتا ہے۔ اس کا پورا نام "شمس الدّین ابو عبداللہ عرف محمد ابنِ بطوطہ تھا۔ جس کی پیدائش ۱۳۰۴ء میں مراقش کے ایک شہر تنجیرہ (افریقہ) میں ہوئی تھی۔ یہ ایک غریب خاندان میں پیدا ہوا تھا اور ۶۴ سال کی عمر پائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں ۷۵ ہزار میل کا سفر طے کیا تھا۔ اس طرح اس کی عمر کے حساب سے سالانہ سفر کی اوسط ایک ہزار میل سے بھی زیادہ ہے۔ جو اس زمانے کے حالات اور ذرائع و وسائل کو دیکھتے ہوئے انتہائی تعجب خیز ہے۔ جس میں شمالی افریقہ، ایران، مصر، شام، فلسطین، حجاز، ترکی، بخارا، سمرقند، ہرات، کابل، غزنہ، چین، مالدیپ، عراق اور ہندوستان شامل ہیں۔

اپنے سفرنامے میں ابنِ بطوطہ لکھتا ہے کہ ۷۳۴ھ کے ماہِ محرم کی پہلی تاریخ تھی کہ وہ دریائے سندھ (ہندوستان) کے کنارے پہونچا۔ یہ دریا دنیا کے بہت بڑے دریاؤں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس طرح مصر کے باشندوں کی زراعت کا دارومدار دریائے نیل پر ہے۔ ہندوستان میں بھی لوگوں کا دارومدار دریائے سندھ پر ہے۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ جب وہ یہاں پہنچا تو اس وقت کے بادشاہ (محمد بن تغلق) کے اخبار نویسوں نے اس کی آمد کی خبر ملتان کے حاکم کو بھیجی۔ عام طور سے باہر سے آنے والی کی تعظیم و تکریم اور آؤ بھگت اس کے حلیہ اور مرتبہ سے ہوتی ہے، اور بادشاہ اسے انعامات و اکرامات سے بھی نوازتا ہے اور اگر کسی غیر ملکی باشندے میں خصوصیت ہو تو اُسے بادشاہ اپنے دربار میں اونچے عہدوں سے بھی نوازتا ہے۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ پردیسی کو ہمیشہ "عزیز" کے نام سے مخاطب کیا جائے۔ جب ابنِ بطوطہ دہلی پہونچا تو دربار میں باریابی حاصل کی اور جلد ہی اُسے حکومت کا "قاضی" مقرر کر دیا گیا۔ شاہی دربار میں شامل ہو جانے کی وجہ سے اسے بادشاہ، نیز وہاں کے امراء کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چونکہ ابنِ بطوطہ خود بڑا عالم تھا اور کئی زبانوں کا جاننے والا تھا اس لئے اس نے بلا کسی جھجھک کے بہت سے لوگوں کی اچھی بری عادتیں اپنے سفرنامے میں لکھ دیں۔ کچھ عرصے تک تو بادشاہ محمد بن تغلق اس سیاح سے بہت خوش رہا، مگر جب اس کی سچ باتیں اُس کو بری لگنے لگیں تو ناراض ہو گیا اور عہدہ سے ہٹا دیا۔

سفر کے دوران ابنِ بطوطہ کو جو باتیں یا اس میں اسے اپنے وطن سے مختلف نظر آئیں۔ ان کو اس نے اپنے سفرنامے میں تحریر کیا۔

مثال کے طور پر "ستی" یعنی بیوہ عورت کا اپنے شوہر کی چتا پر زندہ جل کر راکھ ہو جانا۔ اور جوہر کی رسم نے اسے بہت زیادہ متاثر کیا۔ ابنِ بطوطہ نے اپنی آنکھوں سے تین عورتوں کو جن کے شوہر لڑائی میں مارے گئے تھے۔ آگ میں زندہ جل کر ستی ہوتے دیکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اپنے شوہروں کے مارے جانے کی خبر سُن کر ان عورتوں نے اشنان کیا۔ سُہاگ کے جوڑے پہنے۔ بناؤ سنگار کیا، اور جلوس کے ساتھ گھوڑوں پر بیٹھ کر شمشان گھاٹ پہنچیں۔ چتا کے پاس پہنچ کر انھوں نے اپنے قیمتی کپڑے اور تمام زیورات ایک ایک کر کے خیرات

کر دیے اور اپنے جسم کو کسی موٹے کپڑے سے ڈھانپ لیا۔ ہندو اگنی کو دیوتا مانتے ہیں۔ اس لئے ان عورتوں نے آگ کو پرنام کیا اور چتا میں مصمم ارادے کے ساتھ کود گئیں۔ اس وقت ہر طرف شہنائیاں بجائی گئیں اور ڈھول پیٹے گئے۔ اردگرد کھڑے لوگ چتا پر مزید لکڑی اور دیسی گھی ڈالتے گئے۔ ابن بطوطہ یہیں تک دیکھ پایا تھا کہ وہ اس دردناک منظر کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہوگیا۔ یہ منظر اسے بہرحال پسند نہ آیا۔ اس نے بڑے ہی تلخ لہجہ میں اس رسم کی برائی اپنے سفرنامے میں کی ہے۔ جب کہ عجیب اتفاق ہے کہ اس زمانے کا ایک شاعر اور صوفی منش انسان امیر خسرو کی نظر میں ستی کی یہ رسم بڑی اچھی، اور قابل تعریف تھی۔ وہ ستی کے مناظر کو بڑے شوق سے دیکھتا تھا۔ اسے افسوس تھا کہ اسلام مسلمانوں کو اس رواج کی اجازت نہیں دیتا ہے۔

ابن بطوطہ نے زمانۂ وسطیٰ کے ہندوستانی سماج کی اور بھی کئی باتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان دنوں سماج کے غریب اور محنت کش طبقے پر زمیندار غالب تھے۔ جنہیں نفع یا نقصان کی پروا نہ تھی۔ بلکہ اپنے کو اونچا اور صاحب اقتدار ظاہر کرنے کے لئے وہ بڑے سے بڑے مالی نقصان کو برداشت کرتے تھے۔ لیکن تاجروں اور سود خوروں سے نفرت کی جاتی تھی۔ ابن بسطوطہ اپنے سفرنامے میں ایک دلچسپ بات یہ لکھتا ہے کہ اس زمانے کے رواج کے مطابق یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی بھی شخص بادشاہ کے دیدار کو جاتا تو کچھ نہ کچھ ہدیہ ضرور پیش کیا کرتا تھا۔ اگر مولوی ہے تو قرآن شریف، یا کوئی اور دینی کتاب، فقیر ہے تو مصلی یا تسبیح یا مسواک امیر ہے تو گھوڑا، اونٹ، ہاتھی یا کوئی اسلحہ یا ہتھیار وغیرہ۔ چونکہ یہ بات سب لوگ جانتے تھے کہ بادشاہ ان تحفوں کے بدلے اس سے کئی گنا زیادہ مالیت کا انعام عطا کرتا تھا۔ اس لئے اس زمانے کے سود خوروں اور تاجروں نے پیشہ بنا لیا تھا کہ وہ ایسے شخص کو ہزاروں دینار قرض کے طور پر دے دیتے تھے تاکہ جواب کے طور پر بادشاہ کی طرف سے کئی گنا زیادہ انعام پھر خود ہی واپس لے لیں۔ کچھ دنوں بعد جب بادشاہ کو اس بات کا علم ہوا تو ایسے تمام تاجروں کو اس نے سخت سزائیں دیں۔

ہندوستان میں مہمان نوازی کے بارے میں ابن بطوطہ نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے

کہ شاہی حکم تھا کہ کسی بھی شخص کی مہمان نوازی میں کس طرح کی کوئی کمی نہ کی جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے مہمان کو دیوان خانے میں تشریف لانے کو کہا جاتا۔ میزبان پیچھے پیچھے چلتا۔ زیادہ آرام دہ اور اونچی مسند مہمان کو پیش کی جاتی، اور اس کی تواضع بہترین پھلوں، شربت اور کھانے کی چیزوں سے کی جاتی۔ اگر مہمان ساتھ میں کوئی تحفہ لایا ہوتا تو میزبان، مہمان کی روانگی کے وقت اس سے زیادہ قیمتی ہدیہ پیش کر دیتا تھا۔ اگر مہمان، میزبان کے گھر کی کسی چیز کی تعریف کر دیتا تو رواج کے مطابق فوراً میزبان کو وہ چیز مہمان کی خدمت میں پیش کرنی پڑتی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مہمان اپنے میزبان کی محل سرا کی خواتین کی خوبصورتی کی تعریف چاہتے ہوئے بھی نہیں کر پاتا تھا۔ خود ابن بطوطہ کا بیان ہے کہ کئی بار اس کا جی چاہا کہ اپنے میزبان کی کنیزوں کی تعریف کرے، مگر وہاں کے رواج کے پیش نظر اسے خاموش رہنا پڑا۔

ابن بطوطہ مزاج کے اعتبار سے عاشق مزاج اور رنگین آدمی تھا۔ وہ جہاں کہیں جاتا شادی کر لیتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس کی کتنی بیویاں ہیں اور کہاں کہاں ہیں، کچھ دنوں کے لئے وہ عورت اور دنیاوی مزے سے بیک دوش ہو کر تارک الدنیا بھی ہو گیا۔ مگر پھر سے وہ عورت اور دنیاوی عیش میں مبتلا ہو گیا۔

ہندوستان میں ڈاک کے اچھے انتظام کی تعریف کرتے ہوئے ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ ڈاک کے ذریعہ جلد از جلد ہر بات کی خبر بادشاہ کو دہلی بھیجی جاتی تھی۔ ویسے تو ملتان سے دہلی کی مسافت ۵۰ دن کی تھی مگر جو خبر بادشاہ کو ڈاک کے ذریعہ دہلی بھیجی جاتی تھی، وہ صرف پانچ دن میں پہونچ جاتی تھی۔ ڈاک کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ ڈاک دو طرح کی ہوتی تھی، ایک گھوڑے کی اور دوسرے پیدل چلنے والوں کی۔ گھوڑے کی ڈاک میں ہر چار کوس پر گھوڑا بدلا جاتا تھا۔ اس طرح کے گھوڑے بادشاہ کی طرف سے ہوتے تھے۔ پیدل ڈاک لے جانے والوں کا یہ انتظام تھا کہ ایک میل میں تین جگہ چوکیاں ہوتی تھیں جہاں ہرکاروں کے لئے برجیاں بنی ہوتی تھیں۔ ہر برجی پر ہرکارے مستعد بیٹھے رہتے تھے۔ ہرکارے کے پاس دو گز لمبی ایک چھڑ ہوا کرتی تھی۔ جس میں گھنگھرو بندھے ہوتے تھے۔ جب ہرکارہ برق رفتاری سے پیدل دوڑتا تھا تو برج پر منتظر دوسرا آدمی دور سے

آنے والی کی آواز سن لیتا تھا اور ڈاک لے کر آگے دوڑنے کے لئے تیار ہو جاتا تھا۔ پیادہ چلنے والوں کی ڈاک کے ذریعہ کبھی کبھی خراسان کے تازہ میوے بھی بادشاہ تک پہونچائے جاتے تھے۔

ہندوستانی سواریوں کے بارے میں اس غیر ملکی سیاح کا بیان ہے کہ عام طور پر غریب لوگ پیدل اور امیر آدمی گھوڑوں یا رتھ پر سفر کرتے تھے۔ لیکن ایک مخصوص سواری "ڈولی" بھی ہے، جس میں زیادہ تر عورتیں سفر کرتی تھیں۔ یہ چارپائی کے مشابہ ہوتی تھی۔ جس کو ریشم یا تسل سے تیار کیا جاتا تھا اور ایک بانس میں لٹکا کر چار آدمی کاندھے پر رکھ کر چلتے تھے۔ ہندوستانی عوام عموماً دوسری، ساتویں، بارہویں، سترہویں، بیس یا ستائیس تاریخ کو سفر کا آغاز کیا کرتے تھے۔ اس نے سواریوں کی بابت اونٹ، ہاتھی اور بیل گاڑی کا بھی ذکر کیا ہے جو عام طور پر لمبی مسافت طے کرنے کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ ابن بطوطہ نے مغربی ہندوستان کے جانوروں کے بارے میں تحریر کیا ہے۔ کہ گائے اور بھینس کا دودھ آدمیوں میں بہت پسند کیا جاتا تھا اور عام طور پر سردی کے زمانے میں گائے اتنا دودھ دیتی تھی کہ ۲۵ آدمیوں کا کنبہ باسانی اور پیٹ بھر کر ایک گائے کا دودھ پیا کرتے تھے۔

مخبری اور جاسوسی کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ ملک کے کسی کونے میں بھی کوئی عجوبہ یا بادشاہ کی مرضی کے خلاف بات ہوتی تھی تو فوراً ہی اس کی اطلاع بادشاہ کو ہو جایا کرتی تھی۔ اس کام کے لئے خصوصی ایرانی اور ترکی جاسوس مرد اور عورتیں مقرر کی گئی تھیں۔

ہندوستان میں توہم پرستی اور مافوق الفطرت عناصر پر اعتقاد لے آنا عام ہندوستانیوں کے مزاج میں داخل تھا۔

ایک واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ابن بطوطہ نے بیان کیا ہے کہ گوالیار کے پاس ایک جگہ پر اس نے دیکھا کہ وہاں بہت درندے رہا کرتے تھے اور رات کو شہر کا پھاٹک بند ہو جانے کے باوجود ایک درندہ گھس آتا تھا۔ اور شہر کے لوگوں کو پریشان کیا کرتا تھا۔ لوگ اس سے نجات پانے کے لئے کالے پتھروں کی بنی ہوئی مورتی کی پوجا کرتے تھے اور ان کا اعتقاد تھا کہ وہ کوئی درندہ نہیں بلکہ قدرت کی طرف سے ان پر عتاب ہے۔ جس کو مارنا ان آدمیوں کے بس کا نہیں

ان کا یہ بھی خیال تھا کہ نظر لگنے سے انسان کی موت ہو جاتی ہے۔ اگر نظر لگنے سے کوئی انسان مرجاتا ہے تو اس کا دل نہیں ہوتا، کیونکہ نظر لگانے والا اس کا دل کھا جاتا ہے۔ یہ کام اکثر عورتیں کرتی ہیں۔ جن کو "ڈائن" کہا جاتا ہے۔ ایک بار ابن بطوطہ کے پاس کچھ لوگ ایک عورت کو لائے اور کہا کہ یہ "ڈائن" ہے۔ اس نے اپنے پڑوس کے ایک لڑکے کا دل جادو سے کھا لیا ہے، اور وہ مرگیا۔ ڈائن کی آزمائش کا طریقہ یہ تھا کہ چار پانی سے بھرے ہوئے مٹکوں میں رسی باندھ کر اس سے ڈائن کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیئے جاتے اور اس کو کسی گہرے دریا میں ڈال دیا جاتا۔ اگر وہ نہیں ڈوبی تو سمجھ لیتے کہ وہ ڈائن ہے۔ اگر ڈوب جاتی تو یہ سمجھا جاتا کہ وہ کوئی عام عورت تھی۔ عام طور پر ڈائن سے تنگ آ کر اس کو جلا دیا جاتا اور اس کی راکھ سے دھونی لگا کر لوگ خود کو محفوظ تصور کرنے لگتے۔

وہم اور اندھے عقیدوں کے بارے میں ایک اور واقعہ بتایا ہے کہ "ہندوستان" میں جوگی بھی عجیب مخلوق ہے۔ وہ اپنے بالوں میں راکھ مل لیتے تھے اور عجیب عجیب کرشموں سے عوام کو مغلوب رکھتے تھے۔ ان کے بدن پر کپڑا نہیں ہوتا تھا۔ جانوروں کی کھال یا درختوں کے پتے پہنتے تھے۔ بعض جوگی تو زمین میں اپنی قبر بنا کر ہفتوں اس کے اندر بیٹھے رہتے تھے۔ ایک بار کا واقعہ ابن بطوطہ نے تحریر کیا ہے کہ بادشاہ کے دربار میں ایک جوگی آیا۔۔۔۔۔ دربار کے ایک امیر نے کہا کہ وہ ایک ایسا کرشمہ دکھائے جس سے ابن بطوطہ ہندوستان کے جوگیوں کے چمتکار کو مان لے۔ وہ جوگی سامنے فرش پر پلتھی مار کر بیٹھ گیا۔ پھر دھیرے دھیرے زمین سے اوپر اٹھنا شروع ہو گیا۔ یہ منظر دیکھ کر ابن بطوطہ بے ہوش ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب ہوش آیا تو دیکھا کہ جوگی اسی طرح زمین سے اوپر ہوا میں معلق تھا۔

دہلی کے بارے میں ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ یہ ایک عظیم الشان شہر ہے۔ اس کی عمارات میں فن تعمیر کی بہترین عکاسی ہے۔ اس کی فصیل اس قدر مضبوط ہے کہ دنیا بھر میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ تمام مشرق میں کوئی بھی شہر ایسا نہیں جو دہلی کے برابر ہو۔ یہ بڑا وسیع اور فراخ شہر ہے اور آباد بھی۔ اصل میں یہ چار شہر ہیں۔ جو ایک دوسرے سے متصل ہیں۔ اول پرانا شہر، دوسرا سیری، تیسرا تغلق آباد اور چوتھا جہاں پناہ۔۔۔۔۔ دراصل

محمد بن تغلق کی جامع مسجد کی بھی ابن بطوطہ نے بہت تعریف کی ہے۔ یہ وہی مسجد ہے، جو آج مہرولی میں قطب مینار کے پاس "مسجد قوۃ الاسلام" کے نام سے جانی جاتی ہے۔ اس نے یہاں نصب لوہے کی لاٹ اور مینار کا بھی ذکر کیا ہے۔ صوفیائے کرام میں حضرت خواجہ بختیار کاکی" کے بارے میں بھی اس کے سفرنامے میں ذکر ہے۔

ابن بطوطہ انتہائی عالم ہونے کے باوجود سنکی اور زود فراموش تھا۔ اس کی مثال اس بیان سے ہے کہ قطب مینار کی آخری منزل کے بارے میں اس نے لکھا ہے کہ وہ اتنی چوڑی ہے کہ اس پر ہاتھی پر سوار ہو کر چلا جا سکتا ہے۔

جو غیر ملکی سیاح ہندوستان آئے ان کی طرح ابن بطوطہ نے بھی محسوس کیا کہ یہاں مذہبی رواداری اور مفاہمت بہت ہے۔ اس کا نمایاں ثبوت یہ ہے کہ زمانۂ وسطیٰ میں ہندوستان کے اندر فرقہ وارانہ فسادات کبھی نہیں ہوئے۔ ٭٭٭

نوادرات
اور
فنون لطیفہ

اسلحہ اور ہتھیار کی کہانی

اسلحہ یا ہتھیار کی کہانی بہت لمبی ہے۔ اس دنیا میں جب انسان آیا تو وہ نہتا تھا۔ اس کی اپنی حفاظت کے لئے اس کے پاس صرف دو ہاتھ تھے۔ لیکن محض بازو انسان کی حفاظت کے لئے کافی نہیں ہیں۔ اس لئے ایسی اشیاء کی ضرورت پیش آئی جن کا استعمال اچھی طرح اور بہتر طریقہ سے اپنی دیکھ بھال اور حفاظت کیلئے کیا جا سکے۔ جانوروں کو مار کر اور ان کا شکار کر کے ان کے گوشت، کھال اور ہڈی اور دوسری چیزوں کو اپنے استعمال میں لا سکے۔ اور اس طرح سے پہلے کچھ ایسے اسلحہ یا ہتھیار بنائے جن کو استعمال کر کے وہ اس سرزمین پر اپنے قدم جما سکے۔ چنانچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسان نے زمین پر آتے ہی ہتھیاروں کی بنیاد ڈالی۔ ابتدائی اسلحہ پتھر کے تھے۔ جن کو گھس کر یا معمولی تراش خراش کے بعد ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔ جن سے جنگلی جانوروں کا شکار بھی کیا جا سکتا تھا۔ اُن کی کھال اور چمڑے کو بھی چھیلا جا سکتا ہے۔ اور وقتِ ضرورت انہیں پتھروں کو اسلحہ کی صورت میں آپسی جنگ اور لڑائی جھگڑوں میں بھی استعمال کیا جا سکتا تھا ــــــ پھر تانبہ، کانسہ، پیتل، سونا، چاندی، لوہا اور بعض دوسری دھاتوں کی ایجاد کے ساتھ ساتھ اسلحہ اور ہتھیار کے بنانے میں بھی نمایاں فرق اور ترقی ہوتی گئی ــــــ اور تبھی سے بھالے، برچھے، بلم، تیر کمان، تلوار اور خنجر وغیرہ جیسے اسلحہ دنیا کے تقریباً ہر حصہ میں بنائے جانے لگے۔ اور دنیا کی بڑی بڑی جنگوں اور لڑائیوں کا فیصلہ انہیں ہتھیاروں کے ذریعہ

کیا جانے لگا۔

آج بھی دنیا کے مختلف میوزیم اور محلات میں اسلحہ کے بعض نادر نمونے موجود ہیں جن کی تاریخی اہمیت چھ ہزار سال پرانی ہے۔ ہندوستان میں تقریباً ۵ ہزار سال پرانے تہذیبی شہر ہڑپا، اور موہن جوداڑو سے ملے ہوئے کچھ ہتھیار اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ اس دور میں ہتھیاروں کی شکل کیسی ہوتی تھی؛ اور ان کو کس طرح استعمال کیا جاتا تھا؛ ہڑپا اور موہن جوداڑو کا سُراغ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں کچھ ماہرین آثارِ قدیمہ نے لگایا۔ وہاں سے ملے ہوئے کچھ چاقو اور تلواروں کی شکل کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی شکل کھجور کے پتے جیسی ہوتی تھی جن کو "آسی" کہا جاتا تھا۔ جو اب عام ہندوستانی زبان میں تلوار کے نام سے موسوم کی جاتی تھی۔ جو ۱۲ اِنچ سے ۲۵ اِنچ تک لمبی اور تقریباً ۴ سے ۶ اِنچ تک چوڑی ہوتی تھی، اور بالکل سیدھی شکل کی تھی۔۔۔ اس زمانے کے کچھ تیر، کمان، نیزے، بلّم اور بھالے بھی ملے ہیں۔ جو عام طور پر لکڑی یا بانس کے بنے ہوتے تھے۔ جس کی انی ہڈی، نوکیلے چمکدار پتھر یا لوہے کا حصّہ تو دستیاب ہے مگر لکڑی، بانس کا حصّہ ہزاروں سال پرانا ہونے کی وجہ سے ضائع ہو گیا ہے۔ آج سے پانچ ہزار سال پرانی تلواروں کا اگر آج کے موجودہ دور کی تلوار سے موازنہ کیا جائے تو حیرت انگیز تبدیلی کا پتہ چلتا ہے اور صرف تلوار اپنی ذرا سی شکل و شباہت کی تبدیلی کے ساتھ الگ الگ ناموں سے جانی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جب ۱۲ ویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے ہندوستان میں قدم رکھا تو ان کے ساتھ عرب، ترکی و ایران کی مختلف تہذیبوں اور ملبوسات وغیرہ کے ساتھ نئے نئے قسم کے ہتھیار بھی سامنے آئے۔ اب تلوار بجائے سیدھی بنانے کے ذرا سی مڑی ہوئی بننے لگی۔ جبکہ اسی زمانے میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں سیدھی تلواریں بھی بنائی جاتی تھیں، مگر ہر تلوار اپنی انفرادی خصوصیات کے ساتھ منفرد ناموں سے موسوم کی جانے لگی۔ مثال کے طور پر تیغ، پٹا، شمشیر، کھانڈا، صابر، سمیر، داؤ وغیرہ وغیرہ۔ جبکہ عام آدمی ان سب کو صرف تلوار یا انگریزی میں (SWORD) سمجھتا ہے۔ اسی طرح خنجر بھی اپنی ذرا سی ردّو بدل کے ساتھ الگ الگ ناموں سے جانا جاتا ہے مثال کے طور پر غچہ، کٹار، بھجالی، بچھوا، چاپڑ، کھوکری، نارا، بدن، جمدھر، جمبیا، وغیرہ۔۔ جبکہ

عام فہم زبان میں ان سب کو صرف خنجر کے نام ہی سے جانا جاتا ہے۔

اگر صرف ہندوستان میں ہتھیار کی تاریخ پر غور کیا جائے تو بہت سی مذہبی کتابوں اور ہندو دیو مالاؤں میں دھنش، آسی (تلوار) کا ذکر ملتا ہے۔ خود مہابھارت اور رامائن میں تیر کمان اور تلوار و بھالے کا ذکر بار ہا آتا ہے۔ آج سے ہزاروں سال پہلے جبکہ ایٹمی ہتھیار اور گولہ بارود وجود میں نہ آئے تھے، تب تیر کمان ہی جنگ میں اہم ہتھیار ہوا کرتے تھے۔ پھر اس کے بعد چوتھی صدی قبل مسیح یعنی کم و بیش ڈھائی ہزار سال پہلے سکندر اور پورس کی جنگ سے متعلق تلوار، برچھے اور بھالوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ پھر اس کے بعد دسویں، گیارہویں؛ یہاں تک کہ بارہویں صدی عیسوی تک تو تلوار، تیغ اور خنجر کے بہت سارے حوالے کثیر تعداد میں پرانی کتابوں میں ملتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی اب جنگ کے لئے اہم ہتھیار تلوار تھی۔ اور ساتھ ہی تیر و کمان کا استعمال بھی ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب چونکہ جنگ کے اصول اور طریقہ بدلنے لگے تھے۔ سورما یا بہادر آمنے سامنے جنگ کر کے فیصلہ کرنا زیادہ بہادری سمجھتے تھے۔ اس لئے تلوار بازی کا فن ابھر کر سامنے آیا۔ اور بہادر جانبازوں کو رو برو شمشیر زنی میں زیادہ زور آزمائی کا موقع ملنے لگا۔ عربوں میں "قریش" اور بھارت میں 'راجپوت' کو اپنی تلوار پر پورا بھروسہ اور گھمنڈ ہوا کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایسے بہادروں کے ساتھ ہر لمحہ، ہر ساعت ان کی کمر میں تلوار لٹکا کرتی تھی۔ کچھ قبیلوں میں رواج بھی تھا کہ کسی سورما کی ناگہانی موت کے بعد تلوار بھی اسی کے ساتھ دفن کر دی جاتی تھی۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کسی نہ کسی منزل پر ایک انسان یا بہادر کا ساتھ ماں باپ، بھائی بہن یا بیوی بھی چھوڑ دیتی ہے۔ صرف تلوار ہی ایک ایسا ساتھی ہوا کرتی تھی جو مرتے دم تک اس کے ساتھ رہتی تھی تو کیوں نہ مرنے کے بعد بھی تلوار کو اپنا ساتھی بنائے رکھا جائے؟! اس دور میں ایک سپاہی تلوار کو دنیا کی ہر شئے سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔

علاؤ الدین خلجی جو ۱۴ ویں صدی عیسوی کے وسط میں ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ اس کا یہ اعلان تھا کہ مرنے کے بعد اس کی تلوار کو بھی اُسی کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔ اور اس کی اس خواہش کا احترام بھی کیا گیا۔

ہندوستان کے مختلف میوزیم جیسے انڈین میوزیم کلکتہ، پرنس آف ویلس میوزیم بمبئی، سٹی پیلس میوزیم جے پور، سالار جنگ میوزیم حیدر آباد اور بعض دوسرے عجائب گھروں میں بھی پتھر کے بنے ہوئے ہتھیار عوام کی نمائش کے لئے موجود ہیں۔ جو تقریباً ۵ ہزار سال پرانے ہیں۔ لیکن دھات کے علاوہ بھی، تلوار، خنجر، زرہ، بکتر، دستانہ، تیر کمان اور اسی طرح کے دوسرے ہتھیاروں کی نمائش بمبئی، جے پور، حیدر آباد اور دہلی کے نیشنل میوزیم میں بڑے سلیقہ سے کی گئی ہے۔ نیشنل میوزیم دہلی کی "اسلحہ گیلری" میں حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے بھی ۲۰۰۰ سال پرانی ایک تلوار دیکھی جا سکتی ہے۔ جو آج سے پچاس سال قبل یوپی کے ایک گاؤں "پسراوا" میں کھدائی کے دوران ملی تھی۔ اس کے علاوہ سلطنت دور (۱۴ویں صدی) کی ایک لوہے کی بنی ہوئی کلاہ (ٹوپی) جس پر آیات قرآنی کندہ ہیں۔ اور سونے کا ٹھوس نقش کیا ہوا ہے۔ اورنگ زیب بادشاہ کا زرہ بکتر اور خنجر، نادر شاہ کی کلہاڑی اور تلوار، نانا صاحب پیشوا کی تلوار، نیتاجی سبھاش چندر بوس کی ذاتی تلوار، راجہ ہمیر سنگھ کا کھانڈہ اور بہادر شاہ ظفر کی بڑی خوبصورت کمان بھی نیشنل میوزیم میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ٹیپو سلطان کی وہ تاریخی تلوار بھی نیشنل میوزیم میں موجود ہے۔ جس کے ذریعے بادشاہ نے انگریزوں سے ہندوستان کی آزادی کی حفاظت کی تھی۔ بمبئی کے پرنس آف ویلس میوزیم میں بہت سے دوسرے اسلحہ کے علاوہ علاؤالدین خلجی کی "خورد کلاہ" بھی موجود ہے۔ سالار جنگ میوزیم میں عوام کے لئے نور جہاں بلکہ جہانگیر کا وہ خنجر "گیلری" میں لگا ہوا ہے، جس کا ذکر تزک جہانگیری میں ملتا ہے۔ یہ وہ خنجر ہے جو نور جہاں کے پہلے شوہر شیر افگن نے اپنی سہاگ رات کے موقع پر بطور نذرانہ اپنی بیوی کو پیش کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جہانگیر بادشاہ کے نہ چاہنے کے باوجود ملکۂ نور جہاں نے اس خنجر کو اپنے سے جدا نہ ہونے دیا۔ اس کا دستہ سفید خوبصورت پتھر کا ہے۔ جس پر قیمتی نایاب ہیرے، موتی اور انمول رتن جڑے ہوئے ہیں۔

ہندوستان کے اب تقریباً ہر اہم شہر کے اندر ایک میوزیم ضرور موجود ہے۔ جس میں دوسری

تاریخی اشیاء کے علاوہ اسلحہ کا بھی خاص شعبہ ہے، جس میں پرانے اور اہم ہتھیار دیکھے جاسکتے ہیں۔

مغربی جرمنی کے شہر برلن کے اسلامک میوزیم میں ابھی کچھ عرصہ پہلے پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تلوار کو نمائش کے لئے رکھا گیا ہے۔ جس پر کوفی رسم الخط میں "محمدؐ" لکھا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ یمن میں کسی جگہ سے اس تلوار کو برآمد کیا گیا ہے۔ ابھی اس کی اصلیت پر تحقیق ہو رہی ہے، اور یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

موٹے طور پر اسلحہ یا ہتھیار دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک جن سے حملہ کیا جاتا ہے۔ جیسے تیر، تلوار، خنجر، بندوق، توپ، بلم برچھے وغیرہ۔ دوسرے جن سے حملہ کو روکا جا سکے۔ مثال کے طور پر زرہ بکتر، کلاہ، دستانہ، چار آئینہ، ڈھال، سلسلہ وغیرہ۔

اسلحہ یا ہتھیار کا مقصد صرف جنگ کرنا یا خون بہانا ہی نہیں ہے۔ بسا اوقات ان کے ذریعہ دوستی، امن اور محبت کا پیغام بھی دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی اور بعد میں بھی تاریخی عمارتوں، سکوں، مصوری کے نمونوں، قلمی نسخوں یہاں تک کہ بعض اسلحہ پر ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں، جن سے آپسی بھائی چارہ اور محبت کا پیغام ملتا ہے، اور بجائے جنگ کرنے کے اسلحہ کو ایک خوبصورتی کا نمونہ بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر بعض محلات کی دیواروں اور دروازوں پر ڈھال، بندوق یا دوسرے اسلحہ کی تصویر اس لئے بنائی گئی کہ اس کو خوبصورتی کا ایک نمونہ سمجھا جائے، نہ کہ جنگ کرنے کا ہتھیار۔ اسی طرح سکوں یا تصویروں پر بھی بہت سے اسلحہ کو صرف اس لئے بنایا گیا کہ ان کو دوسری چیزوں کی طرح نقش و نگاری کا ایک آلہ سمجھیں۔ شمس الدین التمش اور علاؤالدین خلجی بادشاہوں نے اپنے دور کے بعض ماتحت ہندو راجاؤں اور امیرزادوں کو کچھ تلواریں بطور تحفہ پیش کیں۔ جن پر دیوناگری رسم الخط میں اُن کے نام لکھا کر بھیجے۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر کے بارے میں اس دور کے مؤرخ ابوالفضل نے اپنی کتاب "آئینِ اکبری" میں لکھا کہ:۔ اکبر آباد (آگرہ)، جے پور اور بیکانیر میں بادشاہ کے حکم سے ہزاروں کی تعداد میں ایسے خنجر اور تلواریں بنائی جانے لگیں جن کی خوبصورتی کی طرف کافی دھیان دیا جاتا تھا۔ ان میں قیمتی پتھر اور نگینے جڑے

ہوئے ہوتے تھے اور ٹھوس سونے کا روغن چڑھا ہوا ہوتا تھا۔ تاکہ ملک اور بیرون بطورِ تحفہ اُن کو بھیجا جاسکے۔ آج بھی جو پُرانی اسلحہ پر نقش و نگاری اور انمول پتھروں کا جڑاؤ ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ایسے ہتھیار بجائے لڑائی کرنے کے انعامات کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ دہلی کے لال قلعہ میوزیم میں عالمگیر اورنگ زیب کی ایک تلوار موجود ہے جس پر فارسی میں "عالم ستان" کندہ ہے۔ یہ وہی تلوار ہے جو شاہجہاں بادشاہ نے اپنے بیٹے محی الدین محمد اورنگ زیب کو اس کی ۱۹ ویں سالگرہ کے موقع پر دی تھی۔ اورنگ زیب کا لقب شروع میں "عالم ستان" تھا۔

عہدِ مغلیہ اور پھر بعد میں نوابوں، راجاؤں اور امیرزادوں میں یہ رواج عام تھا کہ وہ خط و کتابت کے لئے کبوتر یا تیر و کمان کا سہارا لیتے تھے۔ بجائے نامہ بر کے ایک عاشق تیر و کمان کے ذریعہ اپنے خطوں کو معشوق کے گھر پہنچایا کرتا تھا۔ اور جواب بھی اسی طرح آیا کرتا تھا۔ کبھی کبھار زیادہ دوری نہ ہونے کی صورت میں کسی قیمتی اور مزین خنجر میں اپنا پیغام رکھ کر خنجر کو بھی معشوق کے گھر پھینک دیا جاتا تھا۔ جے پور، بیکانیر، گوالیار، لکھنو، حیدر آباد اور رامپور کے نوابوں اور راجاؤں کے بارے میں ایسے بہت سارے قصے مشہور ہیں۔ اسی طرح کبوتر بھی پیغامبر بنا کرتا تھا۔ بسا اوقات اسلحہ یا ہتھیار کو کھیل کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ ایک زمانے میں تیر اندازی، شمشیر زنی، باقاعدہ کھیل کی شکل میں رائج تھی۔ بڑے بڑے گھروں میں اس کو فخر کے طور پر کھیلا جاتا تھا۔ مذہبی رسومات اور بعض تیوہاروں میں بھی ہتھیار کا استعمال ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر محرم کے مہینے میں الم کے دوران "پٹا بانہ" یا "تلوار بازی" کو ایک فن کی صورت میں روایات کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ بلم میں جھنڈا لگا کر الم یا جلوس نکالا جاتا تھا۔ ہندو تیوہاروں میں "سروہی" تلوار کو صرف بلی یا قربانی کے کام ہی میں لایا جاتا ہے۔ غرض یہ کہ اسلحہ یا ہتھیار محض جنگ کرنے یا نقصان پہنچانے کے لئے ہی نہیں ہوتے ہیں، بلکہ تحفہ تحائف، گھروں کی سجاوٹ، اور امن و دوستی کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں اور معاملوں میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ اب دنیا گولہ بارود کے دور سے گزرتی ہوئی ایٹم اور نیوکلیر کے

دور میں پہونچ چکی ہے۔ آج سے تقریباً پانچسو سال قبل پہلی بار بندوق اور توپ کی ایجاد سے اس وقت لوگ چونک گئے تھے۔ مگر بندوق، پستول اور ریوالور سے بھی زیادہ تیز، زیادہ زود اثر، اور زیادہ خطرناک ہتھیار سامنے آچکے ہیں۔ اب جنگ زمین سے اُوپر اُٹھ کر خلاؤں اور سمندروں میں لڑی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود ان تاریخی اسلحہ کی اپنی حیثیت ہے اور گذشتہ دَور کی زندگی کی آئینہ دار ہے۔ ☆☆☆☆

ہندوستانی سکّوں کی تاریخ

(۷ ویں صدی ق م سے ۱ صدی عیسوی تک)

ہندوستان میں سکّوں کے رائج ہونے کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ انہیں سکوں کی بدولت ہزاروں سال سے انسان اپنی زندگی کو نئے، انوکھے اور انفرادی انداز سے گزارنے پر قادر رہا ہے۔ اگر سکّے نہ ہوتے یا جسے عام زبان میں پیسہ کہا جاتا ہے، تو پورے ملک اور سماجی زندگی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ کیوں کہ دولت یا سکّے ہی کے بدولت مختلف انسانوں اور معاشرے میں کسی خاص طبقہ کی الگ شناخت کی جاتی ہے۔ امیر اور غریب کا فرق کیا جاتا ہے۔ سوسائٹی میں انہیں سکوں ہی کی بدولت تو طبقاتی فرق کا معیار مقرر کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سکے ہیں کیا؟ ان کی تاریخ کیا ہے، اور جب سکّے اس دنیا میں رائج نہ ہوئے تھے تو سماج میں کس طرح لوگ زندگی بسر کرتے تھے؟

پورے عالم کی تاریخ سے قطع نظر اگر صرف ہندوستان کے ماضی پر غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے بھی تقریباً تین ہزار سال پہلے ہمارے ملک میں لوگ نہ صرف رہتے تھے بلکہ وہ ایک تہذیبی زندگی کے باشندے تھے۔ جس کی کھلی ہوئی مثال وادیٔ سندھ کی تہذیب سے متعلق دو علاقے یعنی موہن جو داڑو اور ہڑپا کا پتہ لگایا جا چکا ہے۔ زندگی کے مختلف سیاسی، سماجی، اور معاشرتی شعبوں میں ان کی کارکردگی بھی نمایاں رہی ہے۔ چیزوں کی خرید و فروخت اور آپس میں اشیاء کی لین دین کی ضرورتیں بھی پوری ہوا کرتی تھیں۔ لیکن اس وقت تک سکّوں کا پورے طور پر وجود نہ

ہوا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ کسی خاص طرح کی پہچان والے مٹی یا دھات کے ٹکڑوں کو وہ سکوں کی جگہ پر استعمال کرتے ہوں یا کوڑی، کسی پھل کے بیج یا رتی وغیرہ کا بھی استعمال ہوتا ہو۔ اس کے علاوہ بارٹر (Barter system) طریقہ کی مثالیں بھی خوب ملتی ہیں۔ یعنی سکوں کے رائج ہونے سے پہلے لوگ آپس میں اشیاء کے ردوبدل سے کام چلایا کرتے تھے۔ جسے انگریزی میں BARTER طریقہ کہا جاتا ہے۔

لیکن کچھ ہی مدت بعد، جب انسان نے ترقی کی منزلوں پر قدم رکھا اور لوہا، تانبہ، چاندی سونا یا بعض دوسری دھاتوں کی کھوج لگالی تو سکے کے رائج کرنے کی طرف بھی توجہ دی گئی اور پرانا طریقہ ان لوگوں کے لئے ناکافی ہونے لگا۔ اس صورت میں سکوں سے پہلے "پرنوٹ" یا ہنڈی طریقہ رائج ہوا۔ اس طریقہ کے عمل میں آنے کی وجہ سے ساہوکاروں، سوداگروں اور تاجروں کو بڑے پیمانہ پر اشیاء کے خرید و فروخت کرنے میں نسبتاً آسان ہونے لگی اور پرنوٹ کے ذریعہ کام چلتا رہا۔ مگر دنیا بہت بڑی تھی اور کرۂ ارض کے تقریباً ہر حصہ پر انسان کے قدم پڑنے لگے تھے۔ ہندوستان سے باہر دوسرے ممالک کی اپنی منفرد تہذیب تھی۔ اس کا نقطۂ نظر اور اندازِ فکر بھی جدا جدا تھا۔ ایسی صورت میں کسی ایک ایسی شئے کی ضرورت محسوس ہوئی جو تمام دنیا میں یکساں طور پر سمجھی، پرکھی اور جانچی جاسکتی ہو۔ لہذا "سکہ" ہی ایک حل بن کر ان کے سامنے آیا۔۔۔۔۔ اور اس طرح ساتویں قبل مسیح میں جب ہندوستان کے ساتھ بیرونی ممالک سے تجارت شروع ہوئی تو سب سے پہلے پنچ مارکڈ (Punch Marked) سکے بنائے گئے۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں سب سے ابتدائی سکے پنچ مارکڈ سکے ہیں۔

ان سکوں کو بنانے کا طریقہ یہ تھا کہ چاندی اور تانبے جیسی دھاتوں کو پہلے اچھی طرح کسی وزن دار اور مضبوط چیز سے پیٹ کر چوڑا کیا جاتا تھا۔ پھر انکو ایک جیسی صورت میں کاٹ لیا جاتا تھا۔ جب دھات کے ٹکڑے برابر وزن اور یکساں طور پر کاٹ لئے جاتے تھے تو کسی گرم لوہے سے ان کی ایک جانب دو یا تین گول دائرے بنا کر اس میں ایک چھوٹا سا نشان بنادیتے تھے اور سکّے کا دوسرا حصّہ بغیر کسی نشان کے چھوڑ دیا جاتا تھا۔ چونکہ سکّہ پر جو نشان لگایا جاتا تھا

اس کو کسی چیز سے پنچ کرتے تھے۔ اس لئے سکوں کو پنچ مارکڈ کہا جانے لگا۔ لیکن ساتھ ہی کوڑی یا رتی کا رواج بھی جاری رہا۔ مگر سکوں کے رائج ہو جانے کی وجہ سے ترقی یافتہ حصوں خصوصاً غیر ممالک سے تجارت اور خرید و فروخت آسانی سے ہونے لگی۔ لیکن ابھی تک سکوں کا استعمال صرف تاجروں تک ہی محدود تھا۔ شاہی خزانے میں ایسے سکوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔

سکوں پر تحقیق کرنے والے ایک ماہر، جیمس کینڈی نے لکھا ہے کہ " ہندوستان میں پنچ مارکڈ سکے بنانے کا طریقہ اس زمانے کے "بلونیہ" اور "سیریا" سے اخذ کیا گیا تھا۔ کیونکہ ۸ ویں صدی قبل مسیح میں مذکورہ ملکوں میں اس طرح کے پنچ مارکڈ سکے رائج تھے۔ یہ بات کہاں تک صحیح ہے، اس کی تحقیق ابھی تک جاری ہے۔ مگر یہ ضرور سچ ہے کہ ہندوستان کے علاوہ بیلونیہ اور سیریا میں بھی ایک ہی طریقہ کے سکے رائج تھے۔

چھٹی صدی قبل مسیح، یعنی گوتم بدھ کے زمانے میں اگرچہ کسی نئے سکے کا وجود تو نہیں ہوا مگر انھیں پنچ مارکڈ سکوں میں کئی طرح سے ردوبدل کیا گیا۔ یعنی عام طور پر سکوں میں انسان، جانور، پیڑ، سورج، چاند، یا بعض دوسری چیزوں کی بھی شبیہ بنائی جانے لگی۔ جب کہ گوتم بدھ کے عہد سے قبل سکوں پر گول دائرہ یا دو پٹی نشان کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا۔

ایسے سکوں میں چاندی کے ایک سکہ کا وزن تقریباً ۳ ½ گرام ہوتا تھا۔ جو عام طور پہ ۳۲ رتی کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں شمالی ہندوستان میں سکوں کی قیمت رتی کے حساب سے ہی لگائی جاتی تھی۔

تیسری قبل مسیح میں، چندر گپت موریہ کی دورِ حکومت تھی۔ اس زمانے تک بھارت کئی اعتبار سے پوری دنیا کے کینوس پر ابھر کر سامنے آچکا تھا۔ گوتم بدھ کا نظریہ فکر، مذہب کی انفرادی پہچان لوگوں کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا اثر دنیا کے دوسرے حصوں پہ بھی پڑنے لگا تھا۔ آرٹ اور کلچر کی وجہ سے ہندوستان کو سمجھا اور جانا جانے لگا تھا۔۔۔۔ موریہ عہدِ حکومت میں ملک باقاعدگی کے ساتھ سلطنت کے امور اور راجہ مہاراجہ کی بین الاقوامی پالیسیوں کی وجہ سے تمام دنیا کے تہذیبی معاملوں میں سامنے آچکا تھا۔۔۔۔ خود راجہ اپنی حکومت کے فروغ اور دوسرے مسائل کی طرف توجہ کرتا تھا۔ اس لئے سکوں کی

نشوونمائی میں بھی نمایاں ترقی ہوئی۔ اس طرح عہد موریہ میں پہلی بار(cast system) یعنی دھاتوں کو بھٹی میں پگھلا کر سکے بنانے کا کام شروع ہوا، اور دھات کو بھٹی میں پگھلا کر ڈائی کے ذریعہ سکوں کو بنانے کا رواج ہوا۔ ڈائی کے ذریعہ کسی بھی دھات پر کوئی شبیہ بنانا زیادہ آسان ہو گیا اور تمام سکے حسب منشا ایک سانچہ میں ڈھالے جانے لگے۔ اس دور کے چاندی اور تانبے کے سکوں پر کچھ شبیہوں کے علاوہ بعض تحریریں بھی ملتی ہیں۔۔۔ مثال کے طور پر سکے کی ایک جانب کسی پیڑ، ہاتھی، پرندہ، سورج یا چاند کی شکل بنی ہوئی ملتی ہے جبکہ ساتھ ہی سکہ کی سیدھی طرف خروشٹی (Kharoshti) رسم الخط میں کوئی تحریر اور دیوتا کا نام بھی کندہ نظر آتا ہے۔ اس طرح پنچ مارکڈ سکوں کے ساتھ ساتھ کاسٹ کے سکے بھی بھارت میں رائج ہوئے۔

پھر دوسری صدی قبل مسیح کی تیسری دہائی میں جب سکندر نے ۳۲۶ء (ق۔م) میں ہندوستان پر حملہ کیا تو یونان اور روم کے بھی کچھ تہذیبی اور ثقافتی اثرات ہندوستان میں نمایاں ہوئے اور یونان میں سکے بنائے جانے کے عمدہ اور اچھے طریقوں کو اس ملک میں بھی اپنایا گیا۔ جس کا اچھا اثر یہ ہوا کہ بعض بالکل نئے طرح کے سکے بھارت میں بھی بنائے جانے لگے۔ جن پر نہ صرف ہندوستانی اثرات ظاہر ہوئے بلکہ یونانی دیوتاؤں اور بادشاہوں کی شبیہیں بھی ابھر کر سامنے آئیں۔۔۔ چاندی اور تانبہ کے علاوہ، کانسہ کے سکوں پر یونانی دیوتاؤں اور وہاں رائج رسم الخط کو بھی پیش کیا جانے لگا۔ مگر جیسے جیسے سکندر کا غلبہ ہندوستان میں کم ہوتا گیا۔ دھیرے دھیرے سکوں سے بھی یونانی اثرات کم ہوتے گئے۔

دوسری صدی قبل مسیح میں جب سمراٹ اشوک کا عہد حکومت تھا۔ تو اس کے زمانے میں بھی کچھ انفرادی سکے بنائے گئے۔ اگرچہ سکے بنانے کا طریقہ کم و بیش وہی تھا مگر خروشٹی رسم الخط کے ساتھ ساتھ پراکرت تحریریں بھی سکوں میں ثبت کی جانے لگیں۔ اور ساتھ ہی برگد اور پیپل کے پیڑ کی تصویریں بھی بنائی جانے لگی۔ کیونکہ عہد اشوک میں گوتم بدھ اور ان کی تعلیمات کو فروغ دینے کا کام نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔ آثار قدیمہ کے ماہرین اور تاریخ کے عالموں کی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ اس طرح کے سکے جن پر پیپل اور برگد کے ساتھ

پراکرت تحریریں ملتی ہیں، وہ بنارس، پاٹلی پتر (پٹنہ) متھرا، سندرپن اور ٹکشلا کے علاقوں میں کاسٹ کے ذریعہ تیار کئے جاتے تھے۔

شنگ (SUNGA) دورِ حکومت میں، یعنی دوسری صدی (ق م) کے اواخر میں سکے بنانے کا ایک اور نیا طریقہ ایجاد ہوا، جس کو انگریزی میں (Die Struck System) کہتے ہیں۔ یعنی دھاتوں کو پگھلا کر الگ ڈائی کو تیار کرنے کے بعد دونوں کو ایک ساتھ چپاں کردیا جاتا۔ اس طرح سکہ کے دونوں حصے خوبصورتی اور صفائی کے ساتھ نمایاں نظر آتے اور سکے کی ظاہری شکل بھی بہتر نظر آتی۔ ان سکوں میں تانبہ کے سکوں کا وزن عام طور پر ½ ۱۰ گرام ہوتا تھا، جبکہ چاندی کے سکہ کا وزن ½ ۴ گرام تھا۔ مگر عہدِ شنگ میں خانہ جنگی اور آپسی صوبائی تعصبات کی وجہ سے ملک میں انتشار برپا ہوگیا۔ اور تمام حکمراں بغاوت کو دبانے اور ملک کے سیاسی حالات کو قابو میں کرنے کے سلسلے میں مصروف رہے۔ جس کی وجہ سے دوسرے ترقیاتی منصوبوں کے ساتھ ساتھ سکوں کی ترقی اور ترویج پر بھی برا اثر پڑا اور اس طرح کے سکے زیادہ نہ بنائے جاسکے۔ بلکہ خود مختار صوبائی حکومتیں اپنی آسانی کے حساب سے علاقائی سکہ یا Provincial coins کی طرف زیادہ توجہ دینے لگیں۔ مگر شنگ دورِ حکومت میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ پہلی بار ہندوستانی تاریخ میں سکہ پر راجہ کا نام بھی لکھا جانے لگا۔ Name of King found on coins. جبکہ اس سے پہلے سکہ پر کسی بھی راجہ کا نام کھدا ہوا نظر نہیں آتا ہے۔ اس دور کے سکے کی دوسری انفرادی خوبی یہ ہے کہ چاند، پرندے، گیند یا راجہ کا نام ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ آج بھی جو بعض سکے میوزیم اور لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ ان پر ابھرے ہوئے انداز میں شنگ راجہ، "اگنی مترا" کا نام نظر آتا ہے۔

کشان (KUSHANA) عہد کے راجاؤں نے پہلی صدی عیسوی کے زمانے میں سکوں کی تاریخ میں کچھ اور اضافہ کیا۔ اس دوران روم وہند تعلقات بہتر ہوجانے کی وجہ سے اس کے اثرات سکوں پر بھی ظاہر ہوئے۔ یعنی کشان عہد میں سکے کی ایک جانب کشان راجہ کا سر (Bust) بنایا گیا اور ساتھ ہی سکہ کی دوسری طرف روم

کے بادشاہ کی تخت پر بیٹھے ہوئے تصویر کو دکھایا گیا اور ھند یونان طریقۂ تعمیر سے سکوں کا وجود ہوا، جس کا اثر یہ ہوا کہ سکوں کی ساخت میں بھی نمایاں فرق آیا، اور ہند، یونان و روم کے ثقافتی تعلقات میں بھی بہتری آئی۔ دورِ کشان کی سکوں کی تاریخ میں پہلی بار سونے کے سکّے اس عہد میں بننا شروع ہوئے۔ اس کے بعد ہی سونے کے سکوں کا رواج عام ہوا۔

اس کے بعد، آنے والی صدیوں میں ٹکسال میں سکّے ڈھلنے لگے اور قدیم ہندوستانی سکوں کی وہ تاریخ جو ساتویں صدی قبل مسیح میں شروع ہوئی تھی۔ اتنی منزلوں کو طے کرتی ہوئی آج اس شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ ٭٭٭

ہندوستانی فنِ مصوّری

فنونِ لطیفہ کی مختلف اصناف کی طرح، فنِ مصوری بھی وقت کا ایک خوبصورت عطیہ ہے لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اس فن میں بھی بتدریج ترقی اور نمایاں تبدیلی ظہور پذیر ہوتی رہی۔ فن مصوری ایک ایسا آرٹ ہے جو روح اور اظہار کی تخلیقی صلاحیتوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اور سماج کی ذہنی و معاشرتی پہچان کو فروغ دیتا ہے۔ اور اس فن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے مختلف زمانے میں بنی ہوئی تصاویر اور نقش کو مرتب کرنے میں اس کی بتدریج داستانوں کو جاننا ایک مزیدار پہلو ہے۔

ہندوستانی فنِ مصوری کی روایت کا سلسلہ ماقبلِ تاریخ کے دور تک جاتا ہے۔ جب ہزاروں سال پہلے انسانوں نے چٹانوں کے سینے میں یوں ہی بغیر سمجھے بوجھے کوئی نقش بنایا تھا اور پھر اسی تحریک نے انسان کو آمادہ کیا کہ وہ اپنے گرد پائے جانے والے جانوروں اور پیڑ پودوں کی تصویر کسی پتھر یا چٹان پر بنائے۔ اس کوشش کو فن مصوری کی ابتدا کہا جا سکتا ہے۔ پھر ہزاروں سال گزر جانے کے بعد جیسے جیسے انسان کا شعور بیدار ہوتا گیا اور اس کے مزاج میں شستگی آتی گئی تو اس نے پہاڑوں کی گفاؤں کی دیواروں پر تصویر بنانی شروع کردی۔ یہ تصویر اب محض اتفاقی نہیں تھیں، بلکہ اس میں انسان کی شعوری کوشش کارگر تھی۔ سبزی، پتوں اور مٹی کی آمیزش سے قدرتی رنگ تیار کئے اور ان رنگوں کے ذریعہ دیوار پر ایسے دائرے اور نقش بنائے۔

جنھیں پہچاننا آسان تھا۔ جس کے نتیجہ میں اجنتا کی دیواروں پر فن مصوری کے نمونے آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ باغ کی تصاویر کا آج بھی جواب نہیں۔ لیکن یہ بات بھی پہلی اور دوسری صدی قبل مسیح کی ہے۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ فن مصوری کے ابتدائی مکمل نمونے دیواروں اور گفاؤں کی چھتوں پر بنائے جانے والے ہی ہیں۔ پہلی صدی تک ہندوستان کے لوگوں میں مذہبی تصور بیدار ہو چکا تھا۔ ہندو، بدھ اور جین مذاہب کے اخلاقی اور سماجی ضوابط مرتب ہو چکے تھے۔ دیوی، دیوتا اور مختلف شکلیں انسان کے ذہن میں گھر کر چکی تھیں۔ نتیجہ کے طور پر انسان نے کبھی تخلیق کے اظہار کا ذریعہ بنا کر اور کبھی مذہبی عقیدت کی بنا پر تصویر کشی شروع کر دی تھی۔ موٹے طور پر اس فن کو دو خانوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ دیوار کی تصاویر (MURAL PAINTING) اور ملائم چیزوں پر بنی ہوئی تصویریں جسے انگریزی میں (MINIATURE) کہا جاتا ہے۔ ان میں سے دیواروں، سخت پتھروں پر بنے ہوئے فن مصوری کے وہ نمونے قابلِ ذکر ہیں جو گفاؤں اور مندروں میں پائے جاتے ہیں ـــــ دوسری قسم کی تفصیل ضروری ہے۔ کیونکہ مینیچر تصاویر کا عروج نہایت ہی دلچسپ ہے اور تاریخ کے بدلتے ہوئے دور کے ساتھ ساتھ اس فن میں بھی نمایاں ترقی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ تصاویر جو عام طور پر اپنے رقبہ اور سائز کے حساب سے چھوٹی ہوتی ہیں۔ دراصل ایسے فن میں اظہار کی مختلف صلاحیتوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایسے نمونے سب سے پہلے ہندوستان میں دسویں اور بارہویں صدی عیسوی میں مشرقی ہندوستان کی سرزمین پر کھجور کے پتوں اور چھلکوں پر بنے ہوئے ملتے ہیں۔ اس وقت اس علاقہ میں پالا حکومت کے کچھ حکمرانوں نے اس فن میں دلچسپی لی اور وہاں کے آرٹسٹ نے اس طرح کے فن مصوری کے نمونے پیش کئے جن کی مثالیں آج بھی مختلف میوزیم میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اس دور کی بنائی ہوئی تصاویر میں بدھ مذہب کی جاتک کہانیوں کی نمائندگی خاص طور پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے فیگر کے ذریعہ نہایت وسیع خیال کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور زیادہ تر تصویریں مذہب سے متعلق ہیں۔

اسی اثناء میں یعنی قرونِ وسطیٰ میں مغربی ہندوستان کے بعض علاقوں میں جین مذہب کے ماننے والوں نے عقیدت کے پیشِ نظر اس فن میں خصوصی دلچسپی لی اور پتوں، چھلکوں اور کینوس پر تصویر کشی کو بہتر طریقہ پر پیش کرنا شروع کیا۔ جس کا سلسلہ سولہویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔ لیکن اس دور کی وہ تصاویر زیادہ قابلِ ذکر ہیں جو چودھویں اور پندرہویں صدی کے دوران بنائی گئی ہیں۔ کیونکہ یہی وہ زمانہ ہے جب کھجور کے پتوں کے بجائے کاغذ کا استعمال شروع ہونے لگا تھا۔ یوں تو کاغذ کی ابتدار پہلی صدی عیسوی ہی میں چین کے بعض علاقوں میں ہو چکی تھی مگر ہندوستان میں کاغذ کا استعمال چودھویں صدی کے نصف اواخر میں ہونا شروع ہوا۔ اس دور کے فنِ مصوری کے نمونوں کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ چھوٹے بھی ہوتے تھے اور ان میں تزئین کی طرف زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ مرد اور عورت کے چہروں کے نقوش میں بھی تیکھا پن صاف نظر آتا ہے۔ ساتھ میں نوکیلی ناک اور باہر کی طرف نکلی ہوئی آنکھوں کی تصاویر پائی جاتی ہیں۔ اس عہد کے فنِ مصوری کے بیشتر نمونوں کا پس منظر ہلکے رنگ اور سرخ اینٹ کے رنگ جیسا ہوتا ہے۔ یعنی جین اسکول سے وابستہ تصاویر کی ایک انفرادی شناخت بن چکی تھی۔ لیکن پندرہویں صدی میں اس اسکول کے تحت بنائی جاتے والی تصاویر کا پس منظر بدل کر گہرے رنگوں کے ساتھ نیلے اور سنہرے انداز کا ہو جاتا ہے اور سرخ، گلابی، سبز، سیاہ اور سفید رنگوں کا استعمال بھی فنِ مصوری کے نمونوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے اہم مرکز مانڈو، جونپور، بنارس اور اجین تھے جن میں ہر جگہ کے نمونے الگ شناخت رکھتے ہیں۔ ان تصاویر میں جین اور مہاویر کے احکامات کے علاوہ کچھ جنسی تصاویر بھی ملتی ہیں۔ جن میں مرد اور عورت کو شہوانی خواہشات میں مصروف دکھایا گیا ہے۔

راجستھانی اسکول:۔

سولہویں صدی کے نصف میں راجستھانی فنِ مصوری کی بنیاد پڑتی ہے اور سترھویں

صدی تک اس فن کو پورے ہندوستان میں اپنی انفرادی خصوصیات کی بنا پر جانا جانے لگا۔ اور اٹھارویں صدی کا پورا زمانہ اس اسکول کے تحت بنائی جانے والی تصاویر کا شاہکار عہد کہا جاتا ہے۔ جب کہ اس زمانے میں پہاڑی، بنارس، بنگال، اودھ اسکول کے تحت بعض اچھے فنکاروں کے نمونے سامنے آتے ہیں، لیکن ان سب میں راجستھانی اسکول کو نمایاں فوقیت حاصل رہی ہے۔ اس اسکول کے اہم مرکز ادے پور، جے پور، جودھ پور، بیکانیر اور بوندی میں قائم ہو چکے تھے۔ ان کی رنگینی، مکمل تناسب اور جاذبیت تمام اہلِ نظر کو اپنی طرف راغب کرنے لگی۔ اور ہر علاقہ کے راجہ اور امراء اپنے دربار میں خصوصی انعامات سے فنکاروں کو نوازتے رہتے تھے۔ جس کا مثبت اثر یہ ہوا کہ فن مصوری سے دلچسپی رکھنے والے فنکاروں میں اس کی طرف خصوصی توجہ ہونے لگی۔ اور بڑی محنت سے شاہکار نمونے پیش کرنے لگے۔ یوں بھی راجستھان کے علاقہ میں گہرے رنگوں اور شوخ انداز کی چیزوں کا ہمیشہ سے چلن رہا ہے۔ اس طرح فن مصوری کے لئے یہ مذاق کافی کارگر ثابت ہوا۔ راجستھان کے کشن گڑھ کے دربار میں ۱۸ ویں صدی کے بعض شاہکار فنپارے آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ جن میں رنگوں کی بہتات ہے اور گہرے و شوخ پس منظر کے ساتھ تصاویر کا تانہ بانہ تیار کیا جاتا ہے۔ راجستھان اسکول کی تصاویر کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ ان کے موضوعات پرانی مذہبی کتابوں اور اساطیری قصوں سے ماخوذ ہیں۔ جن میں بعض جانوروں اور پیڑ پودوں کو علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے یہاں تک کہ بعض رنگوں کے استعمال سے جذبات کے اظہار کی نمائندگی بھی ہوتی ہے۔ فن مصوری کے نمونوں میں رنگوں اور متعدد علامتوں کے استعمال سے ایک طرف تو روحانیت کے تصور کو پیش کیا گیا ہے اور ساتھ ہی عشق و محبت، موسم کے تہوار، اور مذہبی رسم و رواج کو بھی اُن کے ذریعہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ۔۔۔ راجستھانی فنکاروں نے جس اہم موضوع کو اپنی تصاویر میں پیش کیا ہے۔ وہ "راگ مالا" یعنی موسیقی کے مختلف موڈ اور کیفیت کو اداکاری

کے ذریعہ پیش کرنے کا تصور ہے۔ بارہ ماسا "راماین" کرشن جی کے واقعات، اور ساون کے موسم کے مختلف مناظر کی عکاسی یہاں اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ راجستھانی اسکول کی سب سے اہم تصاویر میواڑ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جس نے دوسرے اسکول کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ تصویر میں بنے ہوئے مرد اور عورتوں کو بھرپور جسم کے ساتھ دکھایا گیا ہے اور نمایاں انداز میں ناک کو پیش کیا گیا ہے اور پوری تصویر کا پس منظر دیو مالائی کہانیوں پر مبنی ہے۔ اسی طرح "بُندی" کے علاقہ میں بنائی جانے والی تصاویر گہرائی لئے ہوئے کرداروں کے گول چہروں کو پیش کرتی ہیں جو نہ صرف اعلیٰ تخلیق کی صلاحیت کا اظہار ہیں بلکہ ان میں نفاست کا بھی پورا خیال رکھا گیا ہے۔ درختوں کی تصاویر کو اس طرح سلسلہ وار بنایا گیا ہے جو کہ لہراتے ہوئے سانپ کا منظر پیش کرتے ہیں۔ پھر "کوٹا" بھی اس خیال کی ایک کڑی ہے جس میں زیادہ تر شکارگاہ کے مناظر کو پیش کیا ہے۔ پس منظر میں ہریالی اور سبزو شادابی کا بھی پوری طرح خیال رکھا گیا ہے۔ اسی زمانہ میں مغل اسکول کی بھی تصاویر کی اپنی پہچان رہی ہے۔ جس کا کھلا ہوا اثر بیکانیر میں بنی ہوئی تصاویر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان میں چڑیوں اور راجپوت سپوتوں کی تصویریں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ "کِشن گڑھ" کے فنکاروں نے تصاویر بناتے وقت عورتوں کے جسم کو نمایاں کرنے میں کافی دلچسپی دکھائی ہے۔ آنکھ، ناک، زُلف، سینہ، اور جسم کو اتنے اچھے تناسب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جس سے اس علاقہ کے نسوانی حسن کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ پھر جودھپور اور جے پور میں بنائی جانے والی تصویروں میں مردوں کے سر پر رکھی ہوئی پگڑی کو اہمیت کے ساتھ بنایا گیا ہے اور راجہ و امراء کو قیمتی لباس اور زیورات سے مرصع پیش کیا گیا ہے۔ مجموعی طور پر راجستھان اگرچہ ایک صوبہ کی حیثیت رکھتا ہے پھر بھی یہاں الگ الگ علاقوں کی منفرد شناخت ہے۔ جس نے پوری ہندوستانی تاریخ میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔

مغل اسکول :۔

آرٹ اور فن تعمیر کے نقطۂ نظر سے مغل بادشاہوں نے ہمیشہ خصوصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے لیکن فن مصوری میں تین بادشاہوں کو انفرادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اکبر (۱۶۰۵ - ۱۵۵۶) جہانگیر (۱۶۲۷ - ۱۶۰۵) اور شاہ جہاں بادشاہ (۱۶۵۸۔۱۶۲۷) اس عہد کی تصویریں روایتی عظمت، شاندار اسٹائل اور جرأت مندانہ رویّہ کی نمائندہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جلال الدین محمد اکبر بادشاہ کے حکم کے مطابق اس کے سامنے ہر ہفتہ فنکاروں کی بنائی ہوئی تصویریں پیش کی جاتی تھیں اور اچھی تصویروں کو بادشاہ کی طرف سے خاطر خواہ انعام دیا جاتا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے دربار میں فن مصوری کا خصوصی شعبہ موجود تھا جس کی نگرانی کے لئے میر سید علی اور عبدالصمد جیسے اعلیٰ درجہ کے فنکار موجود تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم اور ہندو تہذیب کی مشترکہ نمائندگی تصاویر کے ذریعہ بھی ہونے لگی۔ شاہ نامہ، بابر نامہ، دیوان حافظ، گلستاں اور بوستاں کے علاوہ رامائن مہابھارت، گیتا اور دوسری ہندوستانی قلمی نسخوں کو تیار کیا گیا اور ساتھ ہی ان کو تصاویر کے ذریعہ مزین کیا گیا۔ یہ ایک ایسی کوشش تھی جس کے ذریعہ نہ صرف ہندو مسلم تہذیب سامنے آئی بلکہ عرب، ایران اور ترکی کی تہذیبی زندگی کے نقوش بھی مغل عہدِ حکومت کی تاریخ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مغل اسکول کے فن مصوری کے نمونوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں کی تفصیل، نفاست، رنگوں کی آمیزش سے کچھ منفرد رنگوں کی پیش کش اور نمایاں تزئین اس اسکول کی خصوصیات ہیں۔ جن پر پوری طرح ایرانی اسکول کے اثرات ظاہر ہوتے ہیں۔ اس طرح کے اہم نمونوں میں سے "داستانِ امیر حمزہ" کا مصوّر قلمی نسخہ خصوصی طور پر توجہ کے قابل ہے۔ جس میں ایک ہزار چار سو (۱۴۰۰) تصاویر ہیں جن کو پندرہ سال کی متواتر کوشش کے بعد مکمل کیا گیا۔ اکبر کے عہد میں بساون دسونتھ، تنہا اور لشن داس کو اس فن کا پیش رو کہا جاتا ہے۔ مغل اسکول کی فن مصوری کی ایک امتیازی پہچان یہ بھی ہے کہ اس کے ابتدائی زمانے کی تصاویر میں

صرف مردوں اور اس کی حرکات کی تصویر کشی ملتی ہے اور خواتین کی کوئی بھی نمائندگی نظر نہیں آتی ہے۔

جہانگیر کے زمانے میں بادشاہ کی خصوصی توجہ سے اس فن میں نہ صرف انسانی کرداروں کو بہتر طریقہ سے پیش کیا گیا ہے، بلکہ قدرتی مناظر اور جانوروں کی بھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ہندوستان میں پہلی بار زیبرہ جانور (ZEBRA) کی تصویر عہد جہانگیری میں بنائی گئی اور بادشاہ کی طرف سے ہدایت تھی کہ کسی بھی تصویر کو بناتے وقت رنگ اور حاشیوں کا پوری طرح خیال رکھا جائے۔ اسی بادشاہ کے عہد میں پہلی بار خواتین اور اُن کے ملبوسات کو تصویر کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔ جو بادشاہ کی ملکہ نورجہاں کی خاص توجہ کا مرہونِ منت ہے۔ مغربی ممالک اور یورپ کے اثرات بھی جہانگیر کے عہد میں ہندوستانی فنِ مصوری پر پڑے ہیں۔ جس کی ایک نمایاں مثال سنہ ۱۶۲۰ء کی بنی ہوئی ایک تصویر ہے جس میں جہانگیر کے ہاتھ میں میڈونا (یعنی ایک اٹلی کی خاتون کی تصویر ہے۔ اس طرح عہدِ جہانگیری کو فنِ مصوری (PAINTING) کا عہدِ زریں کہا جا سکتا ہے۔ جس میں ہندوستانی فن پر ایران، ترکی، عرب کے علاوہ مغربی اثرات بھی پورے طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

شاہ جہاں کا عہد ویسے تو فن تعمیر کے نقطۂ نظر سے زیادہ مشہور ہے، مگر اس کے زمانے میں بھی فنِ مصوری کو کچھ نئے زاویوں سے مالا مال کیا گیا۔ سنہری اور نقرئی حاشیہ پھول پتیوں میں سُرخ اور سونے کی آمیزش، دربار کے مناظر اور میدانِ جنگ کی تصویر کشی اس دور کی انفرادی خصوصیت ہے۔ مگر شاہجہاں کے بعد اورنگزیب کا عہد فنِ مصوری کے لئے مفید ثابت نہ ہو سکا۔ کیونکہ اسلامی عقیدہ کے پیشِ نظر کسی بھی ذی روح کی تصویر کشی جائز نہ تھی۔ لہٰذا اورنگ زیب نے بھی اسلام کے پیشِ نظر ایسے تمام کاموں سے بے تعلقی کا اظہار کیا۔ جس میں شریعت کی اجازت نہ تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فنِ مصوری کا فروغ بھی دھیما ہو گیا۔ اور آہستہ آہستہ مغل حکومت کے زوال کے ساتھ ہی اس فن کا زوال ہونے لگا — لیکن ہندوستان کے وہ علاقہ جہاں کے علاقائی راجہ اور امراء اس فن میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ ایک منظم طریقہ سے فنِ مصوری کا یہ کام

ہوتا رہا۔

پہاڑی اسکول:۔

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کے کٹر مذہبی خیالات اور فنِ مصوری سے بے رخی کی وجہ سے وہ مصور جو دلی یا لاہور میں کام کرتے تھے۔ اپنے اپنے وطن واپس لوٹ گئے۔ پھر وہاں سے پنجاب کی پہاڑی ریاستوں میں چلے گئے۔ جہاں انھوں نے مقامی اثرات کا ایک امتزاجی اسلوب پیدا کیا۔ جسے ہندوستانی مصوری میں "پہاڑی طرز" کہا جاتا ہے۔ یہاں کی راجپوت ریاست جو مشرق میں ٹیڑھی گڑھوال سے مغرب کی جموں ریاست تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس علاقہ میں فنِ مصوری جو سامنے آیا، اُسے "پہاڑی مصوری" کے نام سے جانا گیا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اندرونی خانہ جنگیوں اور انتشار کے باوجود ان پہاڑی علاقوں میں کاریگروں اور مصوروں نے جذبات کا اظہار اور فن کی شاہکار جولانیوں کو کاغذ کے صفحات پر تصویر کی شکل میں پیش کیا۔ یہ مقامات بسولی، گلیر، چمبا، جموں، نورپور، بلاس پور، منڈی، کلو اور کانگڑہ ہیں۔ جہاں کے فنِ مصوری کے نمونے اپنی الگ خصوصیات کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر بسولی میں بنائی جانے والی تصویروں کے فیچر الگ ہیں۔ جس میں نشیلی آنکھیں، معمولی جھکے ہوئے کردار اور نہایت ہی رنگین قدرتی مناظر ہیں۔ ان تصاویر میں سُرخ اور نارنجی رنگ کا خصوصی استعمال ملتا ہے۔ جب کہ گلیر کی تصاویر میں جذبات کی عکاسی زیادہ ہے۔ اسی طرح چمبا طرز کی تصویروں میں تزئین کا پیکر نمایاں ہے۔ نور پور کے نمونوں میں ہر کردار زیادہ لمبا اور اونچا پیش کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس کلو میں چہرے ابھرے ہوئے اور جسم میانہ قد کے ساتھ نظر آتا ہے اور پس منظر میں بارش کے قطروں سے موسمِ ساون کے تصور کو پیش کیا گیا ہے ـــــ پہاڑی طرز کی بعض تصاویر میں جو پنجاب کے فطری ماحول میں پیش کی گئی ہیں۔ ان میں سنہرے رنگ کے ساتھ مردوں کو پگڑی اور داڑھی کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ جب کہ خواتین کے

چہرے اور جسم پر دوپٹہ اور شلوار جیسے ملبوسات کو آراستہ کیا گیا ہے۔ جب کہ کانگڑہ اور منڈی کی تصاویر میں عورتوں کے بھرے بھرے جسم کے ساتھ آنکھوں میں نشہ کے ساتھ محبت کے جذبہ کو نکھارا گیا ہے۔ پہاڑی طرز کی تمام تصاویر میں پس منظر میں قدرتی مناظر اور ہریانی کے عنصر کو خاص طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔ ان میں راجہ سنسار چند کو ایک خاص مصور کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ پنڈت سیو، نین سکھ، اور لچھمن داس اس اسکول کے نمایاں مصوّر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

دکّن اسکول:۔

مغلیہ دورِ حکومت میں فنِ مصوری اگر پورے ہندوستان میں اپنے طرز کے نمونوں سے پہچانا جاتا تھا تو ساتھ ہی دکن یعنی جنوبی ہندوستان میں بھی اس فن کے کئی اسکول وجود میں آچکے تھے۔ اس سلسلہ میں بیجاپور حکمرانوں کی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔ اسی زمانے میں "نجوم العلوم" نامی ایک مصوّر قلمی نسخہ تیار کیا گیا جس کی تاریخ ۱۵۷۰ء بتائی جاتی ہے۔ جس کو دکن کا سب سے اوّلین مصوّری قلمی نسخہ کہا جاتا ہے۔ اکبر بادشاہ کے عہد کی بنی ہوئی مغل اسکول کی تصویر کی طرح دکن کے نسخہ بھی مغربی، ایرانی اثرات سے پُر نظر آتے ہیں۔ ان تصاویر پر مغل آرٹ کا بھی نمایاں اثر ہے۔ بیجاپور کے علاوہ، بعض دوسری جگہیں یعنی احمد نگر اور گولکنڈہ طرز کی تصاویر کی بھی منفرد پہچان ہے۔ یہاں آصف جاہی حکومت کے قیام کے بعد فنِ مصوّری کو بھی خصوصی فروغ حاصل ہوا۔ ہندو رسم ورواج کے اثرات بھی ان میں موجود ہیں۔ خصوصاً وہ تصویریں جن میں فقیر، سادھو اور عورتیں تصویر کے ذریعہ سامنے لائی گئی ہیں ۱۷۵۰ء میں جب کہ ایک طرف اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کی بنا پر مغلیہ حکومت میں مغل بادشاہوں کے درمیان افراتفری اور خانہ جنگی برپا تھی۔ اس وقت دکن میں مصوّری کے فن میں بتدریج فروغ ہو رہا تھا اور زیادہ رنگین، زیادہ رنگ وروغن اور زیادہ مرصّع نگاری کے ساتھ فنِ مصوّری سامنے آرہا تھا۔ جس کے نتیجہ میں حرم کے مناظر، شکارگاہ کے مناظر اور عورتوں

کے حسین چہروں کی عکاسی خوب دیکھنے کو ملتی ہے۔ عورتوں کے چھریرے جسم کے ساتھ اُن پر اوڑھنی، چولی اور کہیں کہیں پر ساڑی کے بھی مناظر ہیں۔ ان عورتوں کو جنگل میں شکار کرتے ہوتے بھی دکھلایا گیا ہے۔ دکن طرز کی تصاویر کی یہ خوبی ہے کہ اُن کو چھوٹے چھوٹے پھول اور پودوں کے پس منظر میں تیار کیا گیا ہے اور ہندو دیومالا کی روایات کے ساتھ ان کو موضوع بنایا گیا ہے۔

ہندوستانی فن مصوری کے سلسلہ میں ان کے علاوہ بھی بعض دوسرے اسکول قابلِ ذکر ہیں۔ جن میں اودھ، آسام، میسور، تانجور، آندھرا اور اڑیسہ کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔ ان میں اڑیسہ کے نام کے ساتھ ساتھ بنگال میں بنائے گئے نمونوں کی یہ پہچان ہے کہ ان پر مقامی رجحانات کافی حاوی ہیں۔ ناریل کے پیڑ، سمندر، کھیت کھلیان اور فیگر کی بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ جین طرز کی تصاویر سے کافی مشابہت ہے۔ تصویر کی ذرا ذرا سی جگہ کو سجایا جاتا ہے، اور بیک وقت کاغذ کے علاوہ کھجور کے پتوں پر تصویریں بنائے جانے کی روایت بھی جاری رہی۔ دوسری جگہوں پر بھی بیشتر تصاویر کا پس منظر علاقائی تہذیب اور جغرافیائی مناظر کی نسبت سے تیار ہوتا رہا۔ تانجور کی تصاویر مذہبی رجحانات کی زیادہ عکاس ہیں۔ جیسے کہ اودھ اور لکھنو طرز کی تصاویر میں امراء اور نوابوں کے ٹھاٹ باٹ اور درباری زندگی کے شب و روز کو گہرے رنگوں اور مرصع کاریگری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے شروع کا زمانہ ہندوستان پر فرنگیوں اور فرانسیسیوں کے غلبہ کا زمانہ ہے۔ مغل حکومت کمزور پڑ چکی تھی۔ آرٹ اور فنونِ لطیفہ کی حفاظت کرنے والا کوئی نہ تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی فن مصوّری زور پکڑنے لگا۔ اس اسکیم کے تحت فرنگیوں نے انگلستان کے مصوّروں کو ہندوستان آنے کے لئے مدعو کیا۔ "اوڈیلی کیٹلی" غالباً سب سے پہلا فرنگی مصوّر تھا جو ۱۷۶۹ء میں مدراس پہونچا اور ۱۷۷۶ء تک ہندوستان میں رہا اور دھیرے دھیرے کچھ ہی عرصہ میں تقریباً ساٹھ فرنگی مصوّر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں سیاحت کرتے اور

فن مصوری کے نمونوں کو بناتے رہے ——— وہ ہندوستانی آثار قدیمہ، جغرافیائی اہمیت کے مناظر، مختلف طبقہ، ان کے طور طریقے، رہن سہن اور پوشاکیں اور اپنی دلچسپی کی دوسری چیزوں کو بھی تصویر کشی کے ذریعہ محفوظ کرتے گئے۔ عام طور سے سایہ اور روشنی کا امتزاج، قدرت کی عکاسی، تناسب و تناظر، ڈرامائی سہہ جہتی انداز اور حقیقت نگاری فرنگیوں کی تصاویر کی انفرادی خصوصیات ہیں۔ کینوس پر تصاویر بنانے کا رواج بھی انھیں لوگوں کی وجہ سے ہندوستان میں عام ہوا۔ ان تصورات کا اثر یہ ہوا کہ مدراس، بنگال اور فرنگیوں کے زیر اثر امراء و رؤساء کے علاقوں میں بھی یہی طرز پسند کیا جانے لگا۔ ہندوستانی اور فرنگی طرز کا مشترکہ اثر یہ ہوا کہ کچھ ہی عرصہ میں جدید فن مصوری کی ابتداء ہوگئی۔ جس میں انگریز مصوّر کے علاوہ ہندوستان میں رابندر ناتھ ٹیگور (۱۸۶۱-۱۹۴۱) جامنی رائے (۱۸۸۷-۱۹۷۲) اور امرتا شیر گل (۱۸۸۷-۱۹۴۰) نے فن مصوری میں ہندو فرنگی اثرات کو ملا کر جدید مصوّری کو مکمل طور پر پیش کیا۔ جس کو تجریدی آرٹ کا نام دیا۔ اور منتظم ادارے کے طور پر یہ تحریک آگے بڑھتی رہی۔

ہندوستانی صحیفوں اور حکایات پر مبنی قصہ کہانیوں میں وید مقدس، رامائن، اور مہابھارت کے بعد سب سے اہم اور اولین کتابوں میں پنچ تنتر کو سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں کچھ حکایات ایک قلمی نسخہ کی شکل میں مرتب کی گئیں۔ جن کو کتابی شکل میں تدوین کرنے کا سہرا اس عہد کے دو مشہور دانشور اور زبان وادب کے ماہر عالم رائے دشلم اور ویدپائی کے سر ہے۔ تاریخی حوالوں میں اس بات کا بھی سراغ ملتا ہے کہ اس زمانے میں ایران پر نوشیرواں بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ اس کو جب پنچ تنتر کی ادبی ثقافتی اور اخلاقی اہمیت کی خبر ملی تو اس نے ہندوستان کے کنار راجہ سے پنچ تنتر کے نسخہ کو حاصل کرنے کی فرمائش پیش کی، تاکہ ایران میں بھی اس کا فارسی ترجمہ کرایا جاسکے۔ دراصل پنچ تنتر ایک ایسا نادر نسخہ ہے جس میں چھوٹی چھوٹی نصیحت آمیز حکایات جانوروں کی زبان کے ذریعہ مکالموں کی شکل میں پیش کی گئی ہیں۔ یہ کہانیاں دیکھنے تو حیوانات کے نقل وحرکت اور افعال و کردار کے سہارے ترتیب دی گئی ہیں لیکن یہ غیر انسانی کردار انسانوں کی طرح سوچتے سمجھتے اور بولتے نظر آتے ہیں۔ جانوروں کے پس پردہ یہ تمام کہانیاں انسانوں کی زندگی سے براہ راست تعلق رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر پنچ تنتر میں ایک واقعہ لکھا ہوا ملتا ہے کہ ایک خرگوش اور کچھوے میں دوڑ کا مقابلہ ہوا، اور شرط لگی کہ کون پہلے منزل پر پہونچتا ہے؟ خرگوش تیز تیز قدموں سے سرپٹ بھاگنے لگا۔ خرگوش کو یہ گھمنڈ تھا کہ بھلا یہ سست رفتار

کچھوا اس کا کیا مقابلہ کرپائے گا۔ آگے چل کر خرگوش نے جب دیکھا تو کچھوا بہت پیچھے دھیرے دھیرے رینگتا ہوا منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ تھوڑی دیر کے لئے سو لیا جائے نتیجہ یہ ہوا کہ کچھوا متواتر ایک جیسی رفتار سے چل کر منزل پر پہلے پہونچ گیا اور خرگوش بیچ راستے ہی میں پڑا سوتا رہ گیا ــــ اس کہانی سے یہ نصیحت ملتی ہے کہ دشمن کو کبھی بھی کمزور نہ سمجھنا چاہیئے اور چاہے کوئی بھی کتنا پھرت اور طاقتور ہی کیوں نہ ہو، اس کو اپنے اوپر گھمنڈ نہ کرنا چاہیئے۔

پنچ تنتر کو سب سے پہلے گپتا دورِ حکومت میں سنسکرت زبان کے ذریعہ برہمی رسم الخط میں پیڑ کی چھال پہ لکھ کر سامنے لایا گیا۔ اس کے فوراً بعد پالی اور پراکرت زبانوں میں بھی اس کا آسان اور عام فہم ترجمہ کیا گیا۔ اس کی مقبولیت کے پیش نظر نوشیرواں نے چوتھی صدی عیسوی کے اواخر میں اپنے خاص سفیر "بازردیا" نامی ایک دانشور کو ہندوستان روانہ کیا، تاکہ وہ پنچ تنتر کے نسخہ کو ایران لاکر فارسی کی پہلوی زبان میں ترجمہ کرا سکے۔ لیکن نوشیرواں کے اچانک انتقال کی وجہ سے اس کے بعد نیزدگرد بادشاہ نے چار سال کی لگاتار محنت کے بعد اس کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔ جس کا نام "انوارِ سہیلی" رکھا گیا۔ پنچ تنتر کے اس فارسی ترجمہ کو بھی کافی مقبولیت اور اہمیت ملی۔ دربار اور عوام میں لوگوں نے اس کی حکایات کو بڑے شوق سے سُنا۔ پنچ تنتر کی یہ کہانیاں ایک طرف تو دلچسپی اور دل بہلانے کا ایک ذریعہ بھی تھیں۔ کیوں کہ لوگ کثیر تعداد میں ایک جگہ جمع ہو جاتے تھے اور ایک فارسی کہانیاں سنایا جاتا تھا۔ ساتھ ہی کہانیوں کے پس منظر میں انسانوں کی بُری خصلتوں اور نخوت وغرور کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ خود نیزدگرد بادشاہ کا بیان ہے کہ پنچ تنتر کی کہانیاں اخلاقیات اور نصیحت پر مبنی شاہکار کا درجہ رکھتی ہیں۔

آٹھویں صدی کے وسط میں عباسی خلیفہ المنصور کے زمانے میں بھی پنچ تنتر کو عرب ممالک میں خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔ خلیفہ کے حکم سے اس زمانے کے مشہور عالم ابن المقفع نے بغداد شہر میں اس کا ترجمہ عربی زبان میں کیا۔ جس کو " کلیلہ و دمنہ " کا نام دیا گیا ــــ کلیلہ و دمنہ اس کتاب کی ایک کہانی کے دو اہم کردار ہیں جو ویسے تو ایک جانور سیّار کے

نام ہیں، لیکن ان کے مکالموں میں انسان کے اندر پائے جانے والے حسد، نفرت، اور دروغ گوئی کی طرف بڑی خوبصورتی کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔

قدیم ہندوستان کی تاریخ میں جب بھی گپتا عہد کا ذکر ہوتا ہے تو اس زمانے میں آرٹ، آرکیٹیکچر، فنونِ لطیفہ اور قلمی نسخوں کے ذکر کے ساتھ فخریہ طور پر "پنچ تنتر" کے نسخہ کا تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کتاب کا اصل نسخہ تو اب کہیں بھی دستیاب نہیں ہے۔ لیکن عہدِ راجپوت میں نویں اور دسویں صدی عیسوی کے دوران اس کے کئی نسخے نقل کئے گئے، جن کو پیڑ کی چھال یا بھوج پتر پر سنسکرت اور ناگری رسم الخط میں تحریر کیا گیا۔ لیکن ان نسخوں میں اصلیت باقی نہیں رہی کیونکہ ہر کاتب نے اپنی طرف سے بھی کچھ کہانیاں گڑھ کر پنچ تنتر کے نسخہ میں شامل کر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ دسویں صدی میں لکھے جانے والے ہندوستانی نسخوں اور بغداد کے عربی نسخہ کلیلہ ودمنہ میں کہیں کہیں مناسبت نہیں پائی جاتی ہے۔

ادھر ایران و عرب ممالک میں بھی لگ بھگ ہر دور میں پنچ تنتر کے مزید فارسی اور عربی نسخہ نقل کئے جاتے رہے ہیں۔ جن کو بالترتیب انوارِ سہیلی اور کلیلہ ودمنہ "کا نام دیا گیا۔ ہندوستان میں عہدِ مغلیہ کا ذہین اور مشہور بادشاہ جلال الدین محمد اکبر بھی اس کتاب کی اہمیت کا قائل تھا۔ بادشاہ کی فرمائش پر پنچ تنتر کے وہ تمام نسخے جو دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کئے گئے تھے، اس کے سامنے پیش کئے گئے، اور سب کے مطالعہ کے بعد اس کے عہد میں بھی اس کتاب کا ایک معتبر ترجمہ ۱۵۷۰ء میں نقل کرایا گیا جو مولانا نصر اللہ مصطفیٰ اور ملا کاشفی کی محنت سے تیار ہوا۔ اس دورِ اکبری کے پنچ تنتر کے نسخہ کی اہمیت اور انفرادیت اس اعتبار سے بھی زیادہ ہے کہ تحریر اور متن کے علاوہ یہ مصوّر بھی ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ آج بھی لندن یونیورسٹی کی اورینٹل اسٹڈیز کلکشن میں محفوظ ہے۔

پنچ تنتر کا ایک اور فارسی نسخہ عہدِ اکبری میں تیار کرایا گیا۔ جس کے مؤلف ابو الفضل ہیں۔ ابو الفضل نے غالباً ۱۵۸۸ء میں اس نسخہ کو ترتیب دیا تھا، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ مؤلف نے حتی الامکان فضا، ماحول اور جانوروں، چڑیوں کے نام ہندوستانی

مزاج کے لحاظ سے رکھے ہیں اور آزاد ترجمہ کی صورت میں اپنی فکری تخیل سے بھی کام لیا ہے۔ اس طرح ابوالفضل کا یہ نسخہ "عیارِ دانش" کے نام سے مشہور ہوا۔ پنچ تنتر کے اس نسخہ کو بھی فنِ مصوری سے آراستہ کیا گیا۔ جس میں الگ الگ کئی ہندوستانی اور ایرانی مصوروں کی تصاویر موجود ہیں۔ اس نسخہ کی اہمیت اس اعتبار سے بھی خصوصی ہے کہ متن کو بغیر پڑھے بھی صرف تصاویر کے ذریعہ کہانی کا ماحصل سمجھا جا سکتا ہے۔

پنچ تنتر کی تاریخی حیثیت کے علاوہ ادبی سطح پر بھی کافی اہمیت ہے۔ کیوں کہ یہ وہ پہلی کتاب ہے جو مذہبی خیالات اور ہندو دیومالا یا جاتک کہانیوں سے الگ ہٹ کر سیکولر ادب کے طور پر پہلی بار ہندوستان کی سرزمین پر متعارف ہوئی اور چوتھی صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان کے علاقہ میں پنچ تنتر کو ادبی، ثقافتی اور کتابی اہمیت تو ملی ہی ساتھ ہی فنونِ لطیفہ کو فروغ دینے میں بھی ان کہانیوں کے ذریعے سے نئے امکانات حاصل ہونے لگے۔ کیونکہ پتھروں پر تراشی گئی چڑیوں اور جانوروں کی شبیہیں بھی پنچ تنتر کے کرداروں سے ماخوذ ہیں۔ یہ کتاب ایک ایسا قدیمی نسخہ ہے جو نہ صرف تاریخی اہمیت کا حامل ہے، بلکہ اس کی کہانیاں، اخلاقیات انسان دوستی، آپسی بھائی چارہ اور نصیحت کا بھی پیغام دیتی ہیں جو آج بھی اعلیٰ انسانی قدروں کو تقویت بخشتی ہے۔ ٭٭٭

فنِ خوش نویسی

انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کئی طرح سے ہوتا رہا ہے، لیکن فنونِ لطیفہ ایک ایسا آرٹ ہے جو تمام جمالیاتی حس رکھنے والوں کو اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ انھیں فنونِ لطیفہ کے مختلف اظہار کے ذریعہ متعدد ادوار اور مختلف علاقوں کی انفرادی پہچان بھی بنتی ہے اور اس زمانے کے مزاق اور رجحانات کا بھی علم ہوتا ہے۔

دراصل ماضی اور حال کے درمیان جوڑنے والی سب سے اہم کڑی "تحریر" ہے۔ اسی کے ذریعہ گزشتہ دور کی زندگی کی باتیں سمجھی اور جانی جا سکتی ہیں، اور اسی تحریر کے ذریعہ کسی بھی معاشرہ اور سماج کی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دراصل تہذیبِ انسانی کی داستان ہی تحریر کے وجود میں آنے کے بعد ہوتی ہے۔

ہندوستان میں اگر رسم الخط یا تحریر (SCRIPT) کی تاریخ تلاش کی جائے تو موٹے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی بنیاد تو اُسی وقت پڑ گئی تھی، جب انسان نے کسی پتھر کے ذریعہ چٹانوں پر یونہی بغیر سمجھے بوجھے ایک لکیر بنا دی تھی۔ مگر اس کا باقاعدہ مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب میں پروردہ لوگوں نے بھی ہڑپا اور موہنجوداڑو جیسے شہروں میں کچھ تحریروں کے نقوش پتھروں پر بنائے تھے، جن کے یقیناً کوئی معنی اور مطلب نکلتے ہوں گے۔ مگر اب تک کی تحقیق اور ریسرچ کے مطابق اس کا قطعی طور پر پتہ نہیں لگایا جا سکا ہے کہ اُن کے معنی کیا تھے،

یا دہ کس طرح پڑھی جاتی تھی؟

لیکن تحریر کی سب سے ابتدائی شکل، جس کو سب سے پہلے سمجھا اور پڑھا جا سکا ہے۔ وہ عہدِ موریہ کی تحریر "برہمی" (BRAHMI) ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ایرانی اور آرامی رسم الخط کے مشترک امتزاج سے ہندوستان کے شمالی مغربی علاقہ میں ایک اور تحریر وجود میں آئی جسے "خروشتی" (KHAROSHTI) کہا جانے لگا۔ اس رسم الخط کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ بھی فارسی یا عربی کی طرح دائیں سے بائیں سمت پڑھی جاتی تھی۔ اور آج بھی اس تحریر کے ماہرین اس کو پڑھ اور لکھ سکتے ہیں۔

لیکن اگر فنِ خوش نویسی یا خطاطی کے پس منظر میں اسلامی خطاطی کا ذکر کیا جائے تو اس کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں۔ کیونکہ عہد وسطیٰ میں اسلام کے روشناس ہونے کے بعد ہی باقاعدہ اور نمایاں طور پر اس فن کی بنیاد پڑی۔ یہ دراصل عربی اور فارسی رسم الخط کے ذریعہ ہی سامنے آئی۔ کیوں کہ یہی زبانیں دونوں نمایاں طور پر اسلام کی ترویج و ترقی کا بنیادی ذریعہ بنیں۔

ہندوستان یا دنیا میں بعض دوسری جگہوں پر فنون لطیفہ کے اظہار کے لئے مختلف ذرائع تھے۔ جن میں فن سنگ تراشی، مورتیاں بنانا اور تصویریں بنانا عام طور پر رائج تھا۔ لیکن اسلام نے مذہبی نقطۂ نظر سے کسی طرح کی بھی ذی روح کی تصویر مطلق حرام قرار دے دی۔ اس کے ساتھ ساتھ عرب دنیا کے پاس قرآن یا احادیث ایک ایسا تحفۂ خداوندی و پیغمبر تھا جس کو دور دراز تک پھیلانا اُس دور کے مسلمانوں کا اہم فریضہ بن گیا تھا۔ نتیجہ کے طور پر فن تحریر کی طرف توجہ دی گئی اور قرآن و حدیث کو کتابی شکل میں مدون کرنے کا کام تیزی سے شروع ہوتا گیا۔ بسا اوقات ایک حافظ قرآن سناتا جاتا اور بہت سارے لوگ قلمبند کرتے جاتے۔ اس کے ساتھ ہی ایران میں فارسی رسم الخط کے ذریعہ پُرانی کہانیوں اور نصیحت آمیز واقعات کو احاطۂ تحریر میں لایا جانے لگا۔

ویسے تو عرب شاعری کے میدان میں عہدِ جاہلیت میں بھی کافی مشہور تھے۔ ان کی عربی زبان کا "سبع معلقہ" شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ لیکن یہ اشعار یا قصائد عربی کے کس

خط میں تحریر تھے۔ اس کا قطعی طور پر پتہ نہیں چل سکا ہے لیکن اسلام کی آمد کے بعد پہلی صدی ہجری میں کوفہ میں عربی رسم الخط کی ایک نئی شکل مرتب ہوئی، جسے شہر کوفہ کی مناسبت سے "کوفی" "رسم الخط" کہا جانے لگا۔ اب تک کی دریافت کے مطابق عربی کے جو سب سے ابتدائی نمونے ملتے ہیں وہ اسی کوفی (KUFIC) رسم الخط میں تحریر شدہ ہیں۔ کیونکہ تقریباً ساتویں صدی عیسوی تک وسط ایشیاء کے لوگوں میں لکھنے کا رواج بہت کم تھا۔ لوگ عام طور پر اپنے اشعار اور قصائد زبانی یاد رکھتے اور سناتے تھے مگر مذہب اسلام میں قرآن اور احادیث یا دوسرے خلفاء کی باتیں جب تک احاطۂ تحریر میں نہ لائی جائیں، اس وقت تک ان کے صحیح ہونے میں شبہ کی گنجائش تھی۔ اس طرح اسلام کی بدولت باقاعدہ طور پر فنِ خوش نویسی یا فنِ خطاطی عالم وجود میں آیا۔ جس کی سب سے ابتدائی شکل "خطِ کوفی" کہی جاتی ہے۔ اس کے ابتدائی نسخے نرم اشیاء پر ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر چمڑا، کھجور کے چھلکے، کھال جو اپنی شکل کے اعتبار سے کھڑے اور بڑے ایستادہ حروف میں لکھے ہوتے ہیں۔

۷ ویں صدی عیسوی کے اواخر میں اس فن کو عروج ہوا۔ کیوں کہ مکہ مدینہ، طائف، بصرہ، کوفہ اور دمشق فن خوشنویسی کے اہم مرکز بن گئے۔ مشہور اور قابل خطاط قرآن اور حدیث کو تحریر کرنے لگے اور یہ سب کچھ خطِ کوفی میں لکھا جاتا رہا۔ وہ عرب جو فنون لطیفہ کی دوسری اصناف میں پچھڑے ہوئے تھے۔ اب فنِ خطاطی کے ذریعہ اُبھر کر سامنے آئے۔ اس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ فنِ خطاطی (CALLIGRAPHY) اسلام کی طرف سے دنیا والوں کے لئے ایک بہت بڑا عطیہ ہے۔ جلد ہی یہ فن کتابوں کی حدود سے نکل کر عمارتوں، سکوں روز مرہ کی استعمال کی اشیاء، مسجدوں، گنبدوں، مقبروں، اور اسلحہ و ہتھیار کے ذریعہ سے نمایاں ہونے لگا۔ اب یہ فن محض مذہبی عقیدت کی بناء پر استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ مختلف چیزوں کو مزین اور آراستہ کرنے کے کام میں بھی لایا جانے لگا۔۔۔۔ اور دسویں صدی عیسوی کے ختم ہونے سے پہلے ہی ایک اور رسم الخط جس کو "نسخ" کہا جاتا ہے، ایجاد ہوگیا اور کوفی کے مقابلہ میں

یہ خط نسبتاً گولائی کے ساتھ لکھا جانے لگا۔ نسخ، زیادہ آسانی اور زیادہ تیزی سے لکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے دھیرے دھیرے کوفی کا رواج کم ہو گیا اور اس کی جگہ "نسخ" آ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں ابن مقلہ نامی ایک خطاط نے "نسخ" کو بغداد میں ایجاد کیا تھا۔ خود نسخ کی کئی ذیلی قسمیں ہیں جو مختلف ردّ و بدل کے ساتھ الگ الگ ملکوں میں رائج تھا۔ یہ اپنی ہر دلعزیزی کی وجہ سے پوری اسلامی دنیا میں جلد مقبول ہو گیا۔ آج بھی عربی زبان یا قرآن پاک اسی "نسخ" رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ بعد نسخ کے اصولوں پر ایک اور خط ایجاد ہوا جس کو "ثُلُث" کہتے ہیں۔ اس میں ایک ہی سطر میں حروف کو اس طرح سجاتے ہیں کہ وہ بالترتیب تین حصوں میں سجا دیا جاتا ہے۔ اس کو دیکھ کر کسی خوبصورت آراستہ شئی کا گمان ہوتا ہے۔ ہندوستان میں تاج محل کے صدر دروازے پر بھی خط 'ثُلُث' کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایک اور خوبصورت مزین اندازِ تحریر کو "رقاع اور توقیع" کہتے ہیں۔ یہ 'ثُلُث' سے بھی زیادہ آراستہ اور پیراستہ ہوتا ہے۔ اس کی روانی حروف سانپ کے بل جیسی یا بہتے ہوئے جھرنے سے مشابہ ہوتی ہے۔ عام طور پر ابتدا میں اُسے روانی کے ساتھ لکھا جاتا تھا مگر جب بعد میں توقیع کو زیادہ آراستہ کیا جانے لگا تو اسے الگ سے 'رقاع' کا نام دیدیا گیا۔ اسی طرح "زلفِ عروس" خطِ گلزار، خطِ طاؤس، لرزا، منشور، بہار، خطِ ماہی وغیرہ رائج ہوئے لیکن ان تمام رسم الخط کی بنیاد نسخ پر ہی رہی۔ چونکہ فنِ خوشنویسی اب محض لکھنے تک ہی محدود نہ تھا بلکہ اس کے ذریعہ آراستگی، پیراستگی اور اشیاء میں خوبصورتی پیدا کرنے کا کام بھی لیا جانے لگا اور فنِ مصوری کی جگہ پر استعمال ہونے لگا۔ اس لئے اس کو نمایاں طور پر ترقی دی جانے لگی۔

۱۲ویں صدی عیسوی کے اواخر تک اب مسلمانوں کا فنِ خطاطی، عرب کی سرزمین سے باہر نکل کر دنیا کے مختلف مقامات میں پھیلنے لگا۔ اور خصوصی طور پر ایران اور ہندوستان میں اس کا زبردست اثر ہوا۔ ایران کی تہذیب اور فارسی زبان کی اپنی الگ شناخت

اور مزاج تھا۔ ان لوگوں نے بھی "نسخ" کے مقابلہ میں "تعلیق" کو رائج کیا۔ جو ایران میں استعمال ہوتا تھا۔ مگر جلد ہی تعلیق اور نسخ کے مشترک امتزاج سے ایک نیا اور بہت ہی مقبول خط ایجاد ہوا جسے "نستعلیق" کہا جانے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۴ ویں صدی کے اواخر میں، خواجہ میر علی تبریزی نے باقاعدہ طور پر خطِ نستعلیق، کو رائج کیا۔ اس خط کی شکل نسبتاً زیادہ خمیدہ اور گھماؤ کے ساتھ ہوتی ہے۔ اور حروف دائروں کی شکل میں لکھے جاتے ہیں۔ عام طور پر فارسی یا رسم الخط اُردو اسی "خطِ نستعلیق میں لکھا جاتا ہے۔ پھر نستعلیق کی کچھ ذیلی قسمیں بھی ایجاد ہوئیں۔ جیسے خطِ شکستہ، خطِ غبار، خطِ آفتابی اور خطِ ماہی وغیرہ۔ اس خط کے بہت سارے نمونے "وصلی" کی شکل میں آج بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ "خط طغرہ، فنِ خوشنویسی کا ایک اہم اور قابلِ ذکر اندازِ تحریر ہے۔ یہ اگرچہ نسخ کی ایک قسم ہے مگر اس کی تزئین کا پیکر زیادہ آراستہ ہوتا ہے۔ عام طور پر حروف کو اس طرح سجایا جاتا ہے کہ دیکھنے والے کو فوری طور پر کسی خوشنما پھول، یا کسی جانور کی شکل کا گمان ہوتا ہے اور ایک گلدستہ کی طرح یہ سجا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ عام طور پر خطِ طغرہ کتاب کی ابتداء میں فرمان اور سند کے اوپری حصہ میں بنایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف اشیاء کے علاوہ مغل دور کی عمارتوں پر بھی خطِ طغرہ دیکھا جا سکتا ہے۔

ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ نے بھی ایک انفرادی تحریر کو رائج کرنے کی کوشش کی تھی۔ جس کو خطِ "بابری" کا نام دیا گیا تھا۔ لیکن یہ الگ سے کوئی خط نہ تھا اور نستعلیق کے سامنے مقبول نہ ہو سکا۔

ہندوستان میں فنِ خوشنویسی کے نمونے محمود غزنوی کی ہندوستان میں آمد کے بعد ہی سے ملتے ہیں جو اس دور کی تعمیر کردہ کچھ عمارتوں اور مقبروں پر تحریر ہیں، لیکن اُن میں سے بیشتر یا تو اچھی قسم کے نہیں ہیں اور زیادہ عمارتیں منہدم ہو چکی ہیں۔ لیکن سلطنت عہد سے ہندوستان میں کافی تعداد میں فنِ خطاطی کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ دہلی میں قطب مینار اور مسجد قوۃ الاسلام کی دیواروں اور محرابوں پر خطِ کوفی اور خطِ نسخ کے بہترین نمونے موجود ہیں ــــ اسی طرح اجمیر شریف کی مسجد "اڑھائی دن کا جھونپڑہ"

میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ تینوں مذکورہ عمارتیں ہندوستان کی سرزمین پر اسلامی فنِ تعمیر کا سب سے ابتدائی اور مکمل نمونہ ہیں۔

غلام خاندان کے بادشاہوں اور شہاب الدین محمد غوری کی ہندوستان میں آمد کے بعد سے ہندو مسلم مشترکہ فنِ تعمیر کی بنیاد پڑی جس کا اثر یہ ہوا کہ عربی فارسی اور ترکی زبانوں اور فن کو ہندوستانیوں نے بھی سیکھا اور فنِ تعمیر کے ساتھ ساتھ فن خوش نویسی میں بھی مہارت حاصل کی۔ اس طرح یہ فن ہندوستان میں آکر صرف اسلامی فن کی حیثیت سے نہیں بلکہ ہندو مسلم مشترکہ تہذیب کے فن کی صورت میں جانا جانے لگا اور ایک طرف تو علائی دروازہ، فتحپور سیکری کا محل، سکندرہ، تاج محل اور گول گنبد کی تعمیر ہوئی تو ساتھ ہی تزک بابری کا فارسی کا ترجمہ، لیلیٰ مجنون، تاج المأثر، گلستان و بوستان، دیوانِ حافظ، شاہ نامہ فردوسی، جہانگیر نامہ، رامائین، مہابھارت اور جین و بدھ مذہب کی کتابوں کے فارسی اور عربی میں ترجمے ہوئے اور یہ سب اسی ہندوستان میں یہیں کے فنکاروں کے ذریعہ پورا کیا گیا۔

ہندوستان کے بعض بادشاہوں نے بھی فنِ خطاطی میں خصوصی دلچسپی لی جس میں سلطان ابراہیم غوری بن سلطان مسعود، سلطان ناصر الدین محمود۔ ظہیر الدین محمد بابر، محی الدین محمد اورنگ زیب اور دارا شکوہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ یہ لوگ اپنے ہاتھ سے قرآن لکھتے تھے اور اس کے ہدیہ سے اپنا ذاتی خرچ چلاتے تھے۔ مشہور غیر ملکی سیاح برنی نے لکھا ہے کہ اس نے بادشاہِ وقت سلطان ناصر الدین محمود بن التمش کو قرآنِ پاک لکھ کر بازار میں چپکے سے بھیجتے تھے اور اس بات کی تاکید کر دیتے تھے کہ کسی کو یہ نہ معلوم ہو پائے کہ اس قرآن کی کتابت خود بادشاہ نے کی ہے۔ کیوں کہ ایسی صورت میں کوئی بھی زیادہ دام دیکر قرآن حاصل کرنا چاہے گا۔ اورنگ زیب بادشاہ خود خطِ نسخ کے ماہر تھے اور فتح اللہ شیرازی کے شاگرد تھے۔ آج بھی اورنگ زیب بادشاہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن کا نسخہ انڈیا لائبریری لندن میں محفوظ ہے۔

قرآن کے قدیم ترین قلمی نسخوں کے بارے میں ابھی تک کی تحقیق سے یہ پتہ چلتا

ہے کہ سب سے پرانا نسخہ جرمنی کے شہر "ہمبرگ" میں ۱۶۰۴ء کا محفوظ ہے۔ لیکن حال ہی میں یہ انکشاف ہوا ہے کہ سب سے پرانا قرآنی نسخہ اٹلی کے شہر "وینس" کے میوزیم میں ۱۵۳۷ء کا لکھا ہوا موجود ہے۔ جو وہیں پر کسی کاتب نے لکھا تھا، جس کا عربی نام "بندقیہ" ہے۔ غالباً یہ واحد نسخہ ہے جو اتنا پرانا ہونے کے باوجود ابھی تک محفوظ ہے۔ یہ تمام نسخے کاغذ پر تحریر ہیں۔

ایک طرح سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۲ ویں صدی سے لے کر لودھی بادشاہوں یعنی ۱۵ ویں صدی تک نسخ رسم الخط کا زیادہ رواج تھا۔ کیوں کہ ان بادشاہوں پر عرب یا ترکی کے اثرات زیادہ تھے۔ مگر ۱۵۲۶ء سے بابر بادشاہ کے ہندوستان میں مغل حکومت کی بنیاد کے ساتھ ہی فنِ تعمیر کے ساتھ ساتھ فنِ خوشنویسی میں بھی ایرانی اثرات زور پکڑنے لگے۔ جس کے نتیجہ میں فارسی نے عربی کی جگہ لے لی اور نسخ کے بجائے "خطِ نستعلیق" زیادہ مقبول ہو گیا۔ قرآن کے علاوہ مختلف کتابیں اور ترجمے فارسی زبان میں خطِ نستعلیق میں لکھی جانے لگیں۔ حکومت کی طرف سے جو احکامات اور فرمان صادر ہوتے وہ بھی اسی خط میں تحریر کئے جاتے۔ عمارتوں، سکوں، اسلحہ اور دوسری کام میں آنے والی اشیاء پر بھی خطِ نستعلیق ہی کندہ کیا جانے لگا اور ایک کامیاب اور مقبول فن کی صورت میں فن خوش نویسی عام ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دکن میں میر خلیل اللہ شاہ نے ہندی کتاب "نورس" کا فارسی ترجمہ خطِ نستعلیق میں تیار کیا۔ یاقوت مصطفیٰ، سامی نے تغلق بادشاہ کو نسخ کے قلمی نسخہ پیش کئے۔ میر عماد، آقا عبدالرشید، دھرم داس ہنر، ٹوڈرمل، شنکر، لالہ دوارکہ پرساد، لچھمن۔ سکھ رام اور ابیر سنگھ جیسے اسی سرزمین کے خطاطوں نے فنِ خوش نویسی کے کمالات دکھائے اور آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نمونے آج بھی گذشتہ دور کی داستان کے امین ہیں۔ ❊

شاہ نامۂ فردوسی

شاہ نامہ لکھنے کی روایت ایران میں زمانۂ قدیم سے رائج ہے۔ قدیم ایران کی تاریخ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُس ملک میں بادشاہ کے حکم سے شاہ نامے لکھے جاتے تھے۔ جن میں نثر یا نظم دونوں اصناف شامل تھیں، فردوسی سے پہلے بھی اپنے عہد کے مشہور ایرانی شاعر دقیقی نے بھی بادشاہِ وقت کے حکم کے مطابق ایک شاہ نامہ لکھنا شروع کیا مگر اس کی تکمیل سے پہلے ہی یہ شاعر موت کی آغوش میں سو گیا اور اس کی کوشش نامکمل رہی ۔ مگر شاہ نامہ کا نام آتے ہی فوری طور پر فردوسی کا نام ہی ذہن میں ابھرتا ہے کیوں کہ شاہ نامۂ فردوسی کو جو اہمیت، مقبولیت اور شہرت مل رہی ہے نہ تو اس سے پہلے اور نہ ہی اس کے بعد کسی دوسرے شاہنامہ کو ملی ہے۔

سنہ ۱۴۲۸ء میں لکھے ہوئے ایک قلمی نسخہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سلطان محمود غزنوی (جو کہ دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں غزنہ کا بادشاہ تھا) کی شاہی لائبریری میں "سیرِ ملکِ عجم"، نامی ایک قلمی نسخہ نثر میں لکھا ہوا موجود تھا۔ جس میں ایران کی مکمل تاریخ وہاں کی ادبی، ثقافتی، تہذیبی اور سیاسی زندگی کی تاریخ مدوّن تھی۔ محمود غزنوی کی یہ دلی خواہش تھی کہ اس کو منظوم شاہ نامہ کی صورت میں لکھا جائے۔ بادشاہ نے اس وقت کے ایک معتبر شاعر "عنصری"، کو اس کام کے لئے دعوت دی۔ عنصری نے شاہ نامہ لکھنا شروع کیا۔ مگر بادشاہ کو وہ زیادہ پسند نہ آیا اور خاطر خواہ اس کی فرمائش کی تکمیل نہ ہو سکی۔ یہ خبر پورے ملک میں پھیل گئی کہ محمود غزنوی ایک منظوم شاہ نامہ لکھوانا چاہتا

ہے جو تمام تر ادبی صلاحیتوں کا غماز بھی ہو اور سلطان کو پسند بھی آئے۔ یہ خبر ضلع طوس کے ایک گاؤں باژ میں پہونچی جہاں ابوالمنصور نامی ایک نوجوان شاعر رہتا تھا۔ یہ شاعر بھی اپنا رخت سفر باندھ کر غزنہ میں محمود غزنوی بادشاہ کے دربار میں باریابی حاصل کرنے کے لئے نکل پڑا۔ لیکن جب ابوالحسن منصور غزنہ پہونچا تو درباری شاعر فرخی، اسجدی اور عنصری جیسے لوگوں نے حسد کی بنا پر اس کو بادشاہ سے قریب نہ ہونے دیا۔ مگر یہ شاعر بھی مایوس نہ ہوا اور مسلسل ستر دنوں تک غزنہ میں مقیم رہا کہ ایک دن شہر کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے وقت حسن اتفاق سے اس کی ملاقات بادشاہ کے خاص وزیر سے ہوگئی۔

ابوالحسن قاسم منصور نے طوس سے غزنہ آنے کی وجہ بتائی اور اپنی شاعری کے کچھ نمونے اس کو سنائے۔ وزیر خوش ہوا اور دوسرے ہی دن محمود غزنوی کے سامنے اس شاعر کو پیش کر دیا۔ ابوالحسن منصور نے ہدیہ کے طور پر اپنی کتاب "ستائش نامہ" بادشاہ کو پیش کی۔ کچھ ہی دنوں بعد عید الفطر کے موقع پر منصور نے محمود غزنوی کی شان میں ایک شاندار قصیدہ سنایا اور اس طرح بادشاہ نے خوش ہو کر منصور کو درباری شاعروں میں چن لیا اور "سیر ملک عجم"، کا قلمی نسخہ منظوم کرنے کے لئے پیش کر دیا، اور ایک دیرینہ خواہش کا آغاز ابوالحسن قاسم منصور نے شاہ نامہ کو نظم کر کے کیا۔ شاہ نامہ لکھنے کی ابتداء ۳۷۰ھ مطابق ۹۸۰ء سے ہوئی۔ اور متواتر تیس سال تک یہ عمل جاری رہا۔ ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل شاہ نامہ جب محمود غزنوی نے سنا تو اس کو اس قدر پسند آیا کہ اس نے بے تحاشہ خوش ہو کر اپنی حکومت کو فردوس یعنی جنت سے تعبیر کیا اور ابوالحسن قاسم منصور کو تبھی سے فردوسی کا لقب عطا کیا گیا۔

بادشاہ نے اپنے وزیر اعلیٰ حسن میمندی کو یہ ہدایت دی کہ حسب وعدہ فردوسی کو ہر شعر کے عوض ایک سونے کا دینار عطا کیا جائے۔ لیکن حسن میمندی نے حسد کی بنا پر محمود غزنوی کو یہ بتایا کہ اگر ساٹھ ہزار اشعار کے بدلہ اتنی ہی رقم دی جائے گی تو سارا خزانہ خالی ہو جائے گا اور حکومت کو دشواری کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ چنانچہ وزیر اعلیٰ کے مشورے پر بادشاہ نے بھی غور کیا اور سونے کے دینار کے بدلہ چاندی کے ساٹھ ہزار

سکے فردوسی کو پیش کئے گئے۔ مگر اس شاعر لاجواب کو یہ رقم پسند نہ آئی اور اُسی وقت احتجاج کے طور پر ساٹھ ہزار چاندی کے سکے اپنے تین خدمت گاروں میں تقسیم کر دیئے۔ بیس ہزار اپنے اس ملازم کو دیدیئے جو اس کے لئے گرم پانی کا اہتمام کرتا تھا۔ بیس ہزار اس شخص کو جو فردوسی کے لئے مشروبات لاتا تھا، اور باقی کے بیس ہزار چاندی کے سکے اس آدمی کو بخش دئے جو یہ رقم لایا تھا۔ مگر فردوسی کی یہ حرکت محمود غزنوی کو پسند نہ آئی، بادشاہ نے خفا ہو کر اس کو پھانسی کی سزا کا حکم سنا دیا۔ مگر دوسرے دن علی الصباح فردوسی نے بادشاہ سے اپنی اس حرکت کی معافی کی درخواست کی۔ بادشاہ نے پھانسی کی سزا تو معاف کر دی مگر یہ حکم دیا کہ وہ اس کی نظروں سے سدا کے لئے دور ہو جائے — فردوسی واپس اپنے وطن طوس چلا آیا اور بادشاہ کی اس عہد شکنی کا ملال اس کو ہمیشہ رہا۔ غزنہ سے کوچ کرتے وقت فردوسی نے ایک اور طویل نظم لکھی جس میں بادشاہ کو اس بات کا احساس دلایا کہ کس قدر محنت اور قابلیت کے ساتھ اس نے بادشاہ کی فرمائش پر شاہ نامہ کی تخلیق کی، اور اس کے بدلہ میں خود فردوسی کو کس طرح رسوا اور پریشان کیا گیا۔ یہ نظم فردوسی نے غزنہ سے جاتے وقت بادشاہ کے خاص ملازم ایاز کو یہ کہہ کر دی کہ اس کے غزنہ سے چلے جانے کے بیس دن بعد یہ نظم محمود غزنوی کو دے دی جائے۔ جب یہ نظم بادشاہ نے پڑھی تو اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اپنے وزیر کی چاپلوسی پر سخت غصّہ آیا۔ اس نے ان تمام درباری ملازمین کو سخت سزا دی، اور اعلان کیا کہ جو شخص بھی دوبارہ فردوسی کو اس کے پاس لے آئے گا وہ اسے بطور انعام ۵۰ ہزار سونے کے سکے عطا کرے گا۔ مگر فردوسی کو تلاش نہ کیا جا سکا۔

ایک زمانے کے بعد پتہ لگا کہ فردوسی جنوبی ایران کے ایک ضلع "طوس" میں مقیم ہے محمود غزنوی نے فوراً اپنے بھروسہ کے کچھ مصاحبین کے ذریعہ ساٹھ ہزار سونے کے دینار فردوسی کو ارسال کئے مگر شومئ قسمت سے جب بادشاہ کے سفیر رقم لے کر طوس پہونچے تو راستے میں انھیں فردوسی کا جنازہ ملا جو قبرستان کی طرف اپنی آخری رسوم کے لئے لے جایا جا رہا تھا — سلطان محمود غزنوی کو جب یہ خبر ملی تو اسے از حد ملال ہوا — اور

حکم دیا کہ فردوسی کی لڑکی کو وہ رقم دے دی جائے لیکن اس شاعر نامراد کی بیٹی نے بھی وہ پیسہ لینے سے انکار کر دیا، اور آخر کار اسی رقم سے طوس میں ابوالحسن قاسم منصور عرف فردوسی کا ایک شاندار مقبرہ بطور یادگار تعمیر کر دیا گیا۔

فردوسی کی پیدائش سنہ ۹۳۴ء میں ضلع طوس کے ایک گاؤں میں ہوئی تھی اور وفات سنہ ۱۰۲۵ء میں ہوئی۔ "شاہ نامۂ فردوسی" دسویں صدی عیسوی کا ایک ایسا منظوم اور ادبی معیار کا ایک ایسا بہترین نسخہ ہے جس کو نہ صرف فارسی زبان و ادب میں ایران میں ہی انفرادی حیثیت حاصل ہے بلکہ پوری دنیا کی تاریخ میں آج تک اس کو یاد کیا جاتا ہے۔ اور ہر دور میں ہر اہل ذوق بادشاہ اور امراء نے شاہ نامہ فردوسی کے انفرادی نسخہ ترتیب دیئے ہیں۔

فردوسی کے شاہ نامہ کی ابتداء خدا کی حمد سے ہوتی ہے۔ پھر حضرت محمدؐ اور خلفائے راشدین کے ذکر کو پیش کیا گیا ہے۔ پھر ایران کے پچاس بادشاہوں کے کارنامے، ان کے معرکے، ان کے عشق کی کہانیاں، ان کا رعب و دبدبہ، اور اعلیٰ انتظامی امور کا بیان ہے۔ شاہ نامہ میں فردوسی نے منظوم شاعری کی ہے جس میں فارسی زبان کی اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔۔۔ لفظوں کی بندش اور روانیٔ فکر کا اس قدر شستہ امتزاج ہے کہ اس کو فارسی ادب کا اعلیٰ ترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اس شاہ نامہ میں ایرانی بادشاہ کیمروس KAYUMARS کے ذکر سے یزدگرد YAZDGARD III ثالث تک کا تفصیلی ذکر ہے جس سے قدیم ایران کے تاریخی مآخذ کا بھی بھرپور علم ہوتا ہے۔ پوری کتاب پچاس منفرد ابواب پر مشتمل ہے۔ ہر باب میں تفصیلی طور پر الگ الگ بادشاہوں کے ادوار کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جس میں اس عہد کی سماجی زندگی، روایات، آداب و اطوار، کھانے پینے کے سلیقے، فن تعمیر، نیز تہذیبی، اور سیاسی زندگی کا بھی بیان ہے۔

شاہ نامہ کا وہ حصہ تو اور بھی زیادہ دلچسپ ہے جس میں دل ہلا دینے والی جنگ کی داستان موجود ہے۔ لوگوں کا محض بادشاہ کی خاطر جنگ میں شریک ہو کر انجان اور اجنبی سپاہیوں کا آپس میں جنگ کرنا اور خون بہانا محض ایک اتفاق ہے جو یقیناً کھلی ہوئی بربریت اور ظلم ہے۔ ایران کے دو مشہور زمانہ بہادر جنگجو رستم اور سہراب کی کہانی کا بیان شاہنامہ

کا بہترین حصہ ہے ـــــ اس جنگ کی منظر کشی میں زرطشت، دارا، سکندر، اسکن، اور ساسانی شہنشاہوں کی معرکتہ الآراہ بہادری کی داستان بھی ہے۔ کبھی کبھی بعض جگہوں پر شاہ نامہ، رزم نامہ کی بھی نشاندہی کرتا ہے کیوں کہ جنگ کے مناظر کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے ـــــ
شاہ نامۂ فردوسی کی یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ ایران کی تاریخ کا اس قدر دلچسپ بیان اشعار کے حوالوں سے سلسلہ وار کیا گیا ہے۔ فردوسی نے اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر اس بات کو واضح کرنا چاہا ہے کہ دنیا میں سب سے بڑی چیز انسان دوستی، محبت، اور انسانیت ہے۔ خون بہر حال انسان کا بہتا ہے چاہے وہ دوست کا ہو یا دشمن کا۔ اس فانی دنیا میں نہ جانے کیوں آدمی نفرت، جلن، بے ایمانی، مکاری، اور چاپلوسی کے ذریعہ اپنے بازوؤں کی طاقت کو آزماتا رہتا ہے۔ کوئی بھی طاقت ور ایک دن کمزور ضرور پڑ جاتا ہے۔ کوئی بھی شہرت کوئی بھی عہدہ دائمی نہیں ہے۔ فردوسی ایسے لوگوں کی طرف بھی شاہ نامہ میں اشارہ کرتا ہے جو اپنی عقل کا جائز استعمال کرتے ہیں۔ جن کے مشورے، زہد، تقویٰ، رحم دلی، اور بہادری کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔
شاہ نامۂ فردوسی کے مختلف نسخے کثیر تعداد میں دنیا کے مختلف عجائب گھروں اور لائبریریوں میں آج بھی محفوظ ہیں۔ جن کو ۱۶ ویں صدی اور بعد کے زمانوں میں مصوّری کے نمونوں کے ساتھ بھی مزیّن کیا جاتا رہا ہے۔ گزشتہ ایک ہزار سال سے اس کی مقبولیت اور اس کے نسخوں کو لکھا جاتا رہا ہے۔ اس کی شرحوں کو مدوّن کیا جاتا رہا ہے۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ شاہ نامہ ہمیشہ سے مقبول اور قابل توجہ رہا ہے ـــــ آرٹ اور ادب کے محققین اس کے نت نئے گوشوں پر ریسرچ کر کے اس میں نئے پہلو اور نئے امکان تلاش کر رہے ہیں۔
شاہ نامہ کے اصل نسخہ کی دریافت کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ شاید وہ اب کہیں بھی موجود نہیں ہے۔ بلکہ فردوسی کے انتقال کے بعد سے متواتر تین سو سال تک شاہ نامہ کے کسی بھی نسخہ کا ابھی تک پتہ نہیں لگ سکا ہے۔ اب تک کی دریافت کے مطابق شاہ نامۂ فردوسی کا قدیم ترین نسخہ چودھویں صدی عیسوی کے وسط کا لکھا ہوا ہے، جو قاہرہ کے قومی عجائب گھر میں محفوظ ہے جو خطِ نسخ میں لکھا ہوا ہے۔ شاہ نامہ کے اشعار کے صحیح

ہونے میں بھی عالمین کا آپس میں اختلاف ہے کیونکہ مختلف عہد اور مختلف لوگوں کے ہاتھ کے قلمی نسخوں میں بھی موافقت نہیں ہے کہیں کہیں پر اشعار میں بھی ردّوبدل ہے۔ ان باتوں سے خیال کیا جاتا ہے کہ دور وسطی کے کاتب حضرات بھی عام طور پر پڑھے لکھے، عالم اور شعری صلاحیت رکھنے والے ہوا کرتے تھے۔ کسی بھی نسخہ کی کاپی کرتے وقت وہ حسب منشاء اشعار و الفاظ میں اپنی مرضی سے ردّوبدل کر دیا کرتے تھے چنانچہ یہی باتیں بعض مقامات پر شاہ نامہ میں بھی موجود ہیں۔ لہٰذا دستیاب قلمی نسخوں میں سے کون سا اصلی اور صحیح ہے اس کا کہنا بھی ممکن نہیں ــــ ایک ہندوستانی محقق اور فارسی کے مشہور عالم پروفیسر امیر الحسن عابدی کا کہنا ہے کہ گلستان، بوستان، شاہنامہ یا اسی طرح کے بعض دوسرے قدیم قلمی نسخوں میں ترمیم و توسیع کے بارے میں چونکہ اس بات کا پتہ نہیں لگایا جا سکا ہے کہ کس عہد میں اور کس ذریعہ سے ترمیم کی گئی ہے اس لئے اس طرح کے تمام نسخہ "حرامزادے" کہلائیں گے کیونکہ ان کے اصل ہونے کا یقین نہیں ہے۔

ہندوستان کو اس اعتبار سے ہمیشہ فخر رہا ہے کہ اس ملک میں بعض اسی طرح کے اہم قلمی نسخوں کو پہلی بار شائع کیا گیا ہے۔ چنانچہ شاہ نامۂ فردوسی کو بھی سب سے پہلی مرتبہ کلکتہ کے ایک چھاپہ خانے میں کسی انگریز عالم کے ذریعہ ۱۹ویں صدی کی ابتدا میں شائع کیا گیا۔ جو اب بھی ہندوستان کی بعض لائبریریوں میں محفوظ ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی اور اس کے بعد کے بہت سارے نسخہ آج بھی ہندوستان کے بعض میوزیم اور کتب خانوں میں محفوظ ہیں جن میں بعض نسخہ مصوّر ہیں اور اشعار کے مطالب کو تصاویر کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے۔

فردوسی کی پیدائش اور وفات کے بارے میں لوگوں کو صحیح تاریخ متعین کرنے میں اختلاف ہے مگر فردوسی نے خود اپنے ایک شعر میں شاہ نامہ کے مکمل ہونے کی تاریخ درج کر دی ہے :

زھجرت شدہ پنج وھشتاد بار
کہ گفتم من این نامۂ شہریار

مذکورہ بالا شعر میں درج حروف کا حساب لگانے سے ہجری تاریخ سنہ ۴۰۰ھ نکلتی ہے۔
پھر فردوسی کی تاریخ پیدائش کا اندازہ بھی اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ خود اس کے
بیان کے مطابق کہ جب محمود غزنوی بادشاہ بنا تو اس وقت فردوسی کی عمر ۵۸ سال کی تھی۔
چونکہ تاریخ کے حوالوں سے یہ بات صاف ہے کہ محمود غزنوی ۳۸۷ ھجری میں بادشاہ ہوا تھا
اس لئے فردوسی کی تاریخ پیدائش سنہ ۳۲۹ ھجری مطابق سنہ ۹۴۰ء ہونی چاہیے۔ اسی طرح فردوسی
کی تاریخ وفات کا بھی صحیح اندازہ نہیں ہے۔ کچھ کا گمان ہے کہ وہ (سنہ ۱۰۲۰ء) سنہ ۴۱۱ھ ہجری
میں وفات پا گیا اور بعض کا خیال ہے کہ اس کی تاریخ وفات (۱۰۲۵ء) سنہ ۴۱۶ھ ہجری ہے۔
البتہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ فردوسی کی عمر ۸۰ سال تک تھی ــــــ یہ بات خود شاہ نامہ
میں فردوسی کے اس شعر سے ظاہر ہوتی ہے ؎

کنون عمر نزدیک ہشتاد شد

امیدم بہ یکبارہ برباد شد

شاہ نامہ فردوسی آج ہمارے پاس جس شکل اور جس نوعیت کا بھی محفوظ ہے اسے
محض ایک داستان یا قصۂ پارینہ سمجھ کر نہ پڑھنا چاہیئے بلکہ شاہ نامہ ادب، تاریخ اور
حقیقت پر مبنی ایک ایسی دستاویز ہے جس کے ذریعہ سے آج بھی انسانیت اور حیوانیت کے
فرق کو سمجھا جا سکتا ہے، خود فردوسی نے اپنے اس شعر میں بھی اسی خیال کو ظاہر کیا ہے ؎

"تو این را دروغ و فسانہ مدان"

ہندوستانی فنونِ لطیفہ میں کھیل کود

ہندوستانی کھیل کود کی کہانی بھی غالباً اتنی ہی پُرانی ہے، جتنی یہاں کی تاریخ اور تہذیب ——— ہندوستانی ادب اور تاریخ کا اگر مطالعہ کیا جائے تو بہت سے ایسے کھیلوں کا علم ہوتا ہے جو بچے، جوان عام آدمی، امیرزادے اور شاہزادے کھیلا کرتے تھے ——— خصوصاً گاؤں اور پسماندہ علاقوں میں تو بہت سارے ایسے کھیل ہوا کرتے ہیں جو زمانۂ قدیم سے اُن کی تہذیب مذہب اور سماج کا ایک اہم حصّہ ہیں۔ گذشتہ دور ایک ایسا دور تھا، جب لوگوں کے پاس وقت کی فراوانی تھی۔ ان کے پاس مصروفیت کے ذرائع اتنے نہ تھے جتنے کہ آج کی اس مصروف ترین مشینی زندگی میں ہیں۔ ایسے حالات میں ہر شخص چاہے وہ کسی اونچے طبقہ کا ہو یا معمولی طبقہ کا، اپنی بساط کے مطابق اپنے کو مصروف رکھنے کے لئے کسی نہ کسی شغل میں محو رکھتا تھا۔ ہمارے ملک کے فنکاروں، مصوروں، سنگ تراشوں اور آرٹسٹوں نے جب ان لوگوں کو کھیل کود میں محو دیکھا تو خود بھی انہیں چیزوں کو اپنے فن کے اظہار کا ایک وسیلہ بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی فنونِ لطیفہ کے خزانے کو اگر دیکھا جائے تو اس میں گوناگوں اور بہت سارے ایسے عکس نظر آئیں گے جو کھیل اور کود کے اظہار سے بھرے ہوتے ہیں ——— ان فنونِ لطیفہ میں بہت سارے کھیل، تفریحی، تماشے اور دلچسپ مشاغل نظر آئیں گے ——— اس طرح کے کھیل اور تفریحی عناصر ہزاروں سال پُرانے مجسمے، سکّوں، قلمی نسخوں، تصویروں کے نمونوں، آرائشی سامان اور روزمرہ استعمال کی جانے والی اشیاء میں دیکھے

جا سکتے ہیں۔

آج بھی ہماری حکومت کو اپنے وطن کے اس اہم فن کی خوبیوں کا احساس ہے جس کے پیشِ نظر مختلف کھیل کود کے بین الاقوامی مقابلوں کا اہتمام کیا جا رہا ہے، جس میں ہمارے ملک کے نوجوانوں نے یہاں تک کہ خواتین نے بھی اہم حصہ لے کر نمایاں مقام حاصل کیا ہے، اور انھیں خاطر خواہ عہدوں اور انعام واکرام سے نوازا جاتا رہا ہے۔

ہندوستانی فنونِ لطیفہ میں جن کھیل کود کا اظہار ہوا ہے۔ اُن میں خاص طور پر کُشتی، مکہ بازی، گھوڑ سواری، تیراکی، شکار، گیند کا کھیل، پولو، ہرن کا شکار، ہاتھی اور شیر کا شکار، تیر اندازی، تلوار بازی، پٹا بازی، نٹوں کا تماشہ، کبوتر بازی، مینڈھے کی لڑائی، مُرغ کی لڑائی، شطرنج، چوپڑ، کرتب بازی یا ایسے ہی بعض دوسرے کھیل کود کو دیکھا جا سکتا ہے۔

موریہ، کشان، شُنگھا اور پھر گپتا دورِ حکومت میں عام طور پر سکوں یا پھر پتھروں اور دھاتوں کے بنے ہوئے مجسموں پر بعض کھیل کود کا اظہار ملتا ہے۔ مثال کے طور پر تیسری صدی قبل مسیح کی ایک پتھر پر بنائی ہوئی مورتی میں ایک نوجوان دوشیزہ کو گیند کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ وہ اپنا ایک ہاتھ کمر پر اور دوسرا سر پر رکھے ہوئے ہے۔ جسم ایک خاص زاویہ سے خمیدہ ہے۔ بایاں پیر زمین پر اور دایاں پیر گیند کو اُچھالنے میں مصروف ہے۔ آج سے تقریباً دو ہزار سال سے بھی زیادہ پرانی اس مورتی کو دہلی کے نیشنل میوزیم میں دیکھا جا سکتا ہے۔ گپتا دور میں ۵ ویں صدی عیسوی میں بھی مورتیوں کے علاوہ بعض ایسے سکے ملتے ہیں، جو سونے کے بنے ہوئے ہیں اور جن پر ایک آدمی کو تیر کمان کے ذریعہ شیر کا شکار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے، یا سونے ہی کے ایک سکے پر ایک سپاہی کو گھوڑے پر سوار کرتب بازی کرتے ہوئے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ دکن میں بنائے گئے چولا دورِ حکومت کی کچھ تانبے کی مورتیوں میں بھی کھیل کود کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر گیارہویں صدی عیسوی کی بنی ہوئی ایک مورتی کو یویو کھیلتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ یویو ایک کھیل ہے جس میں ایک گول گول گراری یا چھوٹے سے پہیہ میں دھاگہ یا اس طرح کی دوسری پتلی رسّی کو باندھ کر نچایا جاتا ہے۔ ہاتھی دانت سے بنی ہوئی بہت ساری مورتیوں کو لولو کھیلتے ہوئے بھی بنایا گیا ہے۔ ایسی مورتیاں بھی کثیر تعداد میں دیکھی

جا سکتی ہیں۔

پھر مغل دورِ حکومت (۱۵۲۶ تا ۱۸۵۷) کے دوران بادشاہوں، امیر زادوں اور عوام کو پتھروں کی دیواروں، مصوری کے نمونوں، قلمی نسخوں، روزمرّہ استعمال کی جانے والی اشیاء پر بنی ہوئی تصاویر کے ذریعہ سے انواع و اقسام کے کھیلوں میں منہمک اور مصروف دیکھا جا سکتا ہے۔ بابرنامہ یا تزکِ بابری جو بابر بادشاہ کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ جس کو بعد میں مصوری کے نمونوں سے آراستہ کیا گیا۔ اس میں ایک تصویر میں کشتی کے کھیل کو دکھایا گیا ہے۔ اگرچہ یہ کھیل ہندوستان میں بہت زمانے سے رائج ہے لیکن یہ پہلی بار مکمل صورت میں بابرنامہ میں ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ تصویر میں ایک منظر پیش کیا گیا ہے۔ جس میں بابر بادشاہ دیگر مصاحبین کے ساتھ دو پہلوانوں کی کشتی دیکھنے میں محو ہیں۔ اس جگہ پر دو مینڈھوں کو بھی آپس میں لڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ پس منظر میں پہاڑ، خیمہ، درخت اور شاہی محل موجود ہے۔ زمین پر دو ہاتھی بھی جنگ پیرا ہیں۔ دراصل کشتی ہمیشہ سے بین الاقوامی سطح پر ایک شہرت یافتہ کھیل رہا ہے۔ اس میں عام طور پر دو نوجوان مرد یعنی پہلوان ایک دوسرے سے طاقت آزمائی کرتے ہوئے ایک دوسرے کو زمین پر گرانے کی کوشش کرتے ہیں اور داؤں لگاتے ہیں کہ کون کس کو پہلے گراتا ہے۔ عام طور پر اس میں بدن پر صرف ایک لنگوٹ ہوتا ہے۔ شاید اس خیال سے کہ گتھم گتھی کے وقت کپڑے وغیرہ پھٹ نہ جائیں اور پھر آخر میں جیت اس پہلوان کی ہوتی ہے جو اپنے مخالف کو زمین پر گرا کر اس کو چاروں شانے چت کر دیتا ہے۔ اس طرح کشتی کے کھیل کا اظہار تصویروں کے علاوہ بعض دوسرے فنونِ لطیفہ میں بھی ملتا ہے۔ اور بہت سی پرانی کتابوں میں اس کھیل کے بارے میں تفصیل سے دیکھا اور پڑھا جا سکتا ہے۔ بہت سے بادشاہوں اور راجاؤں کے زمانے میں پہلوانوں کو سرکاری عہدوں اور انعامات سے بھی نوازا جاتا تھا۔ ایران میں بھی اس کھیل کا بڑا پرانا رواج رہا ہے۔ وہاں کے دو بڑے پہلوان زال اور رستم تو بہت ہی مشہور ہوئے ہیں۔

اسی طرح ہرن کا شکار بھی مغلوں کے عہد میں ایک دلچسپ کھیل تھا۔ ۱۵۹۸ء کی بنی ہوئی قلمی تصویر میں بابر بادشاہ کو ہرن کا شکار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ بادشاہ اپنے ساتھیوں اور

امراء کے ساتھ گھوڑے پر سوار جنگل میں ہرن کے ایک غول کا اپنی تیر و کمان سے شکار کر رہے ہیں۔ ہرن کا شکار ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے مقبول رہا ہے۔ تاریخ سے پہلے کے دور میں چٹانوں پر بعض ایسے نقش ملتے ہیں جن میں ہرن، شیر، چیتا اور ہاتھی کا شکار کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ہندو دیومالاؤں کی بعض رزمیہ کہانیوں میں بھی تحریر اور تصاویر کے ذریعہ سے شکار جیسے کھیل کا اظہار ملتا ہے۔ شہنشاہ جلال الدّین محمد اکبر کے بنائے ہوئے محل فتحپور سیکری میں بھی پکے فرش پر ایک جگہ دو طرح کے رنگوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ آئینِ اکبری میں اس طرح کے حوالے ملتے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس جگہ پر شطرنج کا کھیل کھیلا جاتا تھا۔ ان مختلف رنگوں کے خانے میں مہروں کے بجائے مردوں اور عورتوں کو کھڑا کیا جاتا تھا اور فرصت کے لمحات میں بادشاہ سلامت اور ان کی بیگمات اس کھیل کو خود کھیلتی تھیں۔ اکبر بادشاہ کے دور میں کثیر تعداد میں ایسی مثالیں ملتی تھیں، جس سے کھیل کود میں اُن کے ذوق اور دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ بیشمار مصوری کے نمونوں اور آئینِ اکبری میں بہت سی جگہوں پر، شیر، ہاتھی اور دیگر جانوروں کے شکار کی مثالیں ملتی ہیں۔ جہانگیر کے عہد میں بنائی گئی بہت سی تصویروں میں دکھایا گیا ہے، کہ ملکہ نورجہاں اپنی حسین آنکھوں سے بیک وقت چار چار شیروں کو مجروح کر دیتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ملکہ کی آنکھیں بہت ہی حسین تھیں اور اگر شیر بھی ان کی آنکھوں سے آنکھ ملا لیتا تو ڈھیر ہو جایا کرتا تھا۔ شہنشاہ محی الدّین محمد اورنگ زیب عالمگیر بھی شکار کے کھیل کو بہت پسند کرتے تھے۔ اُن کے لئے تو مشہور ہے کہ وہ باقاعدہ طور پر جنگلوں میں خطرناک جانوروں کے شکار کے لئے جایا کرتے تھے۔ یہ محض ایک کھیل یا تفریح تھی، اگرچہ خطرناک بھی تھی۔ شکار کے کھیل کے علاوہ دوسرے بہت سارے کھیلوں کا اظہار بھی ہندوستانی فنونِ لطیفہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر دکن کی ملکہ چاند بی بی کو اٹھارویں صدی کی ایک رنگین تصویر میں پولو کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ یہ مصوری کا نمونہ دکن اسکول کا بنا ہوا ہے جس میں پس منظر میں شہر کی آبادی ہے۔ پیڑ پودے اور مکانات ہیں اور ایک وسیع و عریض میدان میں ہری ہری گھاس پر چار گھوڑوں پر سوار چار خواتین ہیں جن میں سے سُرخ گھوڑے پر بیٹھی ہوئی چاند بی بی ہیں، ان کے سر پر تاج ہے۔ دونوں ٹیموں کے درمیان ایک گیند ہے اور بیچ میں ایک خاتون ریفری بھی ہے ــــــ

پولو یا چوگان ایک دلچسپ کھیل ہے جو گھوڑے پر سوار ہو کر کھیلا جاتا ہے۔ کھلاڑیوں کے ہاتھ میں ایک لمبی چھڑی ہوتی ہے اور زمین پر پڑے ہوئے گیند کو مارا جاتا ہے۔ یہ تصویر بعض اعتبار سے بہت اہم ہے ایک تو یہ کہ فن مصوری کا یہ ایک خوبصورت نمونہ ہے اور ساتھ ہی اس میں پہلی بار کسی خاتون کو پولو کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ پولو یا چوگان بازی ہندوستانیوں کا بڑا ہی مقبول اور دلچسپ کھیل رہا ہے۔ خصوصاً امراء اور بادشاہوں کی ہمیشہ سے دلچسپی کا مطمحِ نظر رہا ہے۔ غلام خاندان کے مشہور بادشاہ قطب الدین ایبک بھی چوگان کھیل کے ایک اچھے کھلاڑی تھے اور سبھی یہ جانتے ہیں کہ ان کی موت بھی پولو کھیلتے ہوئے گھوڑے پر سے گر جانے سے ۱۲۱۰ء میں ہوئی تھی۔

اکبر بادشاہ بھی پولو میں کافی دلچسپی لیتے تھے۔ انھوں نے فتح پور سیکری اور آگرہ میں اس کھیل کے لئے با قاعدہ میدان تیار کرواتے تھے۔ مغل شہزادیاں بھی اس کھیل کو کھیلا کرتی تھیں۔ احمد نگر کی ملکہ چاند بی بی اس کھیل کی ماہر تھی۔ جیسا کہ زیرِ بحث تصویر میں بھی دکن کی اس رانی کو خود پولو کھیلتے ہوئے بھی دکھایا گیا ہے۔

ہندوستان کے مختلف کھیلوں میں سے ایک کھیل شطرنج بھی ہے۔ جو آج دنیا کے ہر حصہ میں جانا جاتا اور کھیلا جاتا ہے۔ دراصل اس کی ابتداء ہندوستان ہی میں ہوئی ہے اور بعد میں ایران اور دیگر جگہوں پر رائج ہو گیا۔ ہڑپا اور موہن جداڑو کی کھدائی سے بعض ایسے سراغ ملے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ آج سے پانچ ہزار سال پہلے بھی شطرنج کھیل کا وجود تھا اور معمولی سی تبدیلی کے ساتھ اس دور میں بھی کھیلا جاتا تھا۔ فردوسی کی مشہور کتاب "شاہ نامہ" جو ۱۰ ویں صدی کے اواخر کا ایک اہم اور معتبر قلمی نسخہ ہے۔ اس میں مصنف نے شطرنج کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے اور یہ بھی بتلایا ہے کہ کس طرح یہ کھیل پہلی بار ہندوستان سے ایران کے بادشاہ کے پاس بھیجا گیا۔ ایرانی بادشاہوں اور امیرزادوں نے ہندوستانی سفیر کو محض اس لئے ہفتوں ایران میں روکے رکھا تاکہ وہ لوگ شطرنج کے کھیل کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ خود مغل سلطنت میں بھی یہ کھیل اعلیٰ سے ادنیٰ طبقہ میں بڑا مقبول تھا اور خوب کھیلا جاتا تھا۔ ۱۶ ویں صدی سے ۱۸ ویں صدی عیسوی تک کے مختلف فنونِ لطیفہ میں شطرنج کا ذکر اور اس کا اظہار برابر ملتا ہے۔ سنگِ مرمر، سُرخ پتھر، لکڑی اور مختلف دھاتوں سے بنائے گئے فنی نمونوں کے علاوہ انگنت تعداد میں

ایسی پرانی تصویریں ملتی ہیں جن پر شطرنج کے کھیل کو دیکھا جاسکتا ہے۔ ہاتھی دانت سے بنے فرش پر ہاتھی دانت کے بنے ہوئے خوبصورت مہرے بھی ملتے ہیں۔ جن کو عام طور پر رؤسا و امرا استعمال کیا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے اسٹیٹ میوزیم میں موجود فنِ مصوری کے ایک نمونہ میں دکھایا گیا ہے کہ ایک خوبصورت عمارت کے کھلے ہوئے صحن میں رادھا اور کرشن فرش پر بچھے ہوئے ایک مزین قالین پر بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے ہیں۔ یہ تصویر ۱۷۰۰ء میں راجستھان کے کسی مصور نے بنائی ہے۔ شطرنج ایک ایسا کھیل ہے جو دو کھلاڑیوں کے درمیان کھیلا جاسکتا ہے۔ فرش یا کسی بھی متوازن چیز پر ۶۴ چوکور خانے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ جن میں کل ۳۲ مہرے رکھے ہوتے ہیں۔ ہر ایک کھلاڑی کے ۱۶،۱۶ مہرے ہوتے ہیں۔ یہ کھیل بڑے آرام، اطمینان اور فرصت سے گھنٹوں کھیلا جاسکتا ہے۔

اسی طرح کا ایک کھیل ہے چوپڑ، جس کی ابتداء ہندوستان ہی میں ہوئی ہے اور اس ملک میں رائج بھی ہے، جس کو عموماً چار آدمی بیک وقت کھیل سکتے ہیں۔ اس میں ۱۶ گوٹیاں ہوتی ہیں جن میں سے چار چار ہر ایک کی ہوتی ہیں۔ چالیں چلی جاتی ہیں اور فرش یا کپڑے پر بنے ہوئے خانوں میں گوٹیاں آگے پیچھے ہوتی رہتی ہیں۔ اس کی شکل سے ملتا ہوا ایک عالمی شہرت یافتہ کھیل لوڈو بھی ہے۔ دراصل چوپڑ بھی ہندوستانی فنونِ لطیفہ میں اکثر دیکھا جاتا ہے تصویروں اور کپڑوں پر عموماً اس کھیل کو بنا ہوا دیکھا جاسکتا ہے۔ ۱۸ویں صدی کی ایک راجستھانی تصویر میں چوپڑ کو کھیلتے ہوئے دکھایا گیا ہے، جس کو دو راجستھانی امیر کھیل رہے ہیں۔ یہ تصویر جے پور کے پیلس میوزیم میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کھیلوں کے علاوہ ایسے بہت سارے دوسرے کھیل بھی ہیں جو صدیوں سے ہمارے ملک میں رائج ہیں اور ہندوستانی فنونِ لطیفہ کے اظہار کا اہم ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔

مثال کے طور پر جھولا جھولنا، پانی میں تیرنا، کرتب بازی یا نٹوں کا تماشہ دکھانا، دوڑنا، کودنا، پتنگ بازی، بٹیر بازی، کبوتر بازی، جادو کا تماشہ، آنکھ مچولی اور اسی طرح کے بعض دوسرے کھیل بھی مختلف ادوار میں ہندوستان ہی میں رائج ہوئے ہیں اور ان کو ادب و آرٹ کے ذریعہ انفرادی نقطۂ نظر کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اودھ اسکول

کی بنی ہوئی ابتدائی ۱۹ ویں صدی کی کچھ تصاویر اور تانبے کے برتنوں اور طشتری پر کندہ بعض ایسے مناظر بھی دیکھنے میں آتے ہیں جن میں دو اونچے ڈنڈوں پر بندھی ہوئی رسی پر ایک آدمی دھوتی اور پگڑی پہنے ہوئے کرتب دکھا رہا ہے۔ کانگڑا، راجستھان، مانڈو دکن اور لکھنو کے فنکاروں کے ذریعہ بنائی ہوئی بہت سی تصاویر ہیں۔ جوان عورتوں اور بچوں کو ساون میں پیڑ پر جھولا جھولتے ہوئے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ عام طور پر ایسی تصاویر ۱۸ ویں صدی کی بنی ہوئی ہیں۔ غرض یہ کہ اگر ایک طرف ماضی کا فنِ لطیفہ ہمارے ملک کا قیمتی سرمایہ ہے تو ساتھ ہی ان میں کھیل کود کا اظہار بھی اس ملک کی شان ہے۔ ان کو دیکھنے، محسوس کرتے اور غور کرنے سے ہمیں ماضی کی رنگا رنگ زندگی اور تہذیب کا پتہ چلتا ہے۔ ٭٭٭

میوزیم اور نوادرات

میوزیم یا عجائب گھر کی سب سے اوّلین مثالیں پرانے مندروں یا پُرانے راجاؤں اور بادشاہوں کے محلات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ قدیم ہندوستان میں مندر نہ صرف پوجا کرنے کے طور پر استعمال کئے جاتے تھے بلکہ وہ آرٹ، رقص اور دست کاری کے بہترین نمونوں کے بھی مظہر تھے۔ مندروں کی دیواروں اور چھتوں پر رنگین تصاویر، لکڑی، دھات اور پتھر کی بنی ہوئی مورتیاں بھی دیکھی جاتی تھیں۔ اسی طرح راجہ اور مہاراجہ بھی اپنے شوق کی خاطر پرانی اشیاء اور آرٹ و فنونِ لطیفہ کے بعض اہم نوادرات محل میں رکھا کرتے تھے۔ لیکن یہ تمام باتیں لاشعوری طور پر تھیں۔ اس وقت تک میوزیم کا تصوّر، اس کی ضروریات، اور مقاصد پیشِ نظر نہیں تھے۔ لیکن دانستہ طور پر میوزیم کے مفہوم کو سامنے رکھ کر کچھ تاریخدانوں اور آثارِ قدیمہ کے محققین نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ ایک ایسی جگہ کا قیام کیا جائے جہاں پوری دنیا کے نوادرات اور ماضی کے ورثہ کو ایک جگہ پر رکھا جائے ـــــ تاکہ ضرورت مند محقق اس کا مطالعہ کرسکیں اور عوام کو اپنے قومی ورثہ کا احساس دلایا جائے۔ انھیں باتوں کے پیشِ نظر ۱۸۱۴ء میں کچھ ہندوستانی اور انگریز عالموں کی مدد سے کلکتہ میں "ایشیاٹک سوسائٹی" (ASIATIC SOCIETY) کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جس میں معدنیات، نباتات، علم حیوانات، انسانی ارتقاء کی مختلف اشیاء نیز آثارِ قدیمہ کے اہم نوادرات کو ایک جگہ رکھا گیا۔ جلد ہی فنِ مصوّری کے نمونے، اہم قلمی

نسخے، ملبوسات اور دوسرے فنونِ لطیفہ کو بھی عوام کی دلچسپی کے لئے وہاں اس طرح رکھا گیا کہ نہ صرف لوگ اس کو دیکھیں بلکہ میوزیم کے طریقوں اور ضابطوں کے مطابق ان تمام اشیاء کی سلیقہ سے نمائش بھی کی گئی۔ انھیں تمام نوادرات کو باقاعدہ ایک میوزیم کی شکل میں پیش کر کے اس کو انڈین میوزیم کلکتہ کا نام دیا گیا۔ جسے بجا طور پر ہندوستان کا سب سے پرانہ اور اولین میوزیم آج بھی کہا جاتا ہے۔ ان تمام کوششوں کے پس پردہ یہ خیال جلوہ گر تھا کہ میوزیم محض ایک تفریحی آماجگاہ ہی نہ ہو جائے۔ بلکہ اس کے ذریعہ سے ملک کے تمام لوگوں کو تاریخ اور ماضی کی صحیح معلومات بھی فراہم ہو سکیں۔ اسکول اور کالج میں تعلیمات تو صرف کتابوں تک محدود رہتی ہیں اور ایک خاص طبقہ ہی تعلیم حاصل کرتا ہے لیکن میوزیم تو ایک ایسی درسگاہ ہے جہاں ہر عمر اور ہر طبقہ کا انسان آکر اپنی آنکھوں سے تاریخ کو دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ کسی چیز کو محض پڑھ کر یا سُن کر وہ تاثر ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا ہے جو کسی شئے کو دیکھنے اور پرکھنے کے بعد ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں سر ولیم جون کی کوششیں ۱۷۸۴ء سے ہی جاری تھیں جو ۱۸۱۴ء میں حقیقت کی شکل میں سامنے آئیں، اور باقاعدہ طور پر ۱۸۵۷ء میں انڈین میوزیم کلکتہ کی عمارت تعمیر ہوئی۔ بعد میں مدراس اور بمبئی میں بھی ۱۹ویں صدی تک کئی میوزیم سامنے آ گئے۔

ملک میں مختلف میوزیم کے فروغ اور ترقی کے سلسلہ میں لارڈ کرزن کا نام بھی بہت اہم ہے۔ اس کے بعد بیسویں صدی کی ابتداء میں آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا کے ڈائرکٹر جنرل جان مارشل نے اپنی توجہ سے ملک کے مختلف مقامات پر میوزیم کھولنے کی مہم شروع کی جس کے نتیجہ میں اجمیر، بیجاپور، ڈھاکہ، جودھپور، کھجوراہو، گوالیور اور سارناتھ جیسی جگہوں پر عجائب گھروں کا قیام عمل میں آیا اور ۱۹۰۲ء میں جان مارشل نے میوزیم کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر دیا۔ وہ میوزیم جو آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا کے زیر نگرانی ایسی جگہوں پر بنوائے گئے جہاں کھدائی یا کسی اور ذریعہ سے نوادرات حاصل ہوئے۔ ایسے میوزیم "سائٹ میوزیم" کہلائے۔ جن میں سب سے ابتدائی میوزیم سارناتھ ۱۹۰۴ء میں نالندہ ۱۹۱۷ء میں اور لال قلعہ ۱۹۱۴ء میں سامنے آئے۔ اب سائٹ میوزیم کی کل تعداد جو آرکیولوجی کے

تحت ہیں ۴۳ ہیں۔ اس کے علاوہ میونسپل کارپوریشن میوزیم، اسٹیٹ میوزیم، یونیورسٹی میوزیم، مختلف اداروں اور انفرادی لوگوں کے میوزیم، صنعتی اور سائنسی میوزیم، ماحولیات کے میوزیم، غرض کہ ہر شعبہ اور ہر مضمون کے میوزیم بنائے جاتے رہے ہیں۔ موٹے طور پہ میوزیم کو تین اقسام میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو ہر طرح اور ہر عہد کے نوادرات کا مرکز ہوتا ہے، جیسے کلکتہ کا انڈین میوزیم یا دہلی کا نیشنل میوزیم، دوسرے وہ جو کسی خاص شخصیت کے نام سے منسوب ہو۔ جیسے گاندھی یا نہرو میوزیم اور تیسری قسم کے میوزیم وہ ہیں جو کسی خاص طرح کا سامان رکھتے ہیں۔ جیسے کرافٹ میوزیم، یا اسلحہ کا میوزیم وغیرہ وغیرہ ــــ ان تمام میوزیم میں جو ایک بات قدر مشترک ہے وہ یہ کہ وہاں رکھی ہوئی اشیاء کو کس طرح پیش کیا گیا ہے؟ جس کے لئے شوکیس، لائٹ، پس منظر اور لیبل کی بہت اہمیت ہے اور یہی تمام باتیں میوزیم کی ٹیکنیک میں شامل ہیں ــــ وہ میوزیم جہاں پرانی اشیاء رکھی ہوتی ہیں۔ ایسی چیزوں کو تاریخ کی اصطلاح میں انٹی کیوٹی (ANTIQUITY) کہا جاتا ہے۔ انٹی کیوٹی دراصل ہر اس شی کو کہا جاتا ہے جو ایک سو سال سے زیادہ پرانی ہو جائے۔ چاہے وہ مورتی ہو، فن مصوری کا کوئی نمونہ ہو، لکڑی، سکّہ، کپڑا، یا کوئی مزین قلمی نسخہ ہو یا پرانی عمارتوں پر سجے ہوتے پتھر کے نمونے ہوں۔ حکومت ہند نے ۱۹۷۲ء میں ایک ایکٹ نافذ کیا جس کی رو سے ایسی تمام چیزیں جو سو سال سے زیادہ پرانی ہیں ان کو بلا اجازت ملک سے باہر لے جانا ممنوع قرار دیدیا۔ یہ اس وجہ سے کیا گیا کہ ملک کا بیشتر قیمتی سرمایہ اور قومی ورثہ غیر ممالک میں زیادہ قیمت پہ بیچا جانے لگا اور ملک کے بعض میوزیم سے نوادرات چوری ہونے لگیں۔ ساتھ ہی حکومت نے یہ قانون بھی نافذ کر دیا کہ ملک کے اندر جس کسی کے پاس بھی سو سال پرانی نوادرات موجود ہیں ان کا رجسٹریشن کروانا ضروری ہے تاکہ حکومت کو اس کا علم ہو سکے کہ ہندوستان میں لوگوں کے پاس کس طرح کا اور کتنا قومی ورثہ موجود ہے۔ اس پابندی سے صرف ان نوادرات کو محفوظ رکھا گیا جو میوزیم یا یونیورسٹی یا سرکاری قبضہ میں ہیں۔ اس ایکٹ سے ایک طرف تو یہ فائدہ ہوا کہ ملک کا قیمتی سامان باہر جانے سے رک گیا مگر ساتھ ہی یہ نقصان بھی ہونے لگا کہ وسیع پیمانے پر اسمگلنگ اور نقلی سامان تیار ہونے لگا۔ پرانی نقاد

پرانی مورتیوں اور پرانے قلمی نسخوں کی نقل بازاروں میں بننے لگی اور نہ جاننے والے شوقین لوگوں کو اصل کہہ کر فروخت کیا جانے لگا۔ اس گڑبڑ کو روکنے کے لئے حکومتِ ہند نے آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا پر یہ ذمہ داری عائد کی کہ اس طرح کا کوئی بھی مشتبہ سامان جب نظر میں آئے تو اس کی تحقیق کی جائے اور اکسپرٹ تاریخ دانوں کی رپورٹ کے بعد یہ سرٹیفیکٹ دیا جائے کہ وہ سامان پرانہ ہے یا نہیں ـــــ اس سلسلہ میں کبھی کبھار بعض ماہرین کو بھی دھوکہ ہو جاتا ہے کہ وہ چیز اصلی ہے یا نقلی، موٹے طور پر اس کی جانچ کے کئی طریقے ہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ سامان کے اسٹائل اور شکل وشباہت سے اندازہ لگایا جاتا ہے۔ کبھی کبھار اس پر تاریخ یا بادشاہ کا نام لکھا مل جاتا ہے کہ وہ کس عہد کا سامان ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود بھی دھوکہ کا امکان رہ جاتا ہے۔ اس کا سب سے اہم طریقہ یہ ہے کہ اس سامان کی سائنسی جانچ کرنے کے بعد ہی صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

پرانے سامان یا نوادرات کی نقل کو بنائے جانے سے روکنے کے لئے حکومت کو چاہیئے کہ فوراً اس قسم کا ایک قانون لاگو کردے کہ جو لوگ بھی ایسا کرتے ہیں وہ صاف لفظوں میں سامان پر یہ لکھ دیں کہ وہ سامان نقلی ہے۔ مزید یہ بھی کہ وہ کس تاریخ کو اور کس کے ذریعہ تیار کیا گیا ہے۔ اس کو عمل میں لانے سے کم از کم ایسی تمام دکانوں پر پابندی لاحق ہو جائے گی جو کھلے عام نقلی سامان بیچا کرتے ہیں اور انھیں روکنے والا کوئی نہیں۔

پرانی اشیاء کا چربہ اتارنا، یا اُس کی نقل اتارنا کوئی جرم نہیں۔ کیوں کہ ایسا تو زمانۂ وسطیٰ سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ سلطنت اور مغل درباروں میں فنِ مصوری اور قلمی نسخوں کی خوب کاپی کی جاتی تھی، چاہے وہ شاہ نامۂ فردوسی ہو، کلیلہ و دمنہ ہو، بابرنامہ ہو، یا کوئی بھی پرانہ نسخہ ہو۔ لوگوں کو فنِ مصوری، فنِ خطاطی یا فنِ مجسمہ سازی سے شوق اور لگاؤ تھا۔ لوگوں اور فنکاروں کی صلاحیتوں کو روکنا کسی طرح بھی جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اسی طرح تو ہندوستانی آرٹ، کلچر اور قومی ورثہ کو فروغ ملا ہے۔ آج جو سامان بنایا گیا ہے، وہی تو سو سال بعد اینٹک کہلائے گا۔ لیکن اصل سامان کی نقل اُتار کر اس کو اصلی کہہ کر بھولے بھالے اور آرٹ کے شیدائیوں کو زیادہ داموں میں فروخت کرنا نہ صرف اخلاقی جُرم بھی ہے، بلکہ قانونی دھوکہ بازی بھی۔

کوہِ نور ہیرہ

ہیروں اور نگینوں کی کہانی بہت پرانی ہے۔ ان کے انسانی زندگی پر اچھے اور بُرے اثرات بھی دیکھے گئے ہیں۔ انسانی معاشرہ میں ہمیشہ سے قیمتی پتھروں اور ہیرے جواہرات کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ بادشاہ امراء اور شہزادیوں و عورتوں میں یہ زیور کے طور پر بھی استعمال کیے جاتے رہے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اب تک کی دریافت کے مطابق دنیا کا سب سے بڑا ہیرا پرتگال کے بادشاہ کے پاس تھا جو برازیل کی کھان سے ملا تھا۔ جس کا وزن پانچ سو گرام تھا۔ لیکن ۱۷ ویں صدی میں ذرا سی لاپرواہی کے باعث بادشاہ کے تاج سے گر کر یہ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا اور تبھی سے پرتگال بادشاہوں کی طاقت کمزور پڑتے پڑتے ختم ہوگئی۔ اسی طرح روس کے ایک بادشاہ کے تخت میں ایک اور قیمتی ہیرا جُڑا ہوا تھا جس کی چمک کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ کوئی بھی شخص ننگی آنکھوں سے سورج کی روشنی میں اس ہیرے کی تاب نہیں لاسکتا تھا۔ اس کا وزن ۷۷۹ قیراط اور قیمت آج سے تین سو سال پہلے ۴۸۵۴۷۲۸ (اڑھتالیس لاکھ، چون ہزار، سات سو اٹھائیس) پونڈ تھی۔ اس ہیرے کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مالا بار کے ساحلی علاقوں پر ۱۶ ویں صدی میں کوئی تاجر فرانس سے آیا اور ایک مندر کی مورتی کی آنکھ سے چرا کر لے گیا۔ اس ہیرے کی تاثیر یہ تھی کہ بادشاہ ہیرے سے چپاں تخت پر فائز رہتے وقت کسی طرح کی پریشانی، بیماری، اور گھبراہٹ سے محفوظ رہتا تھا۔ مگر یہ ہیرا بھی ۱۸ ویں صدی کے وسط میں تراشے جاتے ہوئے گر کر ٹوٹ گیا ـــــ ایران کے بادشاہ ہُرمزاور جمشید کے پاس

بھی ایک بیش قیمت ہیرا تھا جس کی تاثیر یہ تھی کہ اس کی موجودگی میں کوئی بھی دشمن فتح نہیں حاصل کر سکتا تھا۔

یہ تمام باتیں تو ہیروں اور قیمتی پتھروں کی تاثیر کی ہیں۔ لیکن ان سب ہیروں سے بھی زیادہ قیمتی، زیادہ اہم اور تاریخی اہمیت کا حامل ایک ہیرہ ہے جس کو دنیا آج بھی "کوہِ نور" ہیرے کے نام سے جانتی ہے۔ کوہِ نور ہیرے کی دریافت ہندوستان میں ہوئی۔ اور ایک روایت کے مطابق ہزاروں سال سے ہندوستان کے مختلف بادشاہوں اور راجاؤں کے پاس سے ہوتا ہوا پنجاب کے راجہ رنجیت سنگھ کے پاس اور پھر برٹش حکمرانوں کے ہندوستان پر قابض ہونے کے ساتھ ہی کوہِ نور انگلستان چلا گیا ——— اس ہیرے کی دریافت کی صحیح تاریخ تو نہیں ملتی ہے مگر ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ ہیرہ کرشن جی کے زمانے میں گوداوری دریا کے کنارے جنوب بھارت میں ایک عام آدمی کو کسی کھان میں پڑا مل گیا، اس سے یہ ہیرہ اس وقت کے راجہ کرن کے پاس چلا گیا جو کہ مہابھارت کی رزمیہ داستان کا ایک ہیرو بھی تھا۔ یہ راجہ عیسیٰ مسیح سے تین ہزار سال پہلے ہستناپور کے علاقہ کا حاکم تھا۔ ایران کی تاریخ کے حوالہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ کوہ نور اور دریائے نور ہیرے ایک ہی وقت میں ایران سے دستیاب ہوئے تھے جو ایرانی بادشاہ "افراسیاب" کے پاس تھا۔ لیکن ۱۶ ویں صدی کے ایک ہندوستانی قلمی نسخہ میں یہ درج ہے کہ یہ کوہِ نور ہیرہ راجہ بکرماجیت کے پاس تھا جو کسی تاجر کو گولکنڈہ کی کھان سے ملا تھا۔ جب ۱۳ ویں صدی میں غوری اور غلام خاندان کے بادشاہ ہندوستان میں حاکم ہوئے تو سلسلہ وار غلام، خلجی، تغلق، سید اور لودھی بادشاہوں کے تاج کی زینت بنا۔ اور ۱۵۲۶ء میں ہمایوں نے اپنے والد ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کو بطور ہدیہ پیش کیا۔

مغل بادشاہوں سے پہلے تک کی تاریخ کوہِ نور ہیرے کے بارے میں مستند نہیں ہے۔ لیکن ہمایوں بادشاہ اور اس کے بعد یہ ہیرا کہاں اور کس حال میں رہا اس کے بارے میں پورے حوالے ملتے ہیں ——— "آئین اکبری" میں ابو الفضل لکھتا ہے کہ جب بچپن میں ہمایوں شہزادہ سخت بیمار پڑ گیا اور تمام حکیموں نے اس کی صحت یابی سے مایوسی ظاہر کر دی تو ایک

صوفی نے بابر سے یہ کہا کہ تمہارے پاس جو سب سے زیادہ قیمتی چیز ہو اس کو اللہ کے راستے میں بخش دو، اس صوفی کا اشارہ بھی اس کوہِ نور کی طرف تھا۔ مگر بابر بادشاہ نے بجائے اس بیش قیمت ہیرے کے اپنی جان کو اللہ کے راستے میں قربان کردیا۔ اور اس طرح ہمایوں تو صحت یاب ہوگیا مگر بابر کی جان چلی گئی۔

شہاب الدین محمد شاہ جہاں بادشاہ غازی کے عہد کا ایک فرانسیسی سفیر "فرانسوا برنیر" اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ دلّی کے قلعہ معلّی (لال قلعہ) میں گولکنڈہ کے بادشاہ عبداللہ قطب شاہ کا ایک وزیر، میر جملہ نامی شاہ جہاں کے پاس آیا اور اپنے شاہ کی طرف سے کوہِ نور ہیرہ تحفہ کے طور پر پیش کیا۔ اس ہیرے کے بارے میں "برنیر" مزید لکھتا ہے کہ یہ ہیرا ایک ایسا بے مثال اور بیش قیمت تھا جس کی نظیر پوری دنیا میں کہیں نہیں ملتی ہے۔ اور پھر شاہ جہاں بادشاہ نے ایک شاندار جشن کے بعد کوہ نور کو اپنے شاہی تخت، تخت طاؤس میں مزین کر لیا۔۔ پھر محی الدین محمد اورنگ زیب عرف عالمگیر بادشاہ نے اس کی اصلیت جاننے کے لئے ایک فرانسیسی سوداگر اور جوہری کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی۔ اس کا نام "تورنیر" تھا۔ TAVERNIER جس نے سنہ ۱۶۶۵ء میں کوہ نور کو دیکھ کر اس کی قیمت اور وزن کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا کہ تراش اور خراش کے بعد اس ہیرے کا وزن ۳۰۳ رتی یعنی ۲۸۰ قیراط ہے۔ اس تاجر نے بابر کی خودنوشت سوانح حیات تزک بابری (بابرنامہ) کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس نے اس کتاب میں بھی اسی کوہِ نور ہیرے کے بارے میں پڑھا تھا جس کی قیمت کے بارے میں خود بابر کا خیال تھا کہ اُس وقت کے پوری دنیا کے تمام لوگوں کے ایک دن کے کھانے کی رقم کے برابر اس کی قیمت ہوسکتی ہے۔ خود تورنیر کا اندازہ تھا کہ اگر دس دس گرام کے (۱۱،۷۲۳،۲۷۸) ایک کروڑ سترہ لاکھ، تئیس ہزار، دو سو اٹھتر سونے کے سکّے بھی اس کے برابر رکھے جائیں تو بھی اس کی قیمت پوری نہ ہوگی۔ اورنگ زیب کے بعد، محمد شاہ عرف رنگیلا کے عہد میں سنہ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے ایران سے آکر ہندوستان کی دارالسلطنت دہلی پر حملہ کردیا۔ کہا جاتا ہے کہ نادر شاہ کے اس حملہ کا ایک اہم سبب کوہِ نور ہیرے کو حاصل کرنا بھی تھا۔ محمد شاہ سب کچھ ہار کر کوہ نور کو اپنے قبضہ سے نہ جانے دینا

چاہتا تھا اس لئے چھپا کر اپنی پگڑی میں لئے جا رہا تھا۔ نادر شاہ کو اس بات کا اندازہ ہو گیا اور اس نے فوراً یہ کہا کہ آؤ ہم دونوں پگڑی بھی بدل لیں اور اس طرح ہندوستان کا یہ بے مثال کوہِ نور ہیرہ نادر شاہ کے ہمراہ ایران چلا گیا۔

ایک روایت کے مطابق اس یکتائے زمانہ ہیرے کو "کوہ نور" کا نام نادر شاہ نے ہی دیا تھا۔ کیوں کہ اب تک اس کو صرف ایک بہت قیمتی اور بڑے ہیرے کے نام سے جانا جاتا تھا۔ جس طرح ایران کے ایک ہیرے کا نام دریائے نور یعنی نور کا دریا تھا اسی مناسبت سے نادر شاہ نے اس ہیرے کو "کوہِ نور" یعنی "نور کا پہاڑ" کا نام دیا۔ پھر ۱۷۴۷ء میں جب نادر شاہ کا خراسان میں قتل ہو گیا تو حکومت کے ساتھ ساتھ یہ ہیرا بھی اس کے بھتیجے علی قلی خاں المعروف علی شاہ کے قبضہ میں آ گیا۔ مگر حکومت اور طاقت کے لالچ میں نادر شاہ کے پوتے، شاہ رخ مرزا کے ہاتھوں علی شاہ بھی اندھا کر کے مار ڈالا گیا اور کوہِ نور شاہ رُخ کے پاس آ گیا۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں شاہ رخ نے کوہِ نور ہیرے کو اپنے خصوصی مصاحب احمد شاہ درّانی کو ۱۷۵۱ء میں دیدیا۔ احمد شاہ درّانی کی وفات کے بعد ۱۷۹۳ء میں اس کے بیٹے نے تخت و تاج کے ساتھ ساتھ کوہِ نور کو بھی اپنی ملکیت میں لے لیا۔ مگر اس کے دوسرے بھائی نے کوہِ نور کو حاصل کرنے کی ہوس میں اپنے بڑے بھائی کو بھی اندھا کر دیا۔ اور آخر کار احمد شاہ درّانی کے سب سے چھوٹے بیٹے شاہ شجاع کو ایران کی بادشاہت کے ساتھ ساتھ کوہِ نور بھی حاصل ہو گیا۔ لیکن ایران میں شاہ شجاع کی طاقت کمزور پڑ گئی تھی اور ادھر ہندوستان میں راجہ رنجیت سنگھ کا رعب اور دبدبہ نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ آس پاس کے پڑوسی ممالک میں بھی زور پکڑ تا جا رہا تھا۔ ۱۸۱۳ء میں شاہ شجاع کو نصف قیدی اور نصف مہمان کی حیثیت سے جب لاہور لایا گیا تو راجہ رنجیت سنگھ کی طرف سے یہ پیش کش کی گئی کہ اس کی امان اسی میں ہے کہ وہ کوہِ نور ہیرہ واپس ہندوستان میں رنجیت سنگھ کو کر دے۔ چار و ناچار یہ بات ایرانی بادشاہ کو ماننی پڑی اور یہ مشہور زمانہ ہیرا پھر بھارت کی سرزمین پر واپس لوٹ آیا۔ ایک دعوت کے دوران جب شاہ شجاع کی بیگم وفا بیگم سے اس کوہِ نور ہیرے کی قیمت

کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ "کسی پتھر کو اگر توانا اور مضبوط مرد چاروں سمتوں اور بلندی کی طرف پھینکے تو اس تمام حلقہ میں جتنی دولت سما سکتی ہو اس کی قیمت کے برابر یہ ہیرہ ہے"، ہیرے کی ادائیگی سے قبل ایک دلچسپ رسم پوری کی گئی۔ راجہ رنجیت سنگھ خود ارجون ۱۸۱۳ء کو اپنے خاص مصاحبین اور لشکر جرار کے ساتھ افغانستان کے شہر کابل پہونچے۔ وہاں ان کا خیر مقدم کیا گیا اور جب دیر ہونے لگی تو راجہ نے اپنے آنے کی وجہ پر زور دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک خوبصورت سے گنگا جمنی بکس میں رکھا ہوا کوہِ نور لایا گیا، اور راجہ رنجیت سنگھ کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ دونوں امرا میں آپسی دوستی کا اعلان ہوا اور ایک دوسرے نے اپنی اپنی پگڑیاں بدلیں۔ واپس ہندوستان آنے پر امرتسر میں راجہ رنجیت نے کوہِ نور کی آمد پر شاندار جشن کا اہتمام کیا، اور عوام کو دیکھنے کا موقع عطا کیا گیا۔

رنجیت سنگھ کو اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ دنیا کا سب سے قیمتی اور نایاب کوہ نور ہیرہ اب اس کی ملکیت میں ہے اُس نے بڑے اہتمام سے اس ہیرے کو اپنی پگڑی میں سجایا اور خاص خاص موقعوں پر اُسے استعمال کیا کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنی موت سے صرف دو دن پہلے راجہ رنجیت سنگھ نے اپنی دولت کا ایک بڑا حصہ جگن ناتھ کے مندر میں چڑھاوے کے طور پر دے دیا وہ کوہِ نور کو بھی بخشنا چاہتا تھا مگر توشہ خانہ کے محافظ بیل رام نے یہ کہہ کر اس ہیرے کو محفوظ رکھا کہ یہ تو حکومت کی امانت ہے اور اس کو صرف بادشاہ کے پاس ہی رہنا چاہیئے۔

۱۸۴۹ء میں مہاراجہ دلیپ سنگھ پنجاب اور سکھ حکمران کی حیثیت سے سامنے آیا مگر اس وقت ایسٹ انڈیا کمپنی اور برٹش حکمرانوں کا ہندوستان میں غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔ انگریز حکمرانوں کی آنکھیں بھی اس کوہِ نور پر لگی ہوئی تھیں۔ پنجاب کی باگ ڈور بھی انگریزوں کے ہاتھ میں آگئی، راجہ دلیپ سنگھ مغلوب ہو گیا اور کوہِ نور ہیرا انگریز افسروں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ ہندوستان میں لارڈ ڈلہوزی نے یہ ہیرا امرتسر سے دہلی اور پھر بمبئی کے لئے جان لارنس کی خصوصی نگرانی میں ارسال کرا دیا۔ لندن میں کوہِ نور ہیرے کے دیدار کا

بے صبری سے انتظار ہو رہا تھا۔ اس طرح ۳ر جولائی ۱۸۵۰ء کو یہ کوہ نور، بمبئی سے لندن بذریعہ بحری جہاز پہونچا اور ملکۂ برطانیہ کے تاج کی زینت بنا۔ ۱۸۵۱ء میں لندن کی سرزمین پر ہونے والی عظیم نمائش میں اس کوہ نور رکھا گیا تاکہ انگلستان کے باشندے بھی اس نادالعصر ہیرے کا دیدار کر سکیں۔ ۱۸۵۲ء میں کوہ نور کو دوبارہ فرنگی جوہریوں کے ذریعہ ترشوایا گیا تاکہ یہ اور بھی نکھر جائے۔ اس کو تراشنے کا کام متواتر ۳۸ دنوں تک چلتا رہا اور ۱۸۰۰۰ پونڈ کے خرچ سے اس کوہ نور کو پھر سے تیار کیا گیا۔ ایک زمانے تک اس بات کی کوشش جاری رہی کہ اس ہیرے کو ہندوستان واپس بھیجا جائے کیونکہ برٹش حکمرانوں نے اس کو زبردستی لیا ہے مگر انگریز سرکار نے یہ جواز پیش کیا کہ کوہ نور مہاراجہ دلیپ سنگھ نے بطور تحفہ لندن کی ملکہ کو عطا کیا ہے اس لئے تحفہ کو واپس لوٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ۱۸۸۲ء میں ایک بار پھر انگلستان کے کچھ جوہریوں نے کوہ نور میں مزید تراش خراش کرنی چاہی مگر ذرا سی چوک کی وجہ سے کوہ نور میں ایک خراش آ گئی جس سے اس کی خوبصورتی میں وہ بات نہیں رہی جو پہلے تھی۔ اس کا وزن بھی گھٹ کر کم ہو گیا۔

آج بھی یہ کوہ نور ہیرا برطانیہ کی ملکہ "کوئین الزبیتھ" کے تاج میں جڑا ہوا ہے۔ جس کو وہ خاص موقع پر استعمال کرتی رہتی ہیں۔

کوہ نور ہیرے کی قیمت اور وزن کے بارے میں ہر دور میں مختلف رائیں پیش کی جاتی رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ کنس کے پاس جب یہ ہیرا تھا تو اس وقت اس کا وزن ۸۲ ماشہ تھا۔ اور پوری دنیا کی دولت کا چوتھائی حصہ اس کی قیمت لگائی گئی تھی۔ یہ ہیرا دودھ کی طرح سفید رنگ کا تھا جس پر سورج کی روشنی پڑتے ہی اس میں سے رنگ برنگی کرنیں پھوٹنے لگتی تھیں۔ اور کوئی بھی شخص اس کو دن میں دیکھ نہیں سکتا۔ بابر کا بیان ہے کہ ترکی، غزنہ، عرب اور ایران کے تمام ہیروں کے عوض یہ ایک کوہ نور کافی ہے۔ اس کا وزن بابر نے "تزک بابری میں ۱۱ متقال لکھا ہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے جب اس کا وزن کرا دیا تو یہ گھٹ کر ۲۹ ماشہ رہ گیا تھا۔ نادر شاہ کا بیان ہے کہ جو چیز بے مثال ہو اس کی کوئی قیمت نہیں لگائی جا سکتی۔ البتہ جس کے

بازوؤں میں دم اور تلوار میں طاقت ہو وہی اس کوہِ نور کا مالک بن سکتا ہے۔ شاہ جہاں بادشاہ کو بھی اس بات کا فخر حاصل تھا کہ دنیا کا سب سے قیمتی ہیرا اس کے تخت میں جڑا ہوا ہے۔ آج ملکۂ الزبتھ کے پاس کوہ نور ہیرا صرف ۲۰۰ گرام وزن کے برابر رہ گیا ہے۔

اس کوہِ نور کی تاثیر کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جس کی پیدائش دوشنبہ کی صبح کو صبح صادق کے وقت چاند کے مہینہ کی ۱۱ تاریخ کو ہوئی ہو اس کو زیادہ راس آتا ہے۔ بصورت دیگر مضر اثرات بھی پیدا کر سکتا ہے۔

تختِ طاؤس

شہاب الدّین محمد شاہ جہاں بادشاہ غازی کا دَور مغلیہ سلطنت کا ایک سنہری دَور کہلاتا ہے۔ اس عہد میں شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ قلعہ اور مسجدیں بنوائی گئیں، مقبرے اور مغلیہ آرٹ و آرکیٹکچر کا فروغ ہوا تو ساتھ ہی ایک ایسے تخت کی تعمیر کروائی گئی، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس وقت تک نہ تو بغداد، ترکی اور ایران کے بادشاہوں کے پاس ایسا کوئی تختِ شاہی تھا اور نہ ہی اس کے بعد یہ دولت کسی بھی بادشاہ کو نصیب ہوئی۔ اس تختِ شاہی کو عرفِ عام میں "تختِ طاؤس" کہا جاتا ہے۔ مختلف قلمی نسخوں اور اس دَور کے معتبر مؤرخین کا کہنا ہے کہ شہنشاہ شاہ جہاں نے جیسے ہی مغلیہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ انھیں خیال آیا کہ ایسا تختِ شاہی بنوایا جائے جو زمانے میں یکتا ہو۔ چنانچہ خزانے کے دو کروڑ روپے کی مالیت کے جواہرات اور شاہی محل کے جواہرات میں سے پچاس ہزار کے مثقال کے وزن کے لعل، زمرّد، یاقوت، اور موتی جو قیمت میں ۸۶ لاکھ روپے کے برابر تھے۔ اس تختِ طاؤس کی تعمیر کے لئے عطا کئے گئے۔ اور اس کام کے لئے اپنے خاص مصاحب اور داروغہ 'بے بدل خان' کو مقرر کیا گیا۔ یہ داروغہ خود بھی ایک ذہین کاریگر تھا، جس نے ایران، بغداد، غزنہ، ترکی اور مغربی ممالک کے بہترین کاریگروں کی سرکردگی میں تختِ طاؤس کو بنوانے کا کام شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک کروڑ روپے کی لاگت سے، سال

ی مدت میں اس بے مثال اور نادر وقت تخت کو تیار کروایا ـــ یہ تختِ طاؤس مستطیل شکل کا ہے۔ اس کی چھت آٹھ مینا کار ستونوں پر قائم ہے۔ جس پر دو طلائی مینا کاری کے طاؤس (مور) پر پھیلائے ہوئے آمنے سامنے کھڑے ہیں Peacock Throne۔ اُن کے پروں کو زمرد سے بنایا گیا ہے۔ دونوں مور اپنی اپنی چونچ میں ایک ایک لعل یشب لئے ہوئے ہیں جو انگاروں کی طرح دہکتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی لمبائی سوا تین ہاتھ، چوڑائی ڈھائی اور چھت تک بلندی پانچ ہاتھ ہے ـــ ان پر لعل، یاقوت، زمرد اور فرنگی کاریگروں کے تراشے ہوئے ہیروں سے نقش و نگار بنائے گئے ہیں ـــ اس کی صناعی اس قدر دیدہ زیب اور لاجواب ہے کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ پورے تخت کو ٹھوس سونے سے آراستہ کیا گیا ہے۔ جگہ جگہ پر لعل اور قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہیں۔ تخت کے اندرونی حصہ میں اس دور کے ملک الشعراء حاجی محمد جان قدسی کے لکھے ہوئے اشعار چسپاں ہیں۔ جن پر مینا کاری کا کام ہے۔ اور دورِ شاہ جہانی کے تقریباً ہر درباری شاعر نے تختِ طاؤس کو دیکھ کر کچھ نہ کچھ توصیفی اشعار ضرور لکھے ہیں۔

اس دور کے مشہور مؤرخ ابو صالح کنبوہ اپنی تصنیف "شاہ جہاں نامہ" میں تختِ طاؤس کی بابت لکھتے ہیں کہ جب سات سال کی متواتر محنت اور کروڑوں کی لاگت سے تختِ طاؤس مکمل ہوا تو اس پر بادشاہ سلامت کی تخت نشینی کی تاریخ متعین کی جانے لگی۔ اس وقت کے نجومیوں نے تخت پر جلوس کی تاریخ ۲۲ر مارچ ۱۶۳۵ء مقرر کی تھی۔ لیکن اس وقت تک دہلی کا قلعہ معلی جسے اب عرفِ عام میں لال قلعہ کہا جاتا ہے، زیرِ تعمیر تھا اور مکمل نہیں ہوا تھا۔ اسی لئے بادشاہ غازی نے اسی تاریخ کو مبارک جان کر لال قلعہ کے بجائے آگرہ کے سامی گھاٹ پر ہی جشنِ نوروز منانے کا حکم کیا۔ اور پھر تختِ طاؤس پر جلوہ افروز ہوئے۔

تختِ طاؤس پر جلوس کا وقت شام کا تھا۔ جب ستارے آسمان پر تھے اور فضا بالکل صاف تھی۔ اس مبارک تاریخ میں ایک ساتھ تین عیدیں جمع ہو گئی تھیں۔ یعنی عید الفطر، عید نوروز، اور حضرت صاحبقران ثانی شاہ جہاں بادشاہ کی تختِ طاؤس پر جلوہ نمائی ـــ ایک شاندار جشن کے دوران یہ فریضہ انجام دیا گیا۔ پورے ماحول میں عود و عنبر اور خوشبو

رچی بسی تھی۔ اس جشن میں سب سے پہلے بادشاہ نے ولی عہد دارا شکوہ کو خلعتِ خاصہ، موتیوں سے بھری لڑکری اور دو لاکھ روپے بطور انعام دیئے۔۔۔ پھر شہزادہ شاہ شجاع اور شہزادہ اورنگ زیب، دونوں کو خلعت خاصہ اور موتیوں سے بھری ہوئی ٹوکری اور ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ روپے ہر ایک کو عطا کئے۔۔۔ آصف خاں کو بھی خلعت اور مرصع شمشیر کے علاوہ خانخاناں کا خطاب اور سپہ سالاری کا عظیم ترین منصب عطا فرمایا۔ اور متواتر ۹۰ دنوں تک یہ جشن منایا جاتا رہا۔ جس میں بہت سے دوسرے مصاحبین اور عہدہ داروں کو منصب اور اعزازات سے نوازا جاتا رہا۔ اور اسی جشن کے موقع پر شہزادہ دارشکوہ کے گھر میں ایک اور مغلیہ چراغ روشن ہوا جس کا نام خود شاہ جہاں بادشاہ غازی نے سلیمان شکوہ رکھا، اور اس طرح شاہ جہاں بادشاہ نے تختِ طاؤس پر بیٹھ کر سخاوت و فیاضی کے تمام دروازے کھول دیئے اور تمام امراء و شرکار کے علاوہ بھی مسکینوں اور حاجت مندوں نے اپنی جھولیاں بھر لیں۔۔۔

اورنگ زیب بادشاہ کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو جاتا ہے اور ان میں سے کسی کے پاس بھی اپنے پرکھوں کی عطا کی ہوئی اس دولت اور شان و شوکت کو برقرار رکھنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ تمام دنیا کی آنکھ مغلیہ دولت پر لگنے لگی اور آخرکار نادرشاہ کے ہاتھوں ۱۷۳۹ء میں نہ صرف دلی اور لال قلعہ کا سہاگ اُجڑ گیا بلکہ تختِ طاؤس کو بھی نوچ کھسوٹ لیا گیا۔ یہ نادر تختِ طاؤس لال قلعہ سے ایران ہوتا ہوا دربدر کی ٹھوکریں کھاتا رہا۔ اور جس کا بھی بس چلا، اس نے اس پر لگے قیمتی جواہرات اور سونے کو نوچ لیا۔ اور آج حالت یہ ہے کہ یہ جنسِ نایاب اب ڈھونڈنے سے بھی کہیں نہیں ملتا ہے۔

ٹیپو سلطان کی تلوار

تلوار انسانی زندگی کی نگہبان بھی ہے، اور جان لیوا بھی۔ یہ دوست بھی ہے اور دشمن بھی۔ تلوار اپنے مختلف مدارج کو طے کرتی ہوئی تاریخ کے تاریک دور یعنی Pre Historic Age سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ بڑی بڑی لڑائیوں کی ہار جیت کا فیصلہ بھی تلوار کی طاقت سے کیا جاتا تھا۔ اس کو طرح طرح کے نام دیئے گئے۔ شمشیر، تیغ، تلوار، کھانڈا، پٹا، آدی، ایدا کٹی (Ayda Kathi) آسی، ذوالفقار اور سروہی۔ تلواروں کے اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ٹیپو سلطان کی تلوار بھی ہے۔ اٹھارویں صدی کے نصف اواخر میں جنوبی ہندوستان میں ٹیپو سلطان بن حیدر علی نے عین اس دور میں ہندوستان کی تاریخ میں ایک سنہری باب کا اضافہ کیا۔ جب پورا ملک ایک انتشار کے دور سے گزر رہا تھا۔ برٹش حکمرانوں کا پورے ملک میں غلبہ ہوتا جا رہا تھا۔ مغل حکومت زوال پذیر تھی۔ ٹیپو سلطان نے اس افراتفری کے دور میں پورے جنوبی ہند کی طاقتوں کو یکجا کیا اور تمام جانباز سپاہیوں کو اس پر آمادہ کیا کہ تلوار ان کی زندگی کی امین اور نگہبان ہے۔ تلوار کے بل پر اگر انسان چاہے تو ہر برائی کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ٹیپو نے اپنا پایۂ تخت میسور میں سرنگا پٹم کو بنایا، اور تلوار کی طاقت کے بل پر برٹش سامراج کی ہندوستان میں ایک نہ چلنے دی۔ ٹیپو سلطان کی بابت کہا جاتا ہے کہ اسے تیغ زنی اور شمشیر بازی کا بے انتہا شوق تھا۔ اپنی ابتدائی عمر ہی سے اس کو اس فن میں مہارت ہو گئی تھی۔ کئی سو مسلح لوگوں کے بیچ سے وہ محض تلوار بازی کے

بل پر نج نکلتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسے بیک وقت کئی تلواریں رکھنے کا شوق تھا۔ ایک روایت کے مطابق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک ساتھ ٹیپو کے پاس ۱۳ تلواریں رہتی تھیں جنہیں وہ حسبِ ضرورت استعمال کیا کرتا تھا۔ اس کو شیر کا خطاب دیا گیا تھا اور شائد اس وجہ سے اس نے اپنا شناختی نشان بھی شیر کا سر بنایا۔ اس کی بیشتر تلواروں پر شیر کا سر بنا ہوا پایا جاتا ہے۔ آج بھی یورپ اور ہندوستان کے بیشتر میوزیم میں ٹیپو سلطان کی تلواریں موجود ہیں۔ دہلی کے نیشنل میوزیم، حیدر آباد کے سالار جنگ میوزیم، دریا دولت میوزیم سرنگاپٹم اور وکٹوریہ میموریل میوزیم کلکتہ میں بھی ٹیپو کی تلواروں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ٹیپو سلطان کی تلواریں کچھ انفرادی خصوصیت کی حامل ہیں۔ عام تلواروں کی شکل و شباہت سے ذرا ہٹ کر اس نے تلوار کی بلیڈ اور دستہ کو اپنے ڈھنگ سے بنوانے کی کوشش کی۔ ایسی تلواروں کو اس نے "ابدا کتی" کا نام دیا۔ اس کا بلیڈ کافی چوڑا اور ایک دھاری ہوتا ہے جبکہ دستہ کی طرف بتدریج پتلا ہوتا جاتا ہے۔ اس کا دستہ یعنی ہاتھ میں پکڑنے والا حصہ بھینس کی سنگھ یا لکڑی، یا ہاتھی دانت کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ یہ تلوار عام طور ڈھائی سے تین فٹ لمبی ہوتی ہے۔ دستہ اور بلیڈ کے درمیانی حصہ پر بلب کی طرح ایک ابھار ہوتا ہے تاکہ بوقتِ ضرورت اس حصہ پر وار کو سنبھالا جا سکے۔ اور ہاتھ زخمی نہ ہو پائے۔ ٹیپو نے میسور کے مختلف مقامات پر تلوار بنانے کے کارخانے بنوائے جس میں تجربہ کار لوہاروں کے ذریعہ فولادی لوہے کو آبدار بنایا جاتا تھا ایک خاص قسم کے تیزابی اور زہر آلود پانی میں متواتر کئی سال تک لوہے کو ڈالا جاتا تھا اور پھر اس کو آگ میں پگھلا کر پکا بنایا جاتا تھا، جس کو عرفِ عام میں (Damascened) فولاد کہا جاتا ہے۔ اسی طرح تلوار کے دستہ کو بھی کئی دھاتوں کی آمیزش سے تیار کیا جاتا تھا۔ ٹیپو کے عہد کی بنی ہوئی بہت سی تلواروں کے دستہ کئی دھات کے بنے ہوئے ہیں، جو اوائل میں بیدر میں تیار ہوتے تھے۔ ٹیپو سلطان کے عہد کی بنی ہوئی تلواروں کو موٹے طور پر تین حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو عہد شاہجہانی میں بنتی تھیں، جنہیں دلی شاہی کہا جاتا ہے۔ بالکل ایسی ہی تلوار ٹیپو نے بھی بنوائی۔ جس کی بلیڈ ہلکی سی خمیدہ اور دو دھاری ہوتی تھی اور دستہ کے آخری حصہ پر گول کٹوری بنی ہوتی تھی، جبکہ ابتدائی حصے پر کراس کا

نشان ہوتا تھا تاکہ جنگ کے دوران وار کو روکا بھی جاسکے۔ اس طرح بیک وقت پانچ تلواریں خود ٹیپو نے اپنے انداز کی بنوائی، جسے عرفِ عام میں ٹیپو تلوار کہا جاتا ہے۔ اس کا بلیڈ ہلکا سا خمیدہ اور نسبتاً زیادہ چوڑا ہوتا ہے جو ایک دھاری ہوتا ہے۔ اس کا فولادی لوہا بہت پکّا اور آبدار ہوتا ہے جسے جوہر بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا دستہ یعنی (Hilt) کے ہر کنارے پر شیر کا سر کا ابھرا ہوا نشان ضرور ہوتا ہے اور پورے دستہ پر مینا کاری اور نقش و نگار بنا ہوا ہوتا ہے۔ بعض دستوں کی شکل محرابی انداز کی بھی بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ تیسری 'تلوار' ایلڈ اکی' ہے جس کا ذکر ابھی کیا جاچکا ہے۔ ان بنیادی خصوصیات کے ساتھ ساتھ قرآنی آیات' اللہ کا نام' کلمہ نصرٌ من اللہ و فتح القریب بھی ٹیپو کے عہد کی بنی ہوئی تلوار پر لکھا ہوا ملتا ہے۔

ٹیپو سلطان کے عہد کی بنی ہوئی بہت سی تلواروں کے ساتھ ساتھ اس کی بعض ذاتی استعمال کی تلواروں کو بھی آج دیکھا جاسکتا ہے۔ ونڈسر کیسل میوزیم میں رکھی ہوئی ٹیپو کی ایک تلوار پر اس کا نام اور اللہ ۴۲ بار لکھا ہوا ہے۔ ساتھ میں قرآنی آیات بھی لکھی ہیں۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ وہی تلوار ہے جو آخری دم تک ٹیپو کے ساتھ تھی۔ اور مرنے کے بعد بھی اس کی لاش کے پاس ۱۷۹۹ء میں یہ تلوار پڑی ہوئی ملی۔ نیشنل میوزیم دہلی میں رکھی ہوئی ٹیپو سلطان کی تلوار جو ۳ فٹ اور ۶ اِنچ لمبی ہے۔ اس کو خود سلطان نے اپنی ذاتی نگرانی میں ۱۷۸۹ء میں میسور کے سرنگا پٹم میں بنوایا تھا۔ دلی شاہی انداز کا پیش قبض کے جس پر محرابی شکل کا دست پناہ ہے اور پورا دستہ زرفشاں تکنیک میں سونے کے کام سے بنا ہوا ہے۔ جبکہ بلیڈ کے ابتدائی سرے پر قرآنی آیات کے ساتھ ساتھ شمشیر ٹیپو سلطان عربی رسم الخط میں کندہ ہے اور ساتھ ہی اس کی دارالحکومت سرنگاپٹم کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ یہ ایک دھاری تلوار جو ہر کام سے آراستہ ہے جس پر شیر کی شبیہ بھی ابھری ہوئی ہے۔ یہ وہی اہم تلوار ہے جسے دیکھ کر میجر ایلین نے کہا تھا۔ جو ٹیپو کا ہم عصر ایک برٹش فوجی افسر تھا کہ تلوار کے انتخاب میں اور تیغ زنی میں شیرِ میسور ٹیپو سلطان یکتائے زمانہ ہے۔ اس کے جواب میں خود ٹیپو نے کہا

تھا کہ نپولین بوناپاٹ نے بھی اس تلوار کے جوہر سُنے، جو شاید اس وجہ سے اس نے ہم سے ٹکرانے کی جرأت نہیں کی۔ اس کے علاوہ برٹش میوزیم، وکٹوریہ اینڈ البرٹ میوزیم، مانچسٹر میوزیم میں ٹیپو سلطان کی استعمال شدہ تلواریں موجود ہیں۔

ٹیپو کو بنیادی طور پر تلوار سے خاص لگاؤ تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ تلوار ہی انسان کی ایسی دوست اور ساتھی ہے جو ہر آڑے وقت پر اس کا سہارا بنتی ہے تو کیوں نہ ایسی ساتھی کو مرنے کے بعد بھی ساتھ رکھا جائے۔ اس نے تلواروں کو لڑائی سے الگ تحفہ تحائف کے طور پر بھی استعمال کیا اور اپنے بعض ہندوستانی امراء اور راجاؤں کو پیش کیں۔ جس پر سونے چاندی کے ٹھوس کام کے علاوہ اس کے دستہ پر بیش قیمت ہیرے جواہرات اور قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہوتے تھے۔ اس طرح بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ٹیپو سلطان کی تلوار اگر ایک طرف جنگ کرنے اور بہادری کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے تو دوستی، محبت اور اشتراک کی ایک پہچان بھی ہے۔ ※ ※ ※

دینِ الٰہی کا پس منظر

دینِ الٰہی کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر کے جائزے کے لئے اُن تمام سماجی اور سیاسی و مذہبی تبدیلیوں اور ان کے اثرات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے جو دھیرے دھیرے پوری مغلیہ حکومت پر اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔

جلال الدین محمد اکبر، مغل حکومت کا تیسرا شہنشاہ تھا۔ اگرچہ ہندوستان کی سرزمین پر ابھی اس نئی حکومت کو قدم جمائے ہوئے صرف تین دہائیاں گزری تھیں لیکن اس سے بہت پہلے ہی ہمارے ملک میں ہند اسلامی تہذیب کی جڑیں پیوست ہو چکی تھیں۔ جس میں غلام، تغلق، خلجی، سیّد اور لودھی حکمرانوں کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ لیکن اگر سیاسی اور مذہبی نقطۂ نظر سے عہدِ اکبری کا جائزہ لیا جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں صرف ہندو اور مسلم ہی یہاں نہیں تھے بلکہ پرتگالی عیسائی، مجوسی اور یہودیوں کی بھی اچھی خاصی جماعت اکبر کے عہد میں ہندوستان کی سرزمین پر سانس لے رہی تھی۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ایک نیا مذہب، ایک نئی فکر، اور ایک انفرادی نظامِ حیات کے ساتھ گرونانک کے ماننے والوں نے سکھ مذہب کو بھی متعارف کرا دیا تھا۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہوں، مختلف زبانوں، اور منفرد لہجے کے ساتھ اُنکی شناخت ہوتی ہو بھلا صرف ایک

مذہب کو کس طرح عام کیا جا سکتا تھا۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ خود مذہب اسلام کے مذہبی رہنماؤں میں آپسی چپقلش اور پھوٹ کی وجہ سے اس زمانے میں ایک دوسرے کی تکفیر و تذلیل علمار کا شعار بن گیا تھا۔ مذہب کے ان عالموں میں نہ تو کوئی ذہنی ہم آہنگی تھی اور نہ ہی وہ اتفاق رائے سے کسی مسئلہ کو حل کرتے تھے۔ ایک مولانا کسی چیز کو حلال کہتا تو دوسرا اس کے بارے میں حرام ہونے کا فتویٰ صادر کر دیتا۔ جس زمانے کا یہ حال رہا ہو اور جسمیں علمائے اسلام اس طرح خود غرضی اور اقتدار کی رسہ کشی کا شکار ہو گئے ہوں اس میں اگر کوئی شخص مذہب سے متنفر ہو جائے اور تمام قید و بند کو توڑ دے تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ دراصل دینِ الٰہی کا قیام ایک طرح کا ردِ عمل تھا جو مذہبی پیشواؤں کے آپسی جھگڑوں کی وجہ سے پیش آیا۔ اکبر کے زمانے میں ایک وقت تو وہ آگیا تھا جب علمار کا حکومت کے کاموں اور سیاسی معاملوں میں ضرورت سے زیادہ عمل دخل ہونے لگا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان جیسے کثیر المذاہب ملک میں حکومت چلانا نہایت ہی دشوار ہونے لگا۔ جہاں تک خود شہنشاہ اکبر کی مذہبی پالیسی کا معاملہ تھا تو وہ خود ایک سچا اور ایماندار مسلمان تھا۔ اس کو مذہبِ اسلام اور خدا کے رسول سے پوری محبت اور اعتقاد تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے دو جڑواں بچوں کے نام بھی حسن اور حسین رکھے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ حکومت کے خرچ پر لوگ حج بیت اللہ جائیں اور ایمان تازہ کریں۔ ان تمام سچائیوں کے باوجود اس نے دیکھا کہ اس کے دربار کے مولانا عبدالقادر سرہندی اور دوسرے علمار کی اقتدار کی جنگ میں نہ صرف اسلام کو بلکہ پوری مملکت کو نقصان پہونچ رہا ہے۔ ایسے ہی پُر آشوب حالات میں دوسری طرف ابوالفضل، فیضی، اور شیخ مبارک جیسے درباری دانشوروں نے بادشاہِ وقت کو یہ باور کرایا کہ خود شہنشاہ کو اجتہاد کا حق حاصل ہے اور وہ ان حالات میں مذہبی قوانین میں ردّ و بدل کر سکتا ہے بشرطیکہ رعایا کے لئے وہ مفید ہو۔ چنانچہ ایسے سیاسی اور مذہبی پس منظر میں دینِ الٰہی کے

قیام کی ضرورت پیش آئی اور اکبر نے ایسے تمام کٹر علماء کو حج کے لئے روانہ کرتے مذہبی احکامات کی باگ ڈور خود سنبھال لی۔ اور سیکولر نظریہ کے پیشِ نظر ایک ایسے مذہب کو فروغ کرنا چاہا جو تمام لوگوں میں پسند کیا جائے جس میں ہر مذہب کی نمائندگی ہو اور جس کے احکامات ہر طبقہ اور نظریۂ فکر کے لوگوں کو بادشاہ اور ملک کی محبّت سے قریب کریں۔ دینِ الٰہی کا قیام ۱۵۸۲ء میں ہوا۔ اس کا فوری اثر یہ ہوا کہ نہ صرف مسلمانوں کا کثیر طبقہ بلکہ ہندو مذہب کے ماننے والے افراد نے بھی اس کے خلاف آواز اُٹھائی یہاں تک کہ اکبر کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا گیا اور نوبت یہاں تک آگئی کہ اس بات کی کوشش کی جانے لگی کہ اکبر کو تخت سے معزول کر کے اس کے دوسرے بھائی مرزا محمد حکیم کو بادشاہ بنا دیا جائے۔ اس سلسلہ میں بغاوتیں بھی ہوئیں لیکن مرزا محمد حکیم، اکبر کا مقابلہ نہ کر سکا۔ یہ سارا فساد اکبر کے دینِ الٰہی اور اسلام سے انحراف کی وجہ سے ہوا۔ لیکن یہ مذہب زیادہ مقبول نہ ہو سکا صرف ان لوگوں نے اسے قبول کیا جو بادشاہ کی خوشنودی چاہتے تھے۔ خود اکبر بادشاہ کا اعتقاد بھی دینِ الٰہی کی طرف سے ڈاما ڈول ہونے لگا کیونکہ جلد ہی عیسائیوں کا ایک طبقہ اس بات کی کوشش کرنے لگا کہ بادشاہ عیسائی ہو جائیں۔ ہندوؤں نے اکبر کو اپنے مذہب سے قریب کرنا چاہا اور نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ تمام مذاہب سے متنفر ہو کر خود الوہیت کا دعویدار ہو گیا۔

دینِ الٰہی کا سرکاری نام "توحیدِ الٰہی" تھا۔ جس کا حاکمِ اعلیٰ خود بادشاہِ وقت تھا جس کو عوام کے روحانی پیشوا کا پورا حق حاصل تھا۔ اور اس مذہب میں جمعہ کے بجائے اتوار کو اہمیت دی گئی اس خیال کے پیشِ نظر کہ کچھ نجومیوں کے مطابق اتوار کے دن سورج میں نسبتاً زیادہ روشنی ہوتی ہے۔ دینِ الٰہی کے ماننے والوں کو ایک سشت یعنی "جنیو" دیا گیا جس کو عام طور پر لوگ اپنی کمر میں باندھتے تھے جس پر بادشاہ کے نام کے ساتھ ساتھ "اللہ اکبر" لکھا ہوتا تھا۔ کچھ لوگوں کے خیال کے مطابق "اللہ اکبر"

کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے کہ اللہ، اکبر ہے۔ دینِ الٰہی کے ماننے والوں میں زیادہ تر یہودی اور ہندو تھے کیونکہ کمر میں جنیو باندھنے کا تصوّر بھی انھیں مذاہب سے لیا گیا تھا۔ بعض مفکرین کے نزدیک دینِ الٰہی کو مذہب کے بجائے محض ایک نظریۂ فکر کہا جاتا ہے جو آپسی قربت اور دوستی کے نظریہ پر قائم ہوا تھا۔ دینِ الٰہی کے بنیادی اصول یہ تھے کہ :۔

اس مذہب کے ماننے والے سلام یا نمسکار کے بجائے ایک دوسرے کو دیکھکر اللہ اکبر کہیں گے اور جس کے جواب میں "جلّ جلالہ" کہا جائیگا۔ تمام ماننے والوں کو یہ ضروری ہوگا کہ وہ لوگ اپنی زندگی ہی میں ایک دوسرے کو دعوت کے طور پر کھانا کھلائیں گے جو عام طور پر انسان کے مرنے کے بعد کیا جاتا تھا۔ عیسائیوں کے مطابق یوم پیدائش کو ہر سال ہر آدمی دھوم دھام سے منائے گا۔ برتھ ڈے پارٹی کے دن نہ تو کسی طرح کا گوشت کھایا جائے گا اور نہ گوشت کو دیکھا جائے گا۔ قصائیوں ماہی گیروں اور چڑی ماروں کے برتن استعمال نہیں کئے جائیں گے۔ اپنے سے بڑی عورت، حاملہ عورتوں، یا کنواری لڑکیوں کے ساتھ جسمانی تعلقات سے قطعاً پرہیز کیا جائے گا۔ اس کا سب سے اہم رُکن یہ بھی تھا کہ دینِ الٰہی کے تمام ماننے والوں کو اپنی جائداد، زندگی، عزّت اور مذہب کا محافظ صرف بادشاہ سلامت کو بنانا پڑے گا۔ اس کی رُو سے کسی بھی شخص کے مرنے کے بعد اس کی جائداد کا وارث صرف بادشاہ ہوگا۔ دینِ الٰہی کے احیاء کے دو سال بعد یعنی ۱۵۸۴ء میں ایک سکہ جاری کیا گیا جس پر اللہ اکبر کے ساتھ دینِ الٰہی کے سنِ قیام کی تاریخ کندہ کی گئی۔ اسی سال یعنی اکبر بادشاہ کی تخت نشینی کے ۲۹ ویں سال میں الٰہی صدی کا بھی آغاز ہوتا ہے جس کے کرتا دھرتا امیر فتح اللہ شیرازی اور ٹوڈرمل تھے۔ اس سال الٰہی کا ڈھانچہ ایرانی سال اور مہینوں کی شکل میں مرتب کیا گیا۔ یہ سلسلہ عہدِ جہانگیری تک قائم رہا مگر شاہجہاں بادشاہ نے لفظ "الٰہی صدی"، کو قابلِ اعتراض سمجھا اور اس کو ختم کروا دیا۔ دینِ الٰہی کے ماننے والوں میں ایسے لوگوں کی اکثریت تھی جو سنیاسی، جوگی، قلندر یا اپنے اپنے

مذاہب کی سختیوں سے عاجز تھے۔ یا ان لوگوں نے جو اکبر بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے جن میں کچھ نمایاں نام، ابوالفضل، فیضی، شیخ مبارک، جعفر بیگ، عبدالصمد، بیربل، نقی شستری، وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے باوجود دینِ الٰہی کبھی بھی عوام میں مقبول نہ ہوسکا۔ خود اکبر کے اس مذہب کے بارے میں اعتقادات مستحکم نہ تھے۔ عام مؤرخین اور دانشوروں کی رائے میں دینِ الٰہی کو ایک نیا مذہب کہنا کسی طرح بھی درست نہیں کیوں کہ یہ تو صرف عارضی طور پر مذہب کی بے جا مداخلت اور عالموں کی حکومت کے کاموں میں رخنہ ڈالنے کا ایک ردعمل تھا۔ خود اکبر ہی کے آخری عہد میں اس کا زور کم ہو گیا تھا پھر جہانگیر کے عہد میں دینِ الٰہی کے احکامات یا وہ باتیں جو اکبر نے صرف اپنی طبیعت سے رائج کردی تھیں منسوخ کردی گئیں۔

اکبر کا زمانہ اگر ایک طرف اس طرح کی چند حرکتوں کی وجہ سے خراب کہا جاتا ہے تو دوسری طرف اسلامی تبلیغ کی تحریک کے لئے اہم بھی ہے۔ تمام بڑے بڑے علماء، فضلاء، ادباء اس زمانے میں ہوئے۔ اور اسلامی تاریخ و ادب کے علاوہ فنونِ لطیفہ، فلسفہ اور منطق کا بھی کافی عروج ہوا۔ اکبر بادشاہ کی ایک آدھ کمیوں کے علاوہ وہ ایک دانشور، مذہبی اور ہندوستان جیسے ملک کے لئے نہایت ہی مناسب انسان تھے جس نے نہ صرف ہندوستان کی عوام کو فائدہ پہونچایا بلکہ پوری دنیا کے جغرافیائی نقشہ میں ملک کو اعلیٰ مرتبہ عطا کیا۔

ریڈیو فیچر

آزادی کا سفر

ہندوستان فقط ایک زمین کا ٹکڑا ہی نہیں بلکہ یہ تو ہزاروں برس کی تہذیب کا نشانِ راہ ہے یہ ایک ایسی مشعل ہے جس سے ماضی، حال اور مستقبل کی تمام قومیں اپنی منزلوں پر آگے بڑھتی رہتی ہیں۔ ہند کو اپنا دیس پکارنے والے کروڑوں انسانوں کی اسی تہذیب نے اس ملک کو ایک واضح اور قطعی صورت عطا کی ہے۔ اسے خاص رنگ اور انداز بخشا ہے، اور شاید اسی کا نام ہندوستان ہے۔ آج بھی ہماری پرانی تہذیب اور کلچر بدستور قائم ہے۔ جسے ہم کشمیر کی برف پوش وادیوں میں دیکھ سکتے ہیں۔ جسے ہم جنوبی ہندوستان کے ساحلوں پر اُگے ہوئے ناریل کے پیڑوں میں تلاش کر سکتے ہیں۔ جسے ہم راجستھان کے ریگستانی علاقوں کی اڑتی ہوئی ریت میں ڈھونڈ سکتے ہیں۔ پنجاب کے محنت کش مزدور کے پسینہ میں محسوس کر سکتے ہیں۔ اور جسے ہم سڑک پل اور آسمان سے باتیں کرتی ہوئی اونچی عمارتوں کے بنانے والے انجنیروں کی آنکھ میں دیکھ سکتے ہیں۔

لیکن یہ تہذیب اور کلچر اُسی وقت تک قائم رہ سکتا ہے جب کسی بھی ملک کی آزادی برقرار ہو۔ تاریخ میں کوئی بھی دور ایسا نہیں گزرا ہے جب انسان نے آزادی کی خواہش ظاہر نہ کی ہو۔ اس کے باوجود کچھ جابر اور سفاک حکومتوں نے انسان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کی ہمیشہ کوششیں کی ہیں ــــ جدوجہد آزادی میں ایک طرف ایسے بہادر نظر آئیں گے جو غلامی اور ظلم وستم سے نجات حاصل کرنے کے لئے لڑتے رہے اور دوسری طرف ایسے مفکر، دانشور، فلسفی اور سائنسداں بھی ملیں گے جنھوں نے ذہن وشعور

کی آزادی کے لئے دار و رسن کی بھی پروانہ کی ـــ ایسا ہی ایک پر آشوب دور ہمارے مادرِ وطن پر بھی گزرا ہے ـــ ابھی اٹھارویں صدی کا آغاز ہی ہوا تھا کہ مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا ـــ آخری عظیم مغل شہنشاہ، محی الدین محمد اورنگ زیب کی وفات ہو چکی تھی اور پورا ہندوستان افراتفری کے دور سے گزر رہا تھا کہ اچانک دو غیر ملکی طاقتیں تاجروں کی حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئیں۔ انگلستان اور فرانس نے آہستہ آہستہ ہمارے ملک کی سرزمین پر غلبہ حاصل کرنا شروع کر دیا ـــ ہندوستانیوں کے دل میں کبھی مذہب کبھی زبان اور کبھی علاقہ کی بنیاد پر نفرتوں کے بیج بونا شروع کر دیا۔ اور ہند کی سرزمین پر یہیں کے باسیوں کا خون بہایا جانے لگا۔ مغلوں کی حکومت کمزور پڑتی گئی اور پورا ہندوستان صوبوں کی بنیاد پر تقسیم ہونے لگا ـــ ابھی کچھ ہی عرصہ گزرا تھا کہ انگریزوں نے اپنے حریف فرانسیسیوں کو شکست دے کر پورے ہندوستان میں اپنی کامیابی کا اعلان کر دیا ـــ یہ انگریز انگلستان سے ایک ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں ہندوستان آئے تھے اور دھیرے دھیرے اس ملک کی تجارت، یہاں کی اقتصادی صورتِ حال پر قابض ہوتے چلے گئے۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر قید کر لئے گئے اور ہند کی سرزمین غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لی گئی ـــ ہمارا ملک اور اس کے باسی ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ تک کے لئے غلامی کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔

وقت گزرتا رہا ـــ آزادی کی خواہش، اور اپنے مادرِ وطن کو غلامی کی زنجیروں سے نجات دلانے کا جذبہ دھیرے دھیرے ہر ہندوستانی کے ذہن میں بیدار ہونے لگا۔ ابھی انیسویں صدی کا آغاز ہی ہوا تھا کہ آزادی کی مشعل روشن ہو گئی جس نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جھانسی سے، مہارانی لکشمی بائی اور تانتیا ٹوپے نے جان کی بازی لگا دی ـــ دکن میں ٹیپو سلطان نے انگریزوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا ـــ نانا صاحب پیشوا مجاہد آزادی کے بہادر سپاہی کی طرح آگے بڑھے اور بنگال سے بنکم چندر چٹرجی نے "وندے ماترم" کی آواز لگائی مگر کچھ ہندوستانیوں کی آپسی پھوٹ کی وجہ سے انگریز کامیاب ہو گئے ـــ اور ہندوستان پر انگریزی سامراج کا سکہ

چلتا رہا۔

انگریزوں نے ہند پر اپنا راج جمائے رکھنے کے لئے ریلوں، سڑکوں اور ڈاک کا جو بڑا جال بچھایا تھا اس سے لوگوں کو ایک دوسرے سے قریب آنے میں آسانی ہوئی۔ کچھ ہندوستانیوں نے انگریزی زبان کو سیکھ کر اُن کی سیاسی اور اقتصادی صورت حال کو بھی سمجھنا شروع کر دیا۔ اخباروں اور کتابوں کے ذریعہ اہلِ ہند نے مغربی ملکوں کے نظریوں سے واقفیت حاصل کی اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ انسان کی عظمت، اور خودداری، آزادی اور مساوات میں ہے، غلامی اور مظلومیت میں نہیں۔ گویا صدیوں سے سوئے ہوئے خاموش ملک کو پھر سے زبان مل گئی۔ پہلے تو یہ ہلکی سی آواز تھی۔ پھر آہستہ آہستہ اونچی ہوتی گئی اور جب یہ ایک گرج بنی تو آسمانوں کا سینہ چیر کر فضاؤں میں تحلیل ہونے لگی۔

(نغمہ وندے ماترم)

تاریخ گواہ ہے کہ دنیا کا بڑا سے بڑا انقلاب چاہے وہ انقلاب فرانس ہو یا انقلاب روس، تشدد، ظلم اور خوں ریزی کی بھیانک وارداتوں کے بغیر برپا نہیں ہوا۔ لیکن ہندوستان کی تحریک آزادی ایک ایسے انقلاب کی صورت میں سامنے آئی جہاں اسلحہ کا استعمال جرم تھا، جہاں خوں ریزی کو حرام قرار دیا گیا۔ جہاں تشدد کے بجائے عدم تشدد اور اہنسا کا سہارا لیا گیا۔ ہندوستان کی آزادی کی یہ تحریک ایک ایسے دور میں شروع ہوئی جب پورے ملک میں برطانوی سامراج کا غلبہ تھا۔ ہماری تہذیبیں مسخ اور پامال ہوتی جارہی تھیں۔ ذہنوں پر پہرے لگائے جارہے تھے۔ قوموں، فرقوں اور رشتوں کے درمیان دراڑیں پڑتی جارہی تھیں، اور فرنگی سامراج ہماری گفتار و کردار اور عملی قوتوں کو یکسر سلب کر دینا چاہتے تھے۔ یہ ایسا لمحہ فکر تھا جس پر سنجیدگی کے ساتھ ہمارے ملک کے دانشوروں، سیاسی رہنماؤں اور وطن پرست جانبازوں نے غور کیا اور مختلف تحریکوں کے سہارے ہندوستانی عوام کو اس احساس سے باور کرایا کہ جو حکومت ہماری آزادی کو ہم سے چھین لے، ہمارے قلم، ہمارے ذہن و فکر پر پہرے لگادے ہماری تہذیب، ہمارے مذہب اور ہماری مشترکہ روایات کو نیست و نابود کرنے لگے، او

اور اپنی ہی سر زمین پر دوسرے درجہ کے شہری جیسا برتاؤ کیا جانے لگے۔ ایسی ظالم حکومت کے خوں خوار پنجوں سے ہر ہندوستانی کو آزادی دلانی ہی ہوگی۔ ایسی غیر ملکی حکومت کے ساتھ تعاون ہرگز قبول نہ ہوگا جن کے ہاتھوں میں خون لگا ہو جن کے اشاروں پر ہمارے ملک کے تمام مسئلہ حل کئے جاتے ہوں۔ ہم اپنے ہی ملک میں غلامی کی زنجیروں میں قید رہیں اور غیر ملکی سامراج، آزادی کے ساتھ ہم پر حکومت کرتے رہیں۔ ان تشویشناک مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک ایسے اقدام کی ضرورت پیش آئی جس سے ہندوستان کے ہر باسی کو آزاد کرایا جا سکے۔ اور آنے والے مستقبل کے تاریک دور کو روشن کرایا جا سکے ——— یہی وہ زمانہ تھا جب پوری دنیا پہلی جنگ عظیم کی تباہ کن صورت حال سے دوچار تھی۔ طاقت اور تشدد کا دور دورہ تھا کہ ہمارے کچھ سیاسی رہنما اور دانشوروں نے عدم تشدد کے خلاف آزادی کا نعرہ بلند کیا ——— جب لاکھوں اور کروڑوں دلوں میں ایک ہی جذبہ گھر کر لے تو وہ ایک قوت بن جاتی ہے جس کے سامنے طاقتور سے طاقتور فوج بھی ٹھہر نہیں سکتی۔ اور اس جذبہ کو بیدار کرنے میں ڈاکٹر راجندر پرساد اور لالہ راجپت رائے، سی، آر، داس، موتی لال، نہرو، اینی بیسنٹ، مولانا آزاد، محمد علی، پٹیل، بابو جگ جیون رام، جواہر لال نہرو، اور بہت سے دوسرے وطن پرست مجاہدوں نے مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں آزادی کے سفر پر تیز قدمی کے ساتھ آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ (نغمہ)

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے

اِن ہندوستانی مجاہدین آزادی کے ہاتھ میں کوئی تلوار نہیں تھی اور نہ ہی ان کے پاس کوئی منظم اور مسلح فوج تھی۔ ان سپاہیوں کے ہاتھ تو کمر کے پیچھے تھے مگر سینوں پر گولیاں کھانے کے لئے آگے بڑھ رہے تھے۔ جن ہتھیاروں کے ذریعہ یہ آزاد ہندوستان کا خواب دیکھ رہے تھے وہ ستیہ گرہ، عدم تشدد، ڈانڈی مارچ، نمک اندولن اور عدم تعاون جیسے ہتھیار تھے جس کا سب سے عظیم سپاہی موہن داس کرم چند گاندھی تھا۔ یہ اہنسا کا پجاری اور انسان دوستی کا علمبردار اپنے مخصوص خیالات اور طریقۂ کار کے اعتبار

سے اپنے عہد کا بین الاقوامی رہنما تھا۔ دنیا کے ہر گوشہ، ہر طبقہ اور ہر نظریۂ فکر کے کروڑوں انسان باپو کی زندگی اور تعلیمات کو آج بھی انسانی عظمت کا چراغ تصور کرتے ہیں —— مہاتما گاندھی کے بارے میں البرٹ آئنسٹن نے یہ بات بالکل صحیح کہی تھی —— "آئندہ نسلیں مشکل ہی سے اس بات پر یقین کریں گی کہ دنیا میں کبھی کوئی ایسا شخص چلتا پھرتا بھی رہا تھا۔ اس کے باوجود آئندہ نسلوں کو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ایسا شخص ہندوستان میں موجود تھا۔ اس نے اس ملک کے لاتعداد باشندوں کے قلوب پر کبھی نہ مٹنے والے روحانی نقوش ثبت کر دیئے تھے۔

اس تحریک کا فوری اثر یہ ہوا کہ اچانک برطانوی حکومت کے تمام شعبوں میں کام کاج ٹھپ ہونے لگا۔ ان کی اقتصادیات میں کمی آنے لگی۔ ان کے انتظامی امور ناکام ہونے لگے اور ردعمل کے طور پر فرنگیوں نے کھلے طور پر ہندوستانیوں پر ظلم اور تشدد کرنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے ہندوستان میں انگریز حکومت کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی، اتحاد و اتفاق، وطن سے محبت، جمہوری طرز نظام، اور سوراجیہ کی خواہش ہر ہندوستانی کے دل میں اجاگر ہونے لگی۔ اور ایک ایسے آزاد ہندوستان کی فضا قائم ہونے لگی جس کی بنیادیں جمہوریت پر مبنی تھیں۔ وہ سورج جو انگریز سرکار پر کبھی نہ ڈوبتا تھا اب غروب ہونے والا تھا، اور اس طرح آزادی کا وہ آفتاب جو کچھ عرصہ کے لئے دلی کے لال قلعہ کی اونچی فصیلوں کے نیچے چھپ گیا تھا آخر کار اس کے محرابی کنگوروں سے جھانکتا ہوا ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو پھر نمودار ہو گیا۔

پورے ملک میں آزادی کا جشن منایا گیا۔ آزاد بھارت کے آزاد باسیوں نے اپنی حکومت اور اپنی خوشیوں کے حسین پیکر تراشنے شروع کر دیئے۔ آزادی کی لڑائی جیتنے والے اسی جدوجہد میں رہے کہ اس سرزمین کے لوگوں کا دامن خوشیوں سے بھر دیں، وہ ایک ایسے نئے ہندوستان کی تعمیر کا خواب دیکھ رہے تھے جہاں غربت، جہالت، بیماری اور بے انصافی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کیا جا سکے۔ جہاں ایک ایسا نظام حکومت ہو جس میں نہ کوئی چھوٹا ہو نہ بڑا۔ سب کو برابر کے حقوق حاصل ہوں۔ لیکن ابھی بھی ہندوستان کو ایک لمبا سفر طے کرنا

تھا۔ آزادی کا ایک ایسا سفر جس میں ایسی مشعل جلائی جائے جو بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھا سکے، جو منزلِ مقصود کی نشان دہی کر سکے، اور وہ مشعل ہے ہمارا "آئین" ــــ اس اہم دستاویز میں وہ تمام باتیں اور قوانین محفوظ کر دیئے گئے جو آزاد ہندوستان کو ایک سیکولر اور جمہوری ملک ہونے کا مرتبہ عطا کرتے ہیں۔

سنہ ۱۹۴۷ میں جب ہندوستان آزاد ہوا تھا تو اس وقت ہمارے ملک میں تقریباً ۳۵ کروڑ آدمی رہتے تھے۔ مگر آج ہمارے ملک کی آبادی لگ بھگ ۸۵ کروڑ ہے۔ پچھلے چالیس سال سے زائد کے عرصہ میں ہماری آبادی میں ۵۰ کروڑ کا اضافہ ہوا ہے۔ جب کہ ہمارے ملک کی اناج اگانے والی زمین تو اور بھی چھوٹی ہو گی ــــ ہمارے ملک کے مفکروں اور سیاسی رہنماؤں نے سنجیدگی کے ساتھ انسان کی روزی اور روٹی کے مسئلہ پر غور کیا اور پہلے پنج سالہ منصوبے میں سب سے زیادہ ترجیح کھیتی باڑی کو دی۔ جس میں انیس ارب ۶۰ کروڑ روپے کے خرچ سے دریاؤں پر باندھ تعمیر کئے گئے۔ کنویں اور تالاب بنوائے تاکہ کھیتوں کو مناسب پانی مل سکے اور اناج کی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکے۔ بجلی، کارخانوں، رسل ورسائل، صحت اور تعلیم، ایسے مسئلہ تھے جن کے لئے اب ہمارے ملک کو خود راستے ہموار کرنے تھے۔ لیکن آزادی کا یہ سفر برابر جاری رہا، ملک کا بٹوارہ ہو گیا، ہماری زمین کے ٹکڑے کر دیئے گئے مگر منزل تک پہونچنے کا جذبہ اب بھی بیدار تھا۔ ہمارا وطن یہ جانتا تھا کہ ہمیں اپنی ضرورتوں کو خود پورا کرنا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں نمایاں طور پر فولاد، بجلی، سیمنٹ، کیمیاوی کھاد، اور دوسری مشینوں کے بنانے میں ۴۶ ارب روپے خرچ کئے گئے۔ جس سے ہمارا معیارِ زندگی بھی بہتر ہوا اور اقتصادی صورت حال پر بھی قابو پانے کی کوشش کی گئی۔ ہمارے ملک کے کسانوں نے بہتر اور زیادہ پیداوار کے لئے جی جان سے محنت کی ہمارے زراعتی سائنسدانوں نے جلدی اور کئی گنا زیادہ پیداوار بڑھانے کے لئے دن رات محنت کی۔ اسی طرح تیسرے پلان میں ۸۵ ارب ۷۶ کروڑ روپے کے خرچ سے ایک طرف تو ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی کو قابو میں لانے کی کوشش کی گئی۔ لوگوں کی صحت اور بیماری کے خلاف

اچھی دواؤں اور اعلیٰ ڈاکٹروں کے ساتھ ساتھ دواخانے، ہسپتال اور معیاری طبی امداد کا انتظام کیا گیا۔ تعلیم کے لئے، اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں قائم کی گئیں اور ساتھ ہی ان تمام فطری مصائب اور حوادثات کا مقابلہ بھی کیا جاتا رہا جس سے ملک کو گاہے گاہے دوچار ہونا پڑا۔ سائنس، ٹیکنالوجی اور صنعت و حرفت کی ترقی کی طرف چوتھے منصوبے میں ا کھرب ۵۹۔ ارب ۲ کروڑ روپے صرف کئے گئے اور صرف ۲۵ سالوں کا ہندوستان سماجی، اقتصادی اور معاشی نقطۂ نظر سے اس منزل تک پہنچ گیا جہاں اس نے زندگی کے لگ بھگ ہر شعبہ میں خودکفیل ہونے کا اعلان کر دیا۔ منصوبے بنتے رہے اور بھارت کی دھرتی اپنے سینے سے اناج اگلتی رہی۔ ندیاں ہند کے باسیوں کی پیاس بجھاتی رہیں اور ہندوستان دنیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ مقابلہ کی دوڑ میں زمین سے آسمان تک بلندیوں میں پرواز کرتا رہا۔ ہمارے تجربہ کار انجنیر اور سائنس داں سمندر کی تہوں میں نئی دنیا آباد کرنے کے سراغ لگانے لگے۔ آمدنی میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور آج جب کہ ہمارا آزادی کا سفر چوتھی دہائی سے گزر کر اور آگے کو بڑھتا جا رہا ہے۔ آپ کو اندازہ ہوگا کہ اب ہمارے کھیتوں کی پیداوار کئی گنا زیادہ ہوگئی ہے۔ ہمارے کارخانوں میں بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے۔ اسکولوں اور تعلیم کا معیار اور مقدار بڑھی ہے۔ اب ملک میں پہلے سے ۵۰ گنا زیادہ اخبار اور رسائل شائع ہوتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن ملک کے تقریباً ہر حصہ میں دیکھا اور سنا جاتا ہے۔ ڈاک پہنچانے کا انتظام پہلے سے بہت آگے بڑھ گیا۔ ریل گاڑیوں اور ہوائی جہاز کے مسافروں میں زبردست زیادتی ہوئی ہے۔ اب سڑکوں پر ۷۰ گنا زیادہ موٹریں، ٹرک اور سواریاں چلتی ہیں۔ شہروں اور گاؤں میں رہنے والوں کا مرتبہ بلند ہوا ہے۔

یہ وہی آزاد ہندوستان ہے جو غلامی کے دنوں میں معمولی معمولی چیزوں کو ترستا تھا۔ صابن، بسکٹ اور روشنائی تک ہمارے دیس کو باہر سے منگوانی پڑتی تھی۔ مگر آج ہمارا ہندوستان آواز سے زیادہ تیز رفتار ہوائی جہاز اپنے ملک میں تیار کرتا ہے۔ ہماری سرحدیں مضبوط سے مضبوط تر ہوگئی ہیں۔ ملک کے کونے کونے میں تعمیر اور ترقی کے کام

ہوئے ہیں۔ — بھاکڑہ، ہیرا کڈ، اور ناگارجن ساگر میں بڑے بڑے باندھ تعمیر کئے گئے ہیں۔ بھلائی، رورکیلہ، جمشید پور، اور درگاپور میں اسٹیل اور فولاد کے کارخانے موجود ہیں۔ بنگلور، ناسک اور کانپور میں ہوائی جہاز بنانے کی فیکٹریاں اب ہمارے پاس موجود ہیں — چترنجن وارانسی اور کئی جگہوں پر ریلوے انجن اور تیز رفتار گاڑیوں کے کارخانے بن چکے ہیں۔ آج ہمارے ملک میں راجدھانی اور شتابدی ایکسپریس جیسی ریل گاڑیاں دنیا کی کسی بھی ریل گاڑی سے مقابلہ کر سکتی ہیں — یہاں تک کہ اب تو راکٹ اور مصنوعی سیاروں کی تعمیر میں بھی ہمارا ملک پیچھے نہیں رہا ہے — ہمارے ملک کے اسّی فیصدی گاؤں اب بجلی کی آسانیاں حاصل کر رہے ہیں۔ کمپیوٹر اور بجلی کی مشینوں کا استعمال اب عام ہوتا جا رہا ہے — سچ تو یہ ہے کہ دنیا کے جو چند ملک سب سے زیادہ انجنیئر، ڈاکٹر اور فنون لطیفہ کے ماہرین پیدا کرتے ہیں ہمارا ملک ان میں سے ایک ہے — ہمارے قومی بینک اب خود کفیل ہو چکے ہیں — ہماری اقتصادی پالیسی اب پہلے سے بہت ترقی یافتہ ہے — ان سبھی باتوں کی وجہ سے ہندوستان میں خود اعتمادی کا احساس اجاگر ہوا ہے اس لئے پوری دنیا کی تمام بڑی طاقتوں کے ساتھ اب ہندوستان کی بھی اپنی انفرادی شناخت ہے — ہندوستان اب نہ صرف اس برصغیر میں بلکہ پوری دنیا کے نقشہ میں ابھر کر سامنے آیا ہے — اب امریکہ اور روس جیسے طاقتور ملک بھی ہندوستان کی خارجہ پالیسی کا احترام کرتے ہیں۔ ہمارا معیار زندگی پہلے سے اونچا ہوا ہے اب ہم زیادہ آرام دہ مکانات اور زیادہ صحت مند مقامات میں رہنے لگے ہیں۔ آج ہمارا ملک بھی فضا کو تسخیر کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ چاند پر نئی دنیا آباد کرنے کے ارادے آج ہمارے انجنیئروں کے پاس بھی ہیں۔ اب زمین کے فاصلے ختم ہوتے جا رہے ہیں بلکہ تین کروڑ ۸۴ لاکھ میل دور سیاروں تک پہونچنا اب کوئی مشکل نہیں رہا۔

اس کے باوجود ہمیں اب بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ڈھیر سارے کام ابھی کرنا باقی ہیں۔ ہمیں اپنی اُن روایات کی پاسبانی کرنا ہے جو ہمارے ملک کی ہزاروں سال پرانی تہذیب کا حصہ ہیں۔ ہمیں انسان دوستی، محبت اور بھائی چارے کا علم لے کر پھر سے اسی جذبہ

اور لگن کے ساتھ آگے بڑھنا ہے جس یقین اور پکے ارادے کے ساتھ ہم نے چالیس سال پہلے آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ اب ہمیں کئی اور جنگیں لڑنی ہیں۔ فرقہ پرستی کے خلاف جنگ علاقائی اور لسانی جھگڑوں کے خلاف جنگ غریبی اور مفلسی کے خلاف جنگ، جہالت اور پرانے عقائد کے خلاف جنگ، ذخیرہ اندوزی اور رشوت خوری کے خلاف جنگ، اور ایسے تمام مورچوں پر ہمیں جنگ کرنی ہے جو ہمارے ملک کی آزادی کے لئے خطرہ ہیں۔

یہ آزادی کوئی تحفہ نہیں بلکہ یہ تو ایک ایسا عطیہ ہے جو قدرت نے نیک بندوں کی قربانی اور وطن پرستی کے جذبے سے معمور لوگوں کی سچی لگن اور عقیدت کے بدلہ عطا کی ہے۔ اس کی حفاظت کرنا ہر ہندوستانی کا پہلا فرض ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی اتحاد اور آپسی بھائی چارے کی کمی ملک میں ہوئی ہے تو ان پر عتاب کی صورت میں آزادی کو چھین لیا گیا ہے۔ ہمیں اپنی آزادی کو ہر صورت میں برقرار رکھنا ہے اور آزادی کے اس سفر کو ہمیشہ جاری رکھنا ہے۔ ایک ایسی مشعل کو ہاتھ میں لے کر آگے بڑھتے رہنا ہے جہاں آنے والی آزاد ہندوستان کی نسلیں حفاظت کے ساتھ اس کو اور آگے بڑھانے کے لئے تیار ہو جائیں۔

ہوئے ہیں — بھاکرہ، ہیراکڈ، اور ناگارجن ساگر میں بڑے بڑے باندھ تعمیر کئے گئے ہیں۔ بھلائی، رورکیلہ، جمشید پور، اور درگا پور میں اسٹیل اور فولاد کے کارخانے موجود ہیں۔ بنگلور، ناسک اور کانپور میں ہوائی جہاز بنانے کی فیکٹریاں اب ہمارے پاس موجود ہیں — چترنجن وارانسی اور کئی جگہوں پر ریلوے انجن اور تیز رفتار گاڑیوں کے کارخانے بن چکے ہیں۔ آج ہمارے ملک میں راجدھانی اور شتابدی ایکسپریس جیسی ریل گاڑیاں دنیا کی کسی بھی ریل گاڑی سے مقابلہ کر سکتی ہیں — یہاں تک کہ اب تو راکٹ اور مصنوعی سیاروں کی تعمیر میں بھی ہمارا ملک پیچھے نہیں رہا ہے — ہمارے ملک کے اسّی فیصدی گاؤں اب بجلی کی آسانیاں حاصل کر رہے ہیں۔ کمپیوٹر اور بجلی کی مشینوں کا استعمال اب عام ہوتا جا رہا ہے — سچ تو یہ ہے کہ دنیا کے جو چند ملک سب سے زیادہ انجینیر، ڈاکٹر اور فنون لطیفہ کے ماہرین پیدا کرتے ہیں ہمارا ملک ان میں سے ایک ہے — ہمارے قومی بینک اب خودکفیل ہو چکے ہیں — ہماری اقتصادی پالیسی اب پہلے سے بہت ترقی یافتہ ہے — ان سبھی باتوں کی وجہ سے ہندوستان میں خوداعتمادی کا احساس اجاگر ہوا ہے اس لئے پوری دنیا کی تمام بڑی طاقتوں کے ساتھ اب ہندوستان کی بھی اپنی انفرادی شناخت ہے — ہندوستان اب نہ صرف اس برصغیر میں بلکہ پوری دنیا کے نقشہ میں ابھر کر سامنے آیا ہے — اب امریکہ اور روس جیسے طاقتور ملک بھی ہندوستان کی خارجہ پالیسی کا احترام کرتے ہیں۔ ہمارا معیار زندگی پہلے سے اونچا ہوا ہے اب ہم زیادہ آرام دہ مکانات اور زیادہ صحت مند مقامات میں رہنے لگے ہیں۔

آج ہمارا ملک بھی فضا کو تسخیر کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ چاند پر نئی دنیا آباد کرنے کے ارادے آج ہمارے انجینیروں کے پاس بھی ہیں۔ اب زمین کے فاصلے ختم ہوتے جا رہے ہیں بلکہ تین کروڑ ۸۴ لاکھ میل دور سیاروں تک پہونچنا اب کوئی مشکل نہیں رہا۔

اس کے باوجود ہمیں اب بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ڈھیر سارے کام ابھی کرنا باقی ہیں۔ ہمیں اپنی اُن روایات کی پاسبانی کرنا ہے جو ہمارے ملک کی ہزاروں سال پرانی تہذیب کا حصہ ہیں۔ ہمیں انسان دوستی، محبت اور بھائی چارے کا علم لے کر پھر سے اسی جذبہ

اور لگن کے ساتھ آگے بڑھنا ہے جس یقین اور پکے ارادے کے ساتھ ہم نے چالیس سال پہلے آزادی کی جنگ لڑی تھی۔ اب ہمیں کئی اور جنگیں لڑنی ہیں۔ فرقہ پرستی کے خلاف جنگ علاقائی اور لسانی جھگڑوں کے خلاف جنگ غریبی اور مفلسی کے خلاف جنگ، جہالت اور پرانے عقائد کے خلاف جنگ، ذخیرہ اندوزی اور رشوت خوری کے خلاف جنگ، اور ایسے تمام مورچوں پر ہمیں جنگ کرنی ہے جو ہمارے ملک کی آزادی کے لئے خطرہ ہیں۔

یہ آزادی کوئی تحفہ نہیں بلکہ یہ تو ایک ایسا عطیہ ہے جو قدرت نے نیک بندوں کی قربانی اور وطن پرستی کے جذبے سے معمور لوگوں کی سچی لگن اور عقیدت کے بدلہ عطا کی ہے۔ اس کی حفاظت کرنا ہر ہندوستانی کا پہلا فرض ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب کبھی اتحاد اور آپسی بھائی چارے کی کمی ملک میں ہوئی ہے تو ان پر عتاب کی صورت میں آزادی کو چھین لیا گیا ہے۔ ہمیں اپنی آزادی کو ہر صورت میں برقرار رکھنا ہے اور آزادی کے اس سفر کو ہمیشہ جاری رکھنا ہے۔ ایک ایسی مشعل کو ہاتھ میں لے کر آگے بڑھتے رہنا ہے جہاں آنے والی آزاد ہندوستان کی نسلیں حفاظت کے ساتھ اس کو اور آگے بڑھانے کے لئے تیار ہو جائیں۔

فہرست تصاویر

۱۴۔ جنگی کلاہ	۱۷ ص۔ع	نیشنل میوزیم، نئی دہلی
۱۵۔ ٹوپی دار چقمقی پستول	۱۷ ص۔ع	نیشنل میوزیم، نئی دہلی
۱۶۔ گووا کا گرجا گھر	۱۶ ص۔ع	گووا
۱۷۔ اسطرلوب	۱۷ ص۔ع	لال قلعہ میوزیم، دہلی
۱۸۔ شاہ جہاں اور ممتاز	۱۷ ص۔ع	تاج میوزیم، آگرہ
۱۹۔ تاج محل	۱۷ ص۔ع	آگرہ۔ اتر پردیش
۲۰۔ دیوانِ عام، لال قلعہ، دہلی	۱۷ ص۔ع	لال قلعہ، دہلی
۲۱۔ اورنگزیب عالمگیر کا خنجر	۱۷ ص۔ع	نیشنل میوزیم، نئی دہلی
۲۲۔ ٹیپو سلطان کی تلوار	۱۷۹۰ سنہ عیسوی	نیشنل میوزیم، نئی دہلی
۲۳۔ فنِ مصوّری کا نمونہ (کانگڑہ) لیلا کپڑے بدلتے ہوئے	۱۸ ص۔ع	نیشنل میوزیم، نئی دہلی
۲۴۔ اودھ کے نواب آصف الدولہ	۱۸ ص۔ع	اسٹیٹ میوزیم، لکھنؤ
۲۵۔ شاہ نجف کا امام باڑہ	۱۹ ص۔ع	اسٹیٹ میوزیم، لکھنؤ
۲۶۔ نادر شاہ دہلی میں	۱۸ ص۔ع	لال قلعہ میوزیم، دہلی
۲۷۔ نٹوں کا تماشہ	۱۸ ص۔ع	نیشنل میوزیم، نئی دہلی
۲۸۔ شطرنج کا کھیل	۱۹ ص۔ع	لال قلعہ میوزیم، دہلی
۲۹۔ صراحی	۱۸ ص۔ع	پیلیس میوزیم، جے پور
۳۰۔ خطِ نستعلیق کا نمونہ	۱۸ ص۔ع	لال قلعہ میوزیم، دہلی
۳۱۔ خط نسخ کا نمونہ	۱۶ ص۔ع	لال قلعہ میوزیم، دہلی
۳۲۔ اسلحہ کی گیلری	۱۹۹۲ سنہ عیسوی	نیشنل میوزیم، نئی دہلی

کتابیات

	نام کتاب	مصنف	کب اور کہاں شائع ہوئی	
۱-	اخبار الاخیار	عبدالحق دہلوی	دہلی	۱۸۶۶ء
۲-	تاریخ فرشتہ	محمد قاسم فرشتہ	پونہ	۱۸۳۱ء
۳-	تاریخِ ہندوستان	شمس سراج عفیف	کلکتہ	۱۸۹۰ء
۴-	تاریخِ فیروز شاہی	ضیاء الدین برنی	کلکتہ	۱۸۶۲ء
۵-	تاریخ مبارک شاہی	یحییٰ سرہندی	کلکتہ	۱۹۳۱ء
۶-	تزکِ جہانگیری (قلمی نسخہ)	شہنشاہ جہانگیر	دہلی	۱۷ ویں صدی
۷-	خلاصۃ التواریخ	سبحان رائے بھنڈاری	دہلی	۱۹۱۸ء
۸-	منتخب التواریخ	عبدالقادر بدایونی	کلکتہ	۱۹۶۸ء
۹-	شاہ جہاں نامہ	ابوصالح کنبو	لاہور	۱۹۷۲ء
۱۰-	دلی کے آثار قدیمہ	خلیق انجم	دہلی	۱۹۸۸ء
۱۱-	قدیم لکھنؤ کی آخری بہار	مرزا جعفر حسین	دہلی	۱۹۸۱ء
۱۲-	مسلمان حکمرانوں کی ہندی قدردانی	پنڈت محمد شفیع	لکھنؤ	۱۹۸۶ء
۱۳-	ہندوستانی سکوں کی تاریخ (مضمون)	عتیق انور صدیقی	دہلی (آجکل)	۱۹۸۶ء
۱۴-	اسلحہ اور ہتھیار کی کہانی (مضمون)	عتیق انور صدیقی	دہلی (سینک سماچار)	۱۹۹۰ء

۱۵۔	واقعاتِ دارالحکومت دہلی	منشی بشیر احمد	دہلی	سنہ ۱۹۲۵ء
۱۶۔	سیر المنازل (قلمی نسخہ)	سنگین بیگ	دہلی	سنہ ۱۸۲۷ء
۱۷۔	آثار الصنادید	سر سید احمد خاں	دہلی	سنہ ۱۹۶۶ء
۱۸۔	بابر نامہ (قلمی نسخہ)	ظہیر الدین محمد بابر	دہلی (نیشنل میوزیم)	۱۶ ویں صدی ء
۱۹۔	آئینِ اکبری (قلمی نسخہ)	ابوالفضل	دہلی (نیشنل میوزیم)	۱۶ ویں صدی ء
۲۰۔	دول رانی خضر خاں (قلمی نسخہ)	امیر خسرو	دہلی (نیشنل میوزیم)	۱۶ ویں صدی ء
۲۱۔	بوستاں (قلمی نسخہ)	شیخ سعدی	مانڈو (نیشنل میوزیم)	۱۶ ویں صدی ء
۲۲۔	شاہ نامہ (قلمی نسخہ)	فردوسی	دہلی (لال قلعہ میوزیم)	۱۷ ویں صدی ء
۲۳۔	تاریخ تاج محل (قلمی نسخہ)	سنگین مغل بیگ	آگرہ (تاج میوزیم)	۱۶ ویں صدی ء
۲۴۔	مثنوی مولانا روم (قلمی نسخہ)	مولانا رومی	فرنک فرٹے (جرمنی میوزیم)	۱۰ ویں صدی ء
۲۵۔	ہندوستانی فن مصوری	انیس احمد فاروقی	دہلی	سنہ ۱۹۸۵ء
۲۶۔	عالم انتخاب دہلی	مہیشور دیال	دہلی	سنہ ۱۹۸۷ء
۲۷۔	اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ	شہناز انور	لکھنؤ	سنہ ۱۹۸۶ء
۲۸۔	مسکرائیے کہ آپ لکھنؤ میں ہیں (مضمون)	رام لعل	لکھنؤ (دنیا ورڈ)	سنہ ۱۹۹۱ء
۲۹۔	نیشنل میوزیم (مضمون)	عتیق انور صدیقی	دہلی (قومی آواز)	سنہ ۱۹۸۶ء مارچ
۳۰۔	اسٹوری آف اسلامک کیلی گرافی	عتیق انور صدیقی	دہلی	سنہ ۱۹۹۰ء
۳۱	تواریخ نادر العصر	نول کشور	پٹنہ	سنہ ۱۹۶۵ء
۳۲۔	شیر شاہ سوری	ودیا بھاسکر	دہلی	سنہ ۱۹۷۶ء
۳۳۔	امیر خسرو	غلام سمنانی	دہلی	سنہ ۱۹۶۷ء
۳۴۔	ٹیپو سلطان	شیخ علی	حیدر آباد	سنہ ۱۹۶۰ء
۳۵۔	رنجیت سنگھ	ڈی آر. سود	دہلی	سنہ ۱۹۸۰ء

۳۶۔ زمین کی کہانی	دھنونت کشور	دہلی	۱۹۸۳ء
۳۷۔ گرو گوبند سنگھ	گوپال سنگھ	امرتسر	۱۹۸۷ء
۳۸۔ شیخ نظام الدین اولیاء	خلیق احمد نظامی	دہلی	۱۹۷۷ء
۳۹۔ گوتم بدھ	لیلا جارج	دہلی	۱۹۸۲ء
۴۰۔ مہابھارت	تعظیم احمد	دہلی	۱۹۸۶ء
۴۱۔ تاریخ مساجد	مفتی ظفیر الدین	دہلی	۱۹۶۴ء
۴۲۔ ہندوستانی کتبوں کا مطالعہ	ڈی سی سرکار	دہلی	۱۹۶۲ء
۴۳۔ ہندوستان کی عظیم کتابیں	منوج داس	دہلی	۱۹۸۷ء
۴۴۔ واجد علی شاہ	کوکب قدر	کلکتہ	۱۹۸۲ء
۴۵۔ صحیفۂ خوشنویساں	احترام الدین شاغل	دہلی	۱۹۸۷ء

46.	Adolf Waley	Cultural History of India	1988	Delhi
47.	Brand Mechael	Akbar's India	1986	New York
48.	Bernett L.D.	Antiquities of India	1913	London
49.	Brown Percey	Indian Architecture	1971	Bombay
50.	Arhery Arther	Classical Persian Literature	1958	London
51.	Dwivedi V.P.	Museums & Museology	1980	Delhi
52.	Judilia Nunes	Monuments in old Goa	1979	Delhi
53.	Nath. R.	The Immortal Taj	1972	Bombay
54.	Savory. R.M.	Islamic Civilisation	1976	Delhi
55.	Saryu Doshi	Marg Vol.XXXV No.2	1984	Bombay
56.	Anand M.R.	The Hindu view of Art	1957	Bombay
57.	Fabric Charles	Fundamental of Indian Art	1960	Bombay
58.	Gupta R.S.	Ajanta, Ellora & Aurangabad	1962	Bombay
59.	Havell E.B.	A Hand Book of Indian Art	1920	London
60.	Yezdani G.	History of Deccan	1953	London
61.	Habibullah A.B.M.	The Foundation of Muslim rule in India	1961	Allahabad
62.	Mehdi Hassan	Tughlaq Dynasty	1963	Calcutta
63.	Qanungo K.R.	Shershah	1961	Calcutta
64.	Sherwani H.K.	Cultural Trends in Medieval India	1968	Bombay
65.	Gulbadan Begam	Humayun Nama	1902	London
66.	Fanshawe H.C.	Delhi Past and present	1902	London
67.	Dimand M.S.	A Hand Book of Muhammadan Decorative Art	1958	New York

68.	Tara Chand	Influence of Islam on Indian Culture	1936	Allahabad
69.	Nath. R.	History of Sultanate Architecture	1978	Delhi
70.	Ziauddin M.	Moslem Calligraphy	1936	Calcutta
71.	Rizvi. S.A.A.	Fatehpur Sikri	1972	Delhi
72.	Siddiqui A.R.	Indo-Islamic Architecture (April Indrama)	1987	Delhi
73.	Sharma Y.D.	Delhi and its Neighbourhood	1990	Delhi
74.	Harbans Mykhya	Historian & Historiography during the reign of Akbar	1976	Delhi
75.	Zainuddin	Atlas of Arabic Calligraphy	1968	Baghdad

CATALOGUE

76.	Catalogue of Royal Persian Manuscript	1987	London
77.	Catalogue of Delhi Museum of Archaeology	1914	Delhi
78.	Catalogue of National Museum	1985	Delhi

اشاریہ

1

2

5

5

6

7

6

8
CM

9

8

9

11

11

شیخ ابوالفضل وزیر خاقان

شیخ ابوالفضل وزیر خاقان

14

15

14

15

16

17

16

16

17

16

17

19

19

21

21

22

23

22

23

24

27

26

27

29

29

31

جب صحت شاہ اکبر جبکہ ہوا با حشمت و جا
سنتے ہیں تب کئی مدت سی صفحہ دنیا پر سب

Hindustani Tarikh-o-Saqafat

Aur

Funoon-i-Latifa

Atiq Anwar Siddiqui

Hindustani Tarikh-o-Saqafat
Aur
Funoon-i-Latifa

Atiq Anwar Siddiqui

Hindustani Tarikh-o-Saqafat
Aur
Funoon-i-Latifa

Atiq Anwar Siddiqui